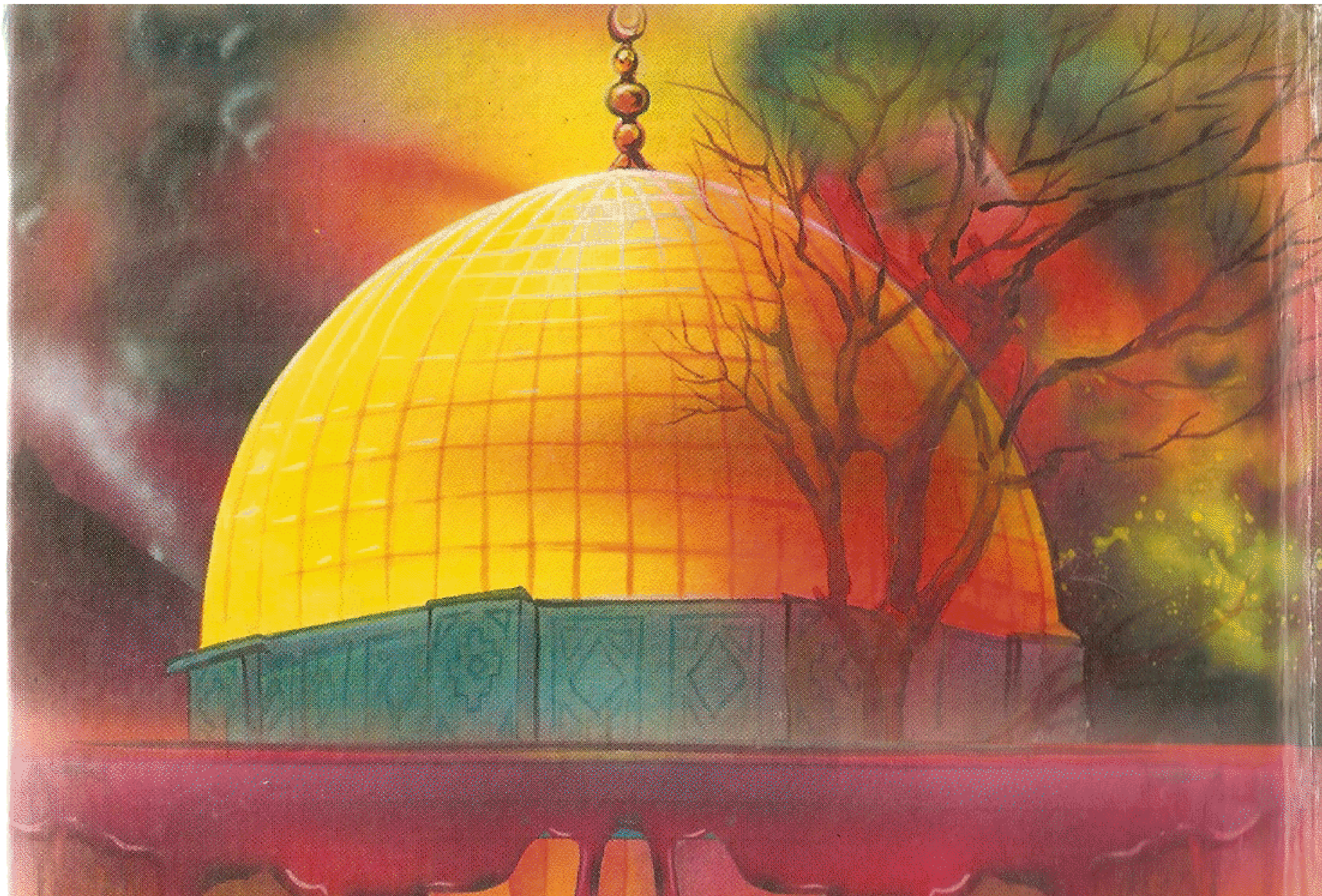

اقصیٰ کے آنسو

فلسطین کا ایک عاشق

الاقصیٰ پبلشر

اقصیٰ کے آنسو

فلسطین کا ایک عاشق

الاقصی پبلشر

نام کتاب: .... اقصیٰ کے آنسو
مصنف: .... فلسطین کا ایک عاشق
طبع اول: ١٤٢٧ھ 2006ء
طبع دوم: ١٤٢٨ھ 2007ء
طبع سوم: ١٤٢٩ھ 2008ء
ناشر: .... الاقصی پبلشر
نٹ قیمت .... [redacted] روپیہ

ملنے کے پتے

ملک بھر کے تمام بڑے بڑے کتب خانوں سے دستیاب ہے۔

الاقصی پبلشر

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
01	فہرست	۳
02	لعلِ زرّیں کے نام	٦
03	مسجد اقصیٰ کے نام	۸
04	معتصم! تم کہاں ہو؟	۱٦
05	القدس تاریخ کے تناظر میں	۱۹
06	القدس کے نام (۱)	۲۱
07	القدس کے نام (۲)	۲۸
08	القدس کے نام (۳)	۳۵
09	یہ چٹان مقدس کیوں ہے؟	٤۳
10	تختِ داؤدی کی واپسی	۵۲
11	دجلہ سے نیل تک	۵۸
12	خلیج سوئز کے کنارے	٦۳
13	فلسطین کا قضیہ	٦۸
14	القدس سے بابل تک	۸۲
15	اسرائیل کا مطلب کیا؟	۸۵
16	بابل سے یروشلم تک	۹۳
17	دو ڈاکٹروں کی کہانی	۹۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
18	اگلے سال یروشلم میں......!	١٠٦
19	دو جڑواں مثالیں	١١٤
20	پُراسرار حروف کیا کہتے ہیں؟	١٢٢
21	داستان ملت فروشوں کی	١٢٨
22	داستان فلسطین فروشوں کی	١٣٤
23	کہیلا کی کہانی	١٤٠
24	روم سے تل ابیب تک	١٤٨
25	آہ! القدس	١٥٣
26	اندھے کی ریوڑیاں	١٥٩
27	دو تکونیں ایک کہانی	١٦٢
28	فلسطینی مجاہد کے ساتھ ایک شام	١٦٤
29	عجمی نسل کا عرب حکمران	١٦٨
30	اے میری قوم کے لوگو!	١٧٤
31	دو انوکھی مثالیں	١٨٢
32	تلاش کا سفر	١٩٠
33	بچھوؤں کا ایکا	١٩٦
34	ہزار چہروں والا آدمی	٢٠١
35	فلیش پوائنٹ	٢٠٧
36	داؤدی پتھر کی مار	٢١٣
37	ہیکل سلیمانی: فسانہ یا حقیقت	٢١٨
38	سامری کا بچھڑا	٢٢٤

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
39	عظیم تر اسرائیل کیا ہے؟	٢٢٦
40	القدس کے فدائیوں کے نام	٢٣٠
41	اے بنی اسرائیل......!	٢٣٦
42	دو قبریں ایک سبق	٢٤٠
43	طوری ماما کا راز	٢٤٨
44	لُدّ کے دروازے پر	٢٥٣
45	کاسابلانکا سے اسرائیلی پارلیمنٹ تک	٢٦٠
46	گش ایمونیم	٢٦٩
47	زرد گنبد کی شبیہہ	٢٧٦
48	تورات کیا کہتی ہے؟	٢٨٣
49	بہترین دوست بدترین دشمن	٢٨٨
50	قیامت کے سائے	٢٩٤
51	ستم گروں کو کون سمجھائے؟	٣٠٠
52	آخری واپسی	٣٠٥
53	مغربی ممالک پورے فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ چاہتے ہیں (انٹرویو)	٣١٤
54	نئی صدی میں عالمِ اسلام کو درپیش چیلنج	٣٢٤
55	صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟ (نظم)	٣٣٠
56	اے ارضِ فلسطین (نظم)	٣٣٥

لعلِ زرّیں کے نام

کتابیں عام طور پر سیاہی سے لکھی جاتی ہیں ..... لیکن آپ یقین کریں کہ کاغذات کا جو پلندہ آپ کے ہاتھ میں ہے یہ کتاب تو ضرور ہے ..... لیکن اس میں جو کچھ ہے وہ قلم کو سیاہی سے تر کر کے نہیں، خونِ جگر میں اُنگلیاں ڈبو کر لکھا گیا ہے۔

القدس ہمارا وہ عظیم ورثہ ہے جس کے محافظ وخادم کا منصب خالقِ کائنات نے ہمیں بخشا ہے۔ یہود ونصاریٰ نے جب اس مقدس عبادت گاہ کی حرمت کا تحفظ نہ کیا، اس کی پاکیزہ فضاؤں کو اپنے زہریلے گناہوں سے آلودہ کیا اور بار بار کی تنبیہ کے باوجود باز نہ آئے تو اللہ رب العزت نے انہیں مقام "اجتبائیت" سے معزول کر کے اُمت محمدیہ کو یہ عظیم منصب سونپ دیا۔

اس دن سے ..... جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نصرتِ خداوندی سے القدس فتح کیا..... یہ بارِ امانت ہماری غیرت کا امتحان ہے۔ ہمارے ایمان کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اس کے تحفظ میں ہماری ترقی وبقا کا راز مضمر ہے اور اس کے تقدس پر حرف آیا تو ہم سے " اجتبائیت" کا منصب چھن جانے کا خطرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان! ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جب یہود بے بہبود کے قدم اس کی دہلیز تک آپہنچے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عنقریب حق وباطل کا جو عظیم ترین معرکہ بپا ہوگا، ہم اس میں اہلِ حق کے دست وبازو بن کر اس اجرِ عظیم کو حاصل کر سکتے ہیں جو نیک بختی اور خوش قسمتی کی بہت بڑی علامت ہے اور جو ہماری نجات کا ضامن اور مغفرت کی ضمانت بن سکتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی ایوبی نہیں جس کی قیادت میں معرکہ لڑا جائے جبکہ

س بات یہ ہے کہ ہم میں ایوبی بہت ہیں لیکن کوئی زنگی نہیں (۱) جو صلاح الدین کو سلطان ح الدین ایوبی بنائے۔ ہم میں قدیر خان بہت ہیں لیکن انہیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان بنانے ے نہیں البتہ گودڑی کا کوئی لعل اپنی ذاتی کوششوں سے چمکتا ستارہ بن جائے تو اس کی حوصلہ شمنی اور ناقدری کا رواج عام ہے۔ یہ بربادکن روش ترک کر کے ہمیں جو ہر قابل کی حوصلہ فزائی اور مردم سازی کی روایت آگے بڑھانی چاہیے کہ ذرا نم ہو تو بڑی زرخیز ہے یہ مٹی ساقی۔

دجالِ اکبر اس کائنات کا عظیم ترین فتنہ ہے۔ اس فتنے کا مرکز و محور بھی القدس کی سرزمین ہوگی اور اس کا خاتمہ و بربادی بھی یہیں ہوگی۔ اس فتنے کا آغاز تو کھلی آنکھوں نظر آ رہا ہے اور جو وگ تقویٰ و جہاد پر کاربند رہے وہ اس کا انجام بھی دیکھ لیں گے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو س فتنہ اکبری کے خلاف برسرِ پیکار عظیم انسانوں کے ہمسفر و ہمدم ہوں گے۔ یہ چند آنسو انہی خشیم ہستیوں کے نام ہیں۔

کوشش کی گئی ہے کہ یہ عاجزی و بے بسی کے آنسو نہ ہوں، یہ قہرمان اور قہر خیز بارودی فلیتے ہوں۔ ان میں موت کی ٹھنڈک نہ ہو، آتش فشاں کی حرارت ہو۔

آنسوؤں کے ان دو قطروں میں سے ایک مسجدِ اقصیٰ کے ہال کے نام ہے جو قدسی صفت ہستیوں کی سجدہ گاہ ہے اور دوسرا گنبدِ صخرہ نامی اس لعلِ زرّیں کے نام جس کے گرد مقدس وحیں حصار باندھ کر دجالی فوجوں کی یلغار کے مقابلے میں قربانی کی لازوال داستانیں رقم ریں گی۔ اللّٰھم اجعلنا منھم !

شاہ منصور

۱۴۲۸ھ کا پہلا دن

۱۔ سے ن صلاح الدین ایوبی کے مربّی و پیشرو سلطان نورالدین زنگی مراد ہیں جنہوں نے ایوبی میں پوشیدہ جوہر قا ل کو جانچ کر اُسے اپنا جانشین بنایا تھا اور بے مثال خوبصورتی کا حامل ایک منبر بنا کر خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے مسجد اقصیٰ کی فتح کے بعد اس میں نصب کیا جائے۔

مسجد اقصیٰ کے نام

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کی عزت کی علامت اور فتح وسرخروئی کا نشان ہے۔ یہودیوں کے حالیہ سفاکانہ حملے میں یہودی فوجیوں نے نہتے فلسطینیوں کے خلاف ٹینک اور گن شپ ہیلی کاپٹر استعمال کرتے ہوئے مسجد اقصیٰ میں مسلمانوں کی خون کی ندیاں بہادیں جس سے سارا عالم اسلام خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوگیا ہے۔ ضرب مومن اس نازک تاریخی موڑ پر اپنا فرض ادا کرنے کے لیے ایک انقلاب آفریں تاریخی، معلوماتی اور تحقیقی سلسلہ شروع کررہا ہے۔ جس میں ارض مقدس فلسطین کی فضلیت اور اہمیت سے لے کر حرم قدسی کے مکمل تعارف اور تاریخ تک اور فلسطین میں یہودی ریاست کی داغ بیل ڈالنے کے ناپاک منصوبے کے آغاز سے لے کر مسجد اقصیٰ کو نعوذ باللہ شہید کرنے کی سازشوں تک ہر چیز کو انوکھے انداز میں بے نقاب کیا جائے گا۔ اس میں قارئین پہلی مرتبہ وہ مستند علمی تحقیقات، سنسنی خیز انکشافات اور کچھ منتخب نادر ونایاب تصویریں اور نقشے ملاحظہ فرمائیں گے جو اس سے پہلے کسی جریدے میں شائع نہیں ہوئیں۔ یہ سلسلہ ایک مستند دستاویز کے طور پر ہی نہیں بلکہ جذبۂ جہاد کی روح پھونکنے اور بیداری کی لہر دوڑادینے کے حوالے سے بھی ان شاء اللہ عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔

بے وفائی:

اس میں شک نہیں کہ بے وفائی بہت بری خصلت ہے اور اعلیٰ ظرف وجوانمرد لوگوں کی نظر میں نہایت افسوسناک چیز ہے، لیکن جس طرح کی بے وفائی اور بے مروتی عصر حاضر کے مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ سے برتی ہے، وہ ایسی دردناک اور الم انگیز ہے کہ تاریخ عہد وفا اور روداد جور وجفا میں اس کی نظیر نہیں ملے گی۔ مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے نزدیک تیسرا مقدس ترین

مقام ہے۔ اس کی حفاظت وخدمت اور ناپاک صلیبیوں اور غلیظ صہیونیوں سے اس کا تحفظ ان کا اوّلین فرض ہے لیکن ان کا تعلق اب اس سے اتنا رہ گیا ہے کہ سال میں ایک دفعہ واقعہ معراج کے حوالے سے وہ اس تاریخی مقام کا تذکرہ کرلیں یا اسرائیل کی طرف سے اس کی بے حرمتی کی خبر نشر ہونے پر اونگھتے ہوئے شخص کی طرح آدھے سوتے اور آدھے جاگتے سن لیں، بس اتنا کافی ہے...... اس سے آگے کا نہ کبھی ان کے ذہن میں کوئی خیال آتا ہے اور نہ کبھی اس سانحے کا احساس ہوتا ہے جو ان کے جیتے جی رونما ہو چکا ہے۔ دنیا کی مردود و مبغوض ترین قومِ یہود نہ صرف ارضِ فلسطین پر تسلط جما چکی ہے اور باہر کے مسلمانوں کا یہاں داخلہ ممنوع قرار دیا جا چکا ہے بلکہ مسجد اقصیٰ کے گردان کی کئی قسم کی سرگرمیاں اور مذہبی رسومات جاری ہو چکی ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ آج فلسطینی مسلمان کم از کم وہاں نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن جس منصوبہ بندی سے یہودیوں کی پیش قدمی اور حالات پر گرفت مضبوط کرنے کا عمل جاری ہے اور جس کمال بے نیازی اور بے حسی کا مسلمان حکمران مظاہرہ کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ خاکم بدہن کہیں وہ وقت نہ آجائے جب صہیونی ریاست کو پایہ تکمیل پہنچانے کے لیے سرگرم عمل یہودی اس اسلامی ورثے میں مسلمانوں کا داخلہ بند کر کے اسے مکمل طور پر یہودی عبادت گاہ قرار دے دیں۔

صورتحال کی سنگینی:

آج ہم واقعہ معراج کی یاد بہت گرمجوشی اور شان وشوکت سے مناتے ہیں لیکن افسوس کہ اسراء ومعراج کے سنگم ”مسجد اقصیٰ“ کے یہودیوں کے پاس چلے جانے کا غم اس دن کوئی نہیں مناتا۔ اس روز ہماری مساجد جگمگا رہی ہوتی ہیں لیکن عین اس وقت مسجد اقصیٰ پر اندھیروں اور صہیونی تسلط کا راج ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں عظیم الشان محفلیں منعقد ہو رہی ہوتی ہیں لیکن مسجد اقصیٰ کی سوگوار فضا میں ویرانی ڈیرہ ڈالے ہوتی ہے۔ شب معراج کو ہمارے مذہبی معاشرے میں مرکزی حیثیت دی جاتی ہے لیکن مقام معراج کے تحفظ اور اس کی خاطر جہاد کرنے والوں کو ضمنی درجہ بھی نہیں دیا جاتا۔ ہمارے خطباء واقعہ معراج کی تفاصیل اور اس رات کی فضیلت سناتے سناتے صبح کر دیتے ہیں لیکن بیت المقدس پر جو شبِ غم چھائی ہے۔ اس کی صبح کب اور

کیسے ہوگی؟ اس کا نہ کوئی ذکر کرتا ہے، نہ اس کے اندھیرے کو کم کرنے اور صبح کی کرنوں کا راستہ بنانے کی فکر ہوتی ہے۔ یہودیوں کا اصرار ہے کہ مسلمان القدس سے دستبردار ہوکر یروشلم سے باہر ابودیس نامی گاؤں کو مقدس مان لیں، اس کے لیے وہ فلسطینی مسلمانوں پر ہر طرح کا دباؤ ڈال رہے ہیں، ظلم و جبر کررہے ہیں لیکن ہمارے دانشوروں اور رہنماؤں کو اس کا علم ہے نہ اس کے توڑ کے لیے کچھ کرنے کا شعور۔ یہودیوں نے فلسطین کی حدود کو مسلمانانِ عالم کے لیے مکمل طور سے سیل کردیا ہے، باہر کا کوئی کلمہ گو وہاں داخل نہیں ہوسکتا، اندر کے نہتے مسلمان ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، مسجد اقصیٰ کی ایک دیوار کو انہوں نے اپنی عبادت کے لیے مخصوص کرلیا ہے حرم قدسی کے مقام پر ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے ان کی منصوبہ بندی روز بروز آگے بڑھ رہی ہے لیکن ہمارے یہاں صورتحال کی سنگینی کا کسی کو ادراک ہے، نہ گولیوں کا مقابلہ پتھروں اور ٹینکوں کا مقابلہ غلیلوں سے کرنے والے فلسطینی مسلمانوں کی تنہائی اور بے بسی کا احساس۔ اس عالم میں مسجد اقصیٰ پکارتی ہے: اے اہل اسلام! تمہاری غیرت کو کیا ہوا؟ کیا تم صرف سجدوں پر بخش دیے جاؤ گے؟ کیا شعائر اسلام کے تحفظ کے بغیر تمہاری عزت باقی رہ سکتی ہے؟ کیا مسجد اقصیٰ کے بعد دوسری مساجد محفوظ رہ سکتی ہیں؟ لیکن مسلمان اپنے حال میں مست ہیں۔ ان کے خیال میں جمعہ و عیدین میں شرکت اور شب معراج منالینا، اسلام سے مضبوط تعلق کی نشانی ہے۔ جس جس نے یہ سب کچھ کرلیا اس سے روز قیامت مسجد اقصیٰ کے تحفظ کے لیے کوئی سوال ہوگا نہ بے دردی سے مارے جانے والے مظلوم فلسطینیوں کے انتقام کے لیے کچھ نہ کرنے پر اس سے پوچھ ہوگی۔ نہ یہودیوں کے ظلم کے خاتمے کے لیے کچھ سوچنا ان کے فرائض میں شامل ہے اور نہ روتی چلاتی ماؤں، بہنوں اور سسکتے کراہتے نوجوان زخمیوں کے لیے کچھ کرنا ان کی شرعی واخلاقی ذمہ داری ہے۔

سکون میں چھپا طوفان:

جس طرح طوفان کی آمد سے قبل سمندر کی سطح پُرسکون ہوتی ہے اسی طرح کچھ عرصے سے فلسطین پر قابض یہودیوں کی طرف سے کوئی بڑی کارروائی نہ ہونا اس جانکاہ حادثے کا پیش

خیمہ تھی جو گزشتہ سے پیوستہ جمعہ کو مسجد اقصیٰ میں پیش آیا۔ اس واقعے نے کاروبار زندگی میں مگن اہل اسلام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور اُمتِ مسلمہ کو بتا دیا ہے کہ مظلوم فلسطینی مسلمانوں کی دادرسی اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی زبانی مذاکرات یا کلامی مباحثات سے نہیں، جہاد کے ذریعے شہادت کے راستے سے ہوگی۔ اس کے لیے نہ امریکا کی طرف دیکھنے سے کوئی فائدہ ہوگا نہ بیان بازی یا مطالبات سے کچھ حاصل ہوسکتا ہے بلکہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہودیوں کے لیے کیسے ممکن ہوا کہ وہ ۲۲ ہزار کے مسلمانوں کے مجمع میں گھس جائیں اور ان کے سروں پر گولیاں برسا کر انہیں مسجد خالی کرنے پر مجبور کریں؟ کیا صرف اس لیے نہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو نہتے ہونے پر مجبور کر رکھا ہے اور خود ان کی فوج ہر طرح کے اسلحے سے لیس اور ان کا ہر شہری تربیت یافتہ ہے۔ فلسطینی مسلمانوں میں شوق شہادت کی کمی نہیں، لیکن ان کی جو قیادت عالمی برادری کے سامنے ان کا مقدمہ لڑ رہی ہے، وہ انتہائی نااہل، جذبۂ جہاد سے محروم اور غیر مخلص ہے، اس نے یہودیوں کے تسلط کا راز جاننے اور اس کے خاتمے کے حقیقی اسباب کو اپنانے اور اس کے لیے فلسطینی مسلمانوں کو تیار کرنے کی بجائے نام نہاد اتھارٹی قائم کر کے مذاکرات اور بات چیت کی جوریت ڈال رکھی ہے، اس نے مسلمانوں کو بھی دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اور کافروں کو بھی اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ فلسطینی عوام اور ان کی وہ تنظیم جو علماء وقت اور جذبہ جہاد رکھنے والے رہنماؤں کی سرپرستی میں کام کر رہی ہے، اسباب و وسائل نہیں رکھتی، عالمِ اسلام کے صاحب دل لوگوں سے اس کے رابطے نہیں، اور یوں فلسطینی مسلمان بے بس ولاچار اور بے یارومددگار یہودیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور خدا کی مبغوض وملعون اور انبیائے کرام کی گستاخ یہودی قوم روز بروز اپنے مکروہ منصوبوں کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔

آخر اس قدر بے توجہی کیوں؟

اس مرتبہ یہودیوں نے جو جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے، وہ ان کے عزائم اور مستقبل کے منصوبوں کا صاف پتہ دے رہا ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے اندر بے تحاشا اور

اندھا دھند گولیاں چلائیں بلکہ بعد میں گن شپ ہیلی کاپٹروں میں بیٹھ کر مسلمانوں کے گھروں پر راکٹ فائر کیے اور ٹینکوں کو سڑکوں پر لاکر نہتی شہری آبادی پر براہ راست گولہ باری کے ذریعے ان کے احتجاج کو دبانے کی کوشش کی۔ ان کے رویے میں یہ شدت کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ یہودیوں نے خاموشی کے اس عرصے میں زیر زمین تیاری کی، رد عمل کی شدت کا اندازہ لگایا، عالم اسلام کی ارض مقدس فلسطین سے بے رخی اور فلسطینیوں کی حالت زار سے بے توجہی کا مشاہدہ کیا اور پھر اچانک تشدد کی یہ سفا کانہ لہر برپا کر دی۔ اس کی جو تفصیلات اب تک سامنے آئی ہیں اور جس طرح نوجوانوں کو قریب سے فائرنگ کر کے بے دردی سے شہید کیا گیا ہے، خواتین کی جو آہ و فریاد اور فلسطینیوں کی لاچاری کے جو مناظر دیکھنے کو ملے ہیں، ان سے سینہ شق ہو جاتا ہے، جگر لہولہو ہو جاتا ہے، دل انتقام کی آگ سے آتش فشاں کی طرح بھڑکتا ہے۔ اے مسلمانو! خدا کے واسطے! ذرا سوچو اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ بابری مسجد کا زخم مندمل نہ ہوا تھا کہ مسجد اقصیٰ پر وار ہونے لگا ہے۔ اب تو جہاد پر آجاؤ، جہاد کی تربیت حاصل کرو، اس کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دو، اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کو پہنچو، ان بے بسوں کی فریاد رسی کرو۔ خدا نے جس کو جو دے رکھا ہے آج وقت ہے کہ وہ اس کو ان بے سہارا مظلوموں کی مدد کے لیے استعمال کر کے اپنی نجات کا سامان کرے۔ دنیا بھر کے یہودی اسرائیل کو اپنا مقصود و مطلوب قرار دے کر اس کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو کوئی انسان اپنے مقصد کی خاطر کر سکتا ہے جبکہ ان کی کوششوں پر ذلت و رسوائی کی غیبی مہر لگی ہوئی ہے، تو مسلمان خدا کی رحمت کے حصول سے اتنے مایوس اور اپنے انجام کی فکر سے اتنے بیزار کیوں ہو گئے کہ وہ فلسطین اور اس کے بے سہارا باسیوں کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں؟؟

حکمرانوں کی عدم دلچسپی:

اس حوالے سے سب سے زیادہ ذمہ داری مسلمان حکمرانوں کی بنتی ہے۔ عوام تو مظاہرہ اور احتجاج کے سوا کیا کر سکتے ہیں؟ اگر کسی کی بات میں وزن ہے یا کوئی فلسطینی مسلمانوں کے لیے مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے تو وہ حکمران ہیں لیکن وائے افسوس! وہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ

اسرائیل جبر وستم کی حدوں سے گزر گیا ہے اور اب حکمرانوں کی طرف سے مؤثر آواز اٹھائے بغیر اس کو لگام دینی مشکل ہے لیکن اس کے باوجود وہ امریکا کے خوف سے اس بارے میں کچھ نہیں کہتے کہ کہیں دنیا کی واحد سپر پاور اپنے پالے ہوئے جنگلی سور کے خلاف بولنے پر ناراض ہو کر ان کے اقتدار کے خلاف سازشیں نہ شروع کردے...... لیکن قسم خدائے بزرگ و برتر کی! اس سنگین ظلم پر خاموشی اتنا سخت گناہ اور خدا تعالیٰ کی ایسی شدید ناراضگی کا سبب ہے کہ امریکا آپ کے اقتدار کا حامی ہو یا مخالف، اس بے حسی کے جرم پر قدرت کی گرفت اس دنیا میں ہی ہو کر رہے گی اور امریکا کی مخالفت سے خدا کی پناہ پکڑی جاسکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ بھی نہیں ملے گی۔

انجامِ گلستاں:

اس وقت مسلم امہ ایسے انتشار کا شکار ہے اور مسلمان عوام ایسے بے بس ہو چکے ہیں کہ اتنے بڑے واقعے پر چند ایک بیانات اور مطالبات کے علاوہ کوئی قابل ذکر ردعمل سامنے نہیں آیا۔ دوسری طرف تمام بڑی بڑی غیر مسلم طاقتیں اسرائیل کے ساتھ ہیں اور اس کو اتنا مضبوط کر چکی ہیں کہ نہتے فلسطینی مسلمان تو کجا، کوئی عرب یا غیر عرب ملک اس کے خلاف کوئی مضبوط قدم نہیں اٹھا سکتا، سب مذاکرات پر زور دیتے ہیں اور ان کی کامیابی کی تمنا کرتے ہیں لیکن آج تک اس سے قبل دنیا میں کسی حقدار کو اس کا حق بات چیت سے نہیں ملا، یہود جیسی مکار قوم مسلمانوں کو اگر ان کا حق زبانی کلامی کوشش سے دے دے تو اسرائیل کے قیام کی ضرورت ہی کیا تھی؟ فلسطینی مسلمانوں نے تو ہمت نہیں ہاری۔ وہ جدید ترین اسلحے کا مقابلہ غلیل سے لڑ رہے ہیں اور ایک ہتھیار ان کے پاس ایسا ہے جو اس وقت کام دیتا ہے جب سارے ہتھیار ناکام ہو جائیں یعنی فدائی حملہ...... سو اس وقت فدائی حملے ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں، مسجد اقصیٰ اگر وہ واپس نہیں لے سکتے تو اس کے لیے جان تو دے سکتے ہیں، سو وہ دے رہے ہیں...... لیکن فلسطین سے باہر دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے سوچنے کا مقام یہ ہے کہ صورتحال یونہی رہی تو انجامِ گلستاں کیا ہوگا؟ فلسطینی مسلمانوں کو اس مشکل وقت میں تنہا چھوڑ دیا گیا تو دنیا

بھر میں جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ان کے خلاف دشمنان اسلام تباہ کن یلغار کے لیے پر تولے بیٹھے ہیں، ان کے تحفظ کی کیا ضمانت رہ جائے گی؟

اے ایوبی کے فرزندو!

کاش! آج کوئی سلطان صلاح الدین ایوبی نہیں جو تاریخ کا رخ موڑ سکے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ مسلم اُمّہ بانجھ ہو چکی ہے۔ آج بھی سلطان صلاح الدین کے جانشین پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلم نوجوانوں میں لہو ولعب کو رواج دینے کی بجائے مقاصد عالیہ کے حصول کی فکر پیدا کی جائے، انہیں فسق وفجور کے رجحانات سے بچا کر جہاد کے ذوق اور شہادت کے شوق سے آشنا کیا جائے، ان میں فحاشی و بے راہ روی کے جراثیم کے پھیلاؤ کی روک تھام کر کے ایثار وتقویٰ کا جوہر پیدا کیا جائے۔ بخدا! آج ایوبی کے کتنے فرزند ہیں جو اس کے جانشین بن سکتے ہیں لیکن انہیں مُردار دنیا کا طالب اور عیش پرستی کا دلدادہ بنا دیا گیا ہے۔ کتنے ہی مسلم نوجوان ایسے ہیں جو اپنے وقت اور صلاحیتوں کو صحیح مصرف میں استعمال کریں تو مسجد اقصیٰ کی جنت گم گشتہ مسلمانوں کو واپس دلا سکتے ہیں لیکن انہیں عزت وشہادت کے راستے سے ہٹا کر بے مقصد کھیل، تفریح اور فضول مشغولیات میں لگا دیا گیا ہے۔

اے ایوبی کے فرزندو! اپنے مقام اور ذمہ داریوں کو پہچانو! مسجد اقصیٰ کی سوگوار فضا سے آنے والی صداؤں کو سنو اور بدبخت یہودیوں کو ان کے آخری انجام تک پہنچانے کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ، ورنہ جیسے یہ دنیا ہم پر تنگ کر دی گئی ہے، کل قبر بھی ایسی تنگ نہ ہو جائے کہ زمین ہماری لاشوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔

اے مسجد اقصیٰ! تجھے عزت بخشنے والے کی قسم! تیرے بیٹے تجھے واگزار کرانے کے لیے جان کی بازی لگا کر رہیں گے۔ اگر تجھ تک نہ پہنچ سکے تو تیرے گرد اپنے خون اور جسموں سے ایسی باڑ ضرور تعمیر کر دیں گے جو تیرے دشمنوں کو تجھ تک نہ پہنچنے دے گی۔

”قولِ فیصل“

روئے زمین پر آج سب سے بڑا ظلم فلسطین میں ہو رہا ہے۔ فلسطین میں صدیوں سے آباد، عرب باشندوں کو بے وطن کر دیا گیا ہے۔ ایک سازش کے تحت دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر وہاں بسایا گیا اور اسرائیل کی ناجائز مملکت قائم کر کے عربوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے گئے ہیں۔ فلسطین پر عربوں کا حق ثابت کرنے کے لیے درج ذیل نکات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ نکات اس تقریر سے اخذ کیے گئے ہیں جو عالمِ اسلام کے نامور شخصیت، سعودی عرب کے فرمانروا، شاہ فیصل مرحوم نے ایک بین الاقوامی سیمینار میں کی تھی:

☆...... یہودی فلسطین کے اصل باشندے نہیں ہیں۔

☆...... یہودی دراصل بیرونی حملہ آور تھے جو فلسطین پر طاقت سے مسلط ہونے کے بعد کچھ عرصہ فلسطین میں رہے اور اس کے بعد نکال دیے گئے۔

☆...... فلسطین میں ان کی موجودگی کا عرصہ نہایت مختصر تھا۔

☆...... فلسطین میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے لے کر اب تک کبھی خالص یہودی حکومت قائم نہیں ہوئی۔

☆...... فلسطین میں یہودیوں کی کبھی اکثریت نہیں رہی۔

☆...... جب فلسطین سے یہودیوں کو نکال دیا گیا تو اس میں صرف اس کے اصل باشندے ہی رہ گئے جو شروع سے لے کر آج تک وہیں رہ رہے ہیں۔

☆...... سولہ سو سال کی طویل مدت کے دوران فلسطین میں کبھی کوئی یہودی آباد نہیں رہا۔

☆...... عربوں کی حکومت تقریباً ساتویں صدی سے فلسطین میں رہی۔

☆...... آج وہاں سیکڑوں تاریخی عمارات موجود ہیں جو عرب طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔

معتصم! تم کہاں ہو؟

غیرت مند نسلیں:

بے بس اور مظلوم عورت کی چیخیں جتنی تیز ہوتیں، سنگ دل رومی (آج کا یورپ اس زمانے میں روم کہلاتا تھا) کے قہقہے اتنے ہی بلند ہوتے جاتے تھے۔ اس نے ایک زور کا تھپڑ بھی عورت کے منہ پر جڑ دیا۔ عزت دار خاتون سے یہ ذلت برداشت نہ ہوئی تو وہ بے اختیار پکار اٹھی: اے معتصم! تم کہاں ہو؟ اے ہمارے حکمران! ہماری مدد کون کرے گا؟ مرد اس کی یہ بات سن کر اور بھی گلا پھاڑ کر ہنسا۔ بے وقوف عورت کو دیکھو بھلا اس کی خاطر خلیفۂ وقت مدد کو آئے گا؟ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمانوں میں ایک جسم ہونے کا احساس باقی تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کسی ایک کو مشکل، آفت یا دشمن نے گھیر رکھا ہو اور دوسرا اپنی روزمرہ کی معمول کی زندگی میں بدستور مصروف رہے۔ اسے اپنے بھائی کی مشکل دور ہونے تک چین نہ آتا تھا۔ بغداد کی مسند خلافت پر معتصم باللہ موجود تھا اور یہ مظلوم عورت اس سے سینکڑوں میل دور رومیوں کے علاقے میں واقع ’’عموریہ‘‘ نامی قلعے میں قید تھی۔ معتصم باللہ اپنے آباء واجداد جیسا کوئی بہت ہی صاحب جلال اور باکمال حکمران نہ تھا مگر اس کی رگوں میں غیرت مند خون دوڑ رہا تھا اور اس زمانے کے عام حکمران بھی غیرت وحمیت میں اپنی مثال آپ ہوا کرتے تھے۔ اسے کسی طرح خبر ہوگئی کہ اس مظلوم عورت نے اس کی غیرت کو جھنجھوڑنے والی صدا لگائی ہے۔ اس پر دن کا سکون اور رات کا آرام حرام ہوگیا۔ اس نے خبر لانے والے سے یہ نہ پوچھا کہ اس قلعہ میں کتنی فوج ہے؟ اس کا سوال یہ تھا کہ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ یہ قلعہ ہے کہاں؟ اس کے بعد اس نے صبح شام جنگی تیاریاں شروع کردیں اور آندھی طوفان کی طرح پہنچ کر اس قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ مسلمانوں کی فوج کا غیظ وغضب اتنا شدید اور ان کے حملے اتنے زوردار تھے کہ قلعے کی

بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔ دشمن کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا اور جب وہ سنگ دل شخص جو قیدی عورت پر ظلم ڈھاتا تھا، گرفتار کر کے معتصم باللہ کے سامنے لایا گیا تو اسے علم ہوا کہ یہ قوم واقعی غیرتمند ہے جو اپنے ایک فرد کے بدلے کے لیے بھی اس طرح بے چین ہوتی ہے جیسے انسان اپنی چھنگلی کی تکلیف پر بے تاب ہو اٹھتا ہے۔

زیادہ دور کی بات نہیں:

مسلمانوں کی یہ قابل فخر عادت آج کل غیر مسلموں نے اپنا لی ہے۔ دنیا میں کہیں کسی ایک بھی امریکی کو کچھ ہو جائے تو وہائٹ ہاؤس، پینٹا گون سے سر جوڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس وقت تک اپنا سب کچھ امریکی شہریوں کے لیے جھونک دیتا ہے جب تک ان کو تحفظ کی چھاؤں میسر نہیں آ جاتی۔ اس کے برعکس مسلمان ایک دوسرے پر ٹوٹنے والے مصائب کے پہاڑوں کی گڑگڑاہٹ بھی معمول کے واقعے کی طرح سنتے ہیں اور پھر اپنے کاموں میں مگن ہو جاتے ہیں۔ کوئی زیادہ دور کی بات نہیں ہے، کچھ عرصہ قبل بھی یہ عالم تھا کہ اگر کسی مسلمان ملک پر حملہ ہوتا تو عالمِ اسلام میں دکھ اور فکر کی لہر دوڑ جاتی۔ خوشی کی تقریبات موقوف کر دی جاتیں اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے لیے حسب توفیق امداد اور تعاون کی ممکنہ صورتوں پر غور اور عمل کیا جاتا، مگر جب سے مغربی میڈیا نے غیر مسلم ثقافت کا زہر مسلمانوں کے دل و دماغ میں انڈیل کر انہیں نفس پرستی کا عادی، عیش و عشرت کا دلدادہ اور بھوک و جنس کا غلام بنا دیا ہے، اس کے بعد ان کی بلا سے کہیں کچھ بھی ہوتا رہے، وہ دنیا پرستی کی دھن میں غرق رہتے ہیں۔

شاید......شاید......

فلسطین کی بیٹیوں نے جب دیکھا کہ کوئی حجاج یا معتصم نہیں رہا جو ان کی چیخوں کو اپنے جگر گوشوں کی پکار کی طرح سنے اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ آج کے جدید تعلیم یافتہ حکمران ان کی دلدوز صداؤں پر اتنی توجہ بھی نہ دیں گے جتنی وہ صبح صبح اپنے چہرے کی کھدائی لپائی اور اپنے لباس کے کلف اور کریز پر دیتے ہیں، تو انہوں نے ان سنگ دل روشن خیالوں کو پکارنے کی بجائے خود میدان عمل میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ تادمِ تحریر فلسطین کی تین تعلیم یافتہ اور اونچے خاندانوں کی بچیاں اپنے جسم سے بم باندھ کر دشمن کے لیے قہر بن کر نازل ہو چکی ہیں اور انہوں نے اپنے جسم کے بکھرے ٹکڑوں اور خون کی پھوٹتی چھینٹوں کے ذریعے

اُمّت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاید ان معصوم بچیوں کی قربانی دیکھ کر کوئی مسلم نوجوان دنیا کے جھمیلوں سے پیچھا چھڑا کر خود کو مظلوم مسلمانوں کے لیے وقف کر دے۔ شاید کسی کے دل میں غیرت کی کوئی چنگاری شعلہ پکڑ لے۔ شاید...... شاید......

بغیر پیندے کے لوٹے:

غضب ہے کہ اسرائیل کے درندہ صفت اقدامات کے باعث جاپان میں مظاہرے اور فرانس میں یہودی املاک پر حملے شروع ہو گئے ہیں لیکن مسلمان ممالک فلسطینیوں کی بے پناہ مظلومیت کے باوجود ان کی مدد سے گریزاں ہیں۔ بزدلی اور منافقت کی انتہا دیکھیے کہ لبنان میں عرب ممالک اور کوالالمپور میں تمام مسلم ممالک جمع ہوئے لیکن خود کچھ کرنے کی بجائے اقوام متحدہ سے مطالبہ کرتے رہے کہ اس نے جس بھیڑیے کو کھلا چھوڑ رکھا ہے اسے لگام دے تاکہ زخمی فلسطینیوں کی چیخ و پکار سے ان عزت مآب حکمرانوں کے آرام و سکون میں خلل نہ پڑے۔ عالمِ اسلام کے نمایندہ ان بہادر اور ذی وقار حکمرانوں سے نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ یہودیوں کا معاشی بائیکاٹ کریں یا کم از کم اپنا پیسہ ان کے بینکوں سے نکلوا لیں، نہ وہ اتنی جرأت کرتے ہیں کہ اپنے دشمنوں کو تیل کی فراہمی بند کر دیں یا ان کے سرپرستوں کی عاجزانہ جی حضوری کی ذلت کو خیر باد کہہ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ نہ انہوں نے کبھی مل کر یہ سوچا ہے کہ فلسطینی مسلمانوں کی مدد کے لیے کچھ کریں یا فلسطینی مہاجرین کی کفالت کا ذمہ لے لیں۔ غضب خدا کا ایک ارب مسلمانوں کے یہ نمایندے چند لاکھ یہودیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کیا ان کا مقابلہ کرنے والے نہتے نوجوانوں اور بچوں کے کچھ کام بھی نہیں آ سکتے؟ اگر موت کے ڈر یا شدت پسندی کے الزامات کے خوف سے فدائی مجاہدین کی حوصلہ افزائی ان کے بس میں نہیں تو کیا مہاجر کیمپوں میں پڑے بے بس مسلمانوں کی سرپرستی یا ہسپتالوں میں زخموں سے بے حال بچوں کی خبر گیری بھی ان کے لیے ممکن نہیں؟ سچ ہے غیرت کے بغیر انسان ایسا ہی ہے جیسے پیندے کے بغیر لوٹا۔ جہاں کہیں پڑا رہے یا جو اسے جہاں لڑھکا دے اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔

کاش! آج اُمّت میں عمر بن عبدالعزیز نہ سہی، معتصم باللہ جیسے حکمران ہوتے تو فلسطینی مسلمانوں کو اپنی بے بسی کا احساس یوں نہ ستاتا۔

القدس تاریخ کے تناظر میں

☆ ۳۰۰ قبل مسیح کنعانیوں (یبوسیوں) نے اس کو بنایا۔

☆ ۱۸۵۰ قبل مسیح حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں آئے اور یہاں کے بادشاہ سے ملے۔

☆ ۹۷۰ـ۹۳۱ قبل مسیح ''القدس'' پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت رہی۔

☆ ۵۸۷ قبل مسیح بخت نصر کے ہاتھوں یہ تباہ کر دیا گیا اور یہاں کے یہودی قیدی بنا لیے گئے۔

☆ ۱۳۵ میں رومی بادشاہ ھدریان نے یہاں سے یہود کو نکال باہر کیا۔

☆ ۴۰۰ـ۶۳۶ میں القدس بزنطینی استعمار کے زیر نگیں رہا۔

☆ ۱۵ ہجری، ۶۳۶ عیسوی میں مسلمانوں نے معرکہ یرموک کے بعد ان علاقوں کو آزاد کرایا۔

☆ ۱۷ ہجری، ۶۳۸ء میں ۳۰۰۰ صحابہ نے اسے فتح کیا اور یہاں کے پادری صفرونیوس نے شہر کی چابیاں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حوالے کیں اور معاہدہ کیا۔

☆ ۴۹۳ ہجری، ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے یہاں پر قبضہ کیا۔

☆ ۵۸۳ ہجری، ۱۱۸۷ء میں معرکہ حطین میں صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے صلیبیوں کو شکست فاش دی اور القدس کو آزاد کرایا۔

☆ ۶۵۸ ہجری، ۱۲۶۰ء میں معرکہ عین جالوت ہوا جس میں القدس کو تاتاریوں سے آزاد کرایا گیا۔

☆ ۹۳۴ ہجری، ۱۵۱۶ء میں عثمانی خلافت نے اسے اپنا حصہ بنا لیا۔

☆ ۱۳۳۶ ہجری، ۱۹۱۷ء میں پہلی جنگ عظیم ہوئی، خلافت عثمانیہ ختم کر دی گئی اور القدس

انگریز کے قبضے میں چلا گیا۔

☆ ۱۹۱۷ء میں ''بالفور'' معاہدہ ہوا اس کے تحت یہاں ''یہودی ریاست'' قائم کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

☆ ۱۳۶۸ ہجری، ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے ۷۸ فیصد علاقے میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

☆ ۱۳۸۷ ہجری، ۱۹۶۷ء میں یہود نے فلسطین کے باقی ماندہ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

☆ ۱۴۰۸ ہجری، ۱۹۸۷ء میں یہودیوں کے خلاف جدوجہد کا اعلان کر دیا گیا۔

القدس کے نام (۱)

دھندلائی حقیقتیں:

وقت کی گرد کیسی کیسی حقیقتوں کو دھندلا دیتی ہے؟ اور جب کسی چیز کے وارث ہی اس سے غافل ہو جائیں تو کس بے دردی اور صفائی سے وہ چیز ان سے چھین لی جاتی ہے؟ اس کی مثال دُنیا کی مقدس تاریخی عمارت مسجد اقصیٰ ہے۔ مسجد اقصیٰ کو جلیل القدر انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء متدن جبین نیاز کا بوسہ لینے کا شرف حاصل ہے، یہاں وحی کا نزول ہوتا رہا، قرآنی شہادت کے مطابق برکات آسمانی بے پایاں رحمت کی شکل میں اس کی مقدس چار دیواری میں اترتی رہیں، یہیں سے رب العزت اپنے آخری نبی کو معراج پر لے گئے، یہ مسلمانوں کا قبلہ اول ہے اور یہاں ایک نماز کا ثواب ایک روایت کے مطابق پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے۔

افسوس! کہ اس دور کے مسلمان اس کی زیارت سے محروم ہیں اور عرصہ دراز سے باہر کے مسلمانوں کو اس کی زیارت اور یہاں نماز کی ادائیگی کا موقع نہیں ملا۔ ذیل میں القدس شہر اور مسجد اقصیٰ کی مختصر تاریخ، تعارف اور یہودیوں کے اس کے متعلق باطل دعویٰ کی تردید پیش کی جاتی ہے۔ شاید کسی صاحبِ ایمان کے دل میں اس ظلم کے خاتمے کے لیے چنگاری پیدا کر دے جو یہود نے برپا کر رکھا ہے۔

مقدس تاریخ کے آئینے میں:

القدس، یروشلم کا عربی نام ہے جسے زمانہ قبل اسلام میں ''ایلیا'' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ۳۵ درجہ طول شرقی اور ۳۱ درجہ عرض شمالی پر واقع ہے، بحر روم سے اس کی اونچائی ۷۵۰ میٹر اور بحر مردار

کی سطح سے اس کی بلندی ۱۱۵۰ میٹر ہے۔ بحر روم سے اس کا فاصلہ ۵۲ کلو میٹر، بحر مردار سے ۲۲ کلو میٹر اور بحر احمر سے ۲۵۰ کلو میٹر ہے۔ القدس دُنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ یہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے ہاں یکساں طور پر متبرک ہے، اس شہر کی آب و ہوا نہایت عمدہ اور صحت افزا ہے۔ یہاں میوے کثرت سے اور نہایت لذیذ اور شیریں ہوتے ہیں۔ القدس کی جو تاریخ آج کی انسانی دُنیا کو معلوم ہے اس کے مطابق یہ تقریباً ۴۵ صدیاں پرانا شہر ہے۔ یہاں ساڑھے چار ہزار سال قبل عربوں کی ایک شاخ کنعانی اور یبوسی آباد تھے۔ ۲۵۰۰ قبل مسیح انہوں نے یہاں اپنی بستیاں بسائیں اور قلعے تعمیر کیے۔ پھر ۱۰۴۹ قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے فتح کیا اور ان کے فرزند سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں اسے بہت ترقی حاصل ہوئی۔ ۵۸۶ قبل مسیح میں یہ اہل فارس کے قبضے میں آ گیا جب بخت نصر نے یہاں یلغار کی۔ یہودیوں کا قتل عام کیا اور جو باقی بچ گئے انہیں غلام بنا کر بابل لے گیا۔ فارس والوں کے یہاں پر اقتدار کا سلسلہ اسکندر کے قبضے تک جاری رہا جو ۳۳۲ ق م میں ہوا۔ ۶۳ ق م میں یہاں رومی قابض ہو گئے۔ ان کے ایک بادشاہ ہیرڈوس نے ۱۳۵ء میں اس شہر کو بالکل تباہ کر دیا اور یہاں نیا شہر ”ایلیا کابتولینا“ کے نام سے بسایا۔ رومیوں کے دورِ حکومت میں یہ شہر ”ایلیا“ کے نام سے جانا جاتا تھا اور یہاں عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ قسطنطین بادشاہ کی والدہ ملکہ ھیلانہ نے ۳۳۵ء میں یہاں وہ مشہور گرجا تعمیر کیا جو ”کنیسۃ القیامۃ“ کے نام سے مشہور ہے۔

۶۱۴ء میں اہل فارس یہاں دوبارہ قابض ہو گئے اور یہاں کے گرجاؤں اور عبادت خانوں کو لوٹ کر ویران کر دیا۔ اس وقت پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے تھے اور یہی وہ واقعہ ہے جس پر مشرکین مکہ نے صحابہ کرام کے سامنے فخر ظاہر کیا تھا کیونکہ فارسی مشرک اور ان پڑھ تھے اور رومی مسلمانوں کی طرح اہل کتاب تھے لیکن قرآن کریم نے پیش گوئی کی کہ عنقریب رومی ظاہری اسباب کے بغیر دوبارہ اہل فارس پر غالب آ جائیں گے چنانچہ یہ پیش گوئی سچی ہوئی اور ہرقل نے ۶۲۷ء میں فارس والوں کو غیر متوقع شکست دے کر یہ شہر فتح کر لیا اور یہاں پھر عیسائیت کا غلبہ ہو گیا۔

قدس اسلام کے سائے میں:

القدس کو مُسلمانوں میں سے سب سے پہلے حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کیا پھر عرصہ دراز تک یہ مسلمانوں کے پاس رہا۔ اموی اور عباسی خلفاء کے دور میں اسے خوب عروج و ترقی ملی۔ گیارھویں صدی عیسوی میں (۴۹۲ھ/ ۱۰۹۹ء) میں یورپی عیسائیوں نے اس پر قبضہ کرلیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سلوک کے برعکس وہ مظالم ڈھائے جو ان کی انسانیت سے دوری، کم ظرفی اور جہالت کی عداوت کے طور پر یاد رکھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد کو مسجد اقصیٰ میں لاکر ذبح کیا گیا۔ مسجد میں گھوڑوں کا اصطبل بنادیا گیا جسے ''اصطبل سیمان'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ۸۰ سال تک صلیبی عیسائیوں کے قبضے میں رہنے کے بعد فرزند اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے اسے ۱۱۸۷ء میں دوبارہ فتح کیا اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر نو کے ساتھ یہاں مدارس، مکاتب اور اوقاف کا سلسلہ جاری کیا۔ تب سے یہ مسلمانوں کے پاس تھا لیکن انگریزوں نے ۲ فروری ۱۹۲۴ء کو فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ یہاں جو پہلا برطانوی کمشنر آیا وہ ہربرٹ سیموئیل نامی کٹر یہودی تھا۔ برطانیہ اس وقت عیسائی ہونے کے باوجود یہودی مقاصد کی تکمیل کے لیے پوری طرح آلہ کار بنا ہوا تھا لہٰذا دیدہ دانستہ ایک سازش کے تحت یہاں یہودی کمشنر بھیجا گیا۔ اس نے یہودیوں کے لیے فلسطین کے دروازے کھول دیے۔ امریکا کی صہیونی تنظیموں نے یہودیوں کو یہاں زمینیں خریدنے کے لیے کروڑوں پاؤنڈ دیے۔ رفتہ رفتہ یہودی مضبوط ہوتے گئے اور آخر کار یہودیوں نے برطانیہ کی سرپرستی میں ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی سلطنت کے قیام کا اعلان کردیا۔ ۷ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس دن سے آج تک یہاں مشرقی یورپ اور روس سے یہودیوں کی لگاتار آمد جاری ہے جس کی وجہ سے نئے یہودی محلے اور آبادیاں قائم ہورہی ہیں۔ شہر کو خوبصورت اور کشادہ بنانے کے بہانے عربوں کے محلے اور اسلامی آثار و مقامات مسمار کیے جا رہے ہیں، لاکھوں فلسطینی مسلمان یہودیوں کے مختلف حربوں سے تنگ آکر اپنے دیہات اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے ہیں اور شام و لبنان کے مختلف کیمپوں میں بے خانماں زندگی گزار

رہے ہیں۔ دیکھیں خدا کا کوئی بندہ کب علم جہاد لے کر اٹھتا ہے اور ان مظلوموں کی دادرسی کے ساتھ اس شہر کو تیسری مرتبہ فتح کرنے کا خواب پورا کر دکھاتا ہے۔؟

مسجد اقصیٰ اور ہیکل سلیمانی:

عام طور پر مشہور ہے کہ مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام نے کی لیکن یہ بات صحیح نہیں، بخاری شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت موجود ہے کہ بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر میں چالیس سال کا فاصلہ ہے اور بیت اللہ کی تعمیر ابتدائے آفرینش میں حضرت آدم علیہ السلام نے بحکم الٰہی کی تھی (حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی کی قائم کردہ بنیادوں پر تعمیر نو کی تھی) اس حساب سے بیت المقدس کی اولین تعمیر سیدنا حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام سے بہت عرصہ قبل ہو چکی تھی۔ اس طرح یہودیوں کا یہ دعویٰ ہی سرے سے باطل ہو جاتا ہے کہ یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام نے سب سے پہلے ہیکل (عبادت گاہ) تعمیر کی تھی البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی تعمیر نو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام سے صدیوں قبل یہاں ہیکل موجود تھا۔ القدس کی جو تاریخ آج کی انسانی دنیا کو معلوم ہے اس کے مطابق یہاں کنعانیوں اور یبوسیوں کے دور سے ہیکل تعمیر ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بھی کئی مرتبہ یہاں نئی تعمیرات ہوئی ہیں، بعض مرتبہ تو زلزلہ یا حملہ آوروں کی لوٹ مار سے مکمل انہدام کے بعد نئی تعمیر ہوئی ہے جو کبھی یہود کے جانی دشمنوں عیسائیوں اور کبھی مسلمانوں نے کی ...... تو یہودی کس کی وراثت کا دعویٰ کریں گے؟ ایک طویل عرصہ تو یہاں ایسا گزرا کہ یہاں تباہ شدہ ملبے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو خدا تعالیٰ نے جب ان کی بداعمالیوں کی بنا پر سزا دینی چاہی تو چھٹی صدی قبل از مسیح کے اوائل میں بابل کے حکمران بخت نصر نے یروشلم کو فتح کر کے پیوند زمین کر دیا اور یہودیوں کے مذہبی صحیفے نذر آتش کر کے ایک لاکھ یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا، سورہ بنی اسرائیل کے شروع میں اس واقعے کی طرف اشارہ موجود ہے۔ یہود کے عذاب الٰہی میں گرفتار رہنے کے اس زمانے میں تقریباً ڈیڑھ صدی تک یہاں سوائے

ویرانی کے اور کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد اہل مصر، فارسیوں اور رومیوں کی حکومتوں نے مختلف ادوار یہاں گزارے اور ان کے دور میں یہاں تعمیرات بنتی اور اُجڑتی رہیں، مختلف اقوام کی حکومتوں کی، اس طویل تاریخ کے ہوتے ہوئے یہودی نجانے کس طرح اس جگہ پر دعویٰ کرتے ہیں؟ ان کا یہ بے جا دعویٰ ان کی اس تاریخی بدبختی کا حصہ ہے جس کی بنا پر وہ مختلف اقوامِ عالم کو اپنا دشمن بنا کر ان سے ماریں کھاتے رہے اور اب مسلمانوں کی مخالفت مول لے کر اپنے لیے فیصلہ کن شکست کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔

فتح سے تعمیر تک:

اسلام کا آفتاب عالم تاب جب طلوع ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رجب ۲ ہجری، ۱۶، یا ۱۷ ماہ تک اس مقام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے اس لیے یہ مسلمانوں کا قبلہ اول اور ثالث الحرمین کہلاتا ہے۔ واضح رہے کہ مسجدِ اقصیٰ کا مصداق وہ سارا حرم قدسی ہے جس کے گرد ایک فصیل قائم ہے اور اس میں مختلف عمارتیں ہیں اور قبلۂ اول اس میں موجود وہ چٹان ہے جس پر زرد رنگ کا خوبصورت گنبد قائم ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کیا تو اس وقت یہاں کے عیسائی حکمرانوں اور پادریوں کی بے توجہی اور بے ادبی کی وجہ سے یہ ساری جگہ ویران تھی اور مقدس چٹان پر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی صفائی کا حکم دیا اور خود بھی صحابہ کرام کے ساتھ مل کر صفائی کی۔ مسند احمد کی صحیح روایت ہے کہ آپ نے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ اُنہوں نے فرمایا کہ آپ میرا مشورہ سنتے ہیں تو چٹان کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تاکہ سارا قدس آپ کے سامنے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آپ نے یہودیوں سے ملتی جلتی بات کی۔ میں تو وہاں نماز پڑھوں گا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی چنانچہ آپ حرم کے قبلہ والی جانب گئے اور براق باندھنے کی جگہ کے قریب فاتحین صحابہ کے ساتھ نماز پڑھی۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ (۷/۵۸) میں اس روایت کی سند کو جید کہا ہے۔

پھر آپ نے یہاں مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ یہ مسجد کھجوروں کے تنوں اور پتوں سے تعمیر کی گئی تھی۔

اُموی دورِ خلافت میں جب مرکز خلافت شام میں تھا تو بیت المقدس کو خاص اہمیت حاصل ہوئی اور اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مسجد اقصیٰ کی نئی تعمیر کی۔ یہ تعمیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تعمیر کردہ مقام پر تھی اور ان کی مسجد اس نئی مسجد کے اندر آ گئی ہے۔ موجودہ تعمیر کی بنیادیں اُموی خلفاء کی ڈالی ہوئی ہیں۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ جس طرح بیت المقدس کی فتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ ہے اس طرح اس کی شاندار تعمیر کا اعزاز اُموی خلفاء کو حاصل ہے۔ بعد ازاں سلاطینِ اسلام اس کی دیکھ بھال، تعمیر و مرمت اور تزئین و آراستگی اور اضافات کرتے رہے۔

عہدِ وفا کی تکمیل:

حدودِ حرم میں واقع مسجد کے ہال کا طول ۶۰۰ گز اور عرض ۷۰۰ گز ہے۔ اس ہال اور برآمدہ کی تعمیر نہایت خوبصورت، پُر تکلف اور شاندار ہے۔ چھت جن ستونوں پر کھڑی ہے، یہ اعلیٰ قسم کے سنگِ مرمر کے ہیں اور ان کے درمیان کی محرابوں اور مسجد کے گنبد کے اندرونی حصے پر نہایت عمدہ نقش و نگار اور طلائی کام کیا گیا ہے۔ مسجد کے گرد مضبوط فصیل ہے۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ مسجد اقصیٰ کی روزِ اول سے جو حدود تھیں آج بھی وہ انہی حدود پر قائم ہے۔ ان میں کمی بیشی نہیں ہوئی۔ مسجد اقصیٰ کا اطلاق اس پورے قطعہ پر ہوتا ہے جس کے گرد یہ فصیل موجود ہے لیکن کبھی صرف اس خاص حصہ کو بھی مسجد اقصیٰ کہہ دیتے ہیں جو اس چار دیواری کے اندر نماز کے لیے مخصوص ہے۔ فصیل میں سے اندر داخل ہونے کے چودہ دروازے ہیں ان میں سے دس دروازے آج بھی زیرِ استعمال ہیں جبکہ چار دروازے سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے حفاظتی نکتہ نظر کے تحت بند کروا دیے تھے۔ مسجد کے آخر میں کشادہ برآمدہ ہے۔ برآمدے میں سات دروازے ہیں۔ اس کے آگے وسیع صحن ہے۔ اس صحن میں مختلف چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہیں، جن میں یادگار کے طور پر تعمیر کیے گئے قبے، چبوترے، اذان کے مینارے، پانی کی سبیلیں، کنویں، مدرسے اور محرابی دروازے ہیں۔ ان عمارتوں میں سب سے بڑی اور نمایاں عمارت چٹان والے گنبد کی عمارت ہے جس کا تفصیلی تعارف آگے آئے گا۔ افسوس کہ آج ہم ان تاریخی مقامات کی دید سے محروم ہیں۔ اس صحن میں جمعہ و عیدین کے روح پرور

اجتماعات ہوتے ہیں مسلمانوں کی یہاں نماز کی ادائیگی میں یہود اپنے لیے نہایت رسوائی محسوس کرتے ہیں لہٰذا وہ کبھی یہاں آگ لگا کر اور کبھی مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگیں کھود کر اور کبھی دوسرے حیلے بہانوں سے (خدانخواستہ) اس کے انہدام کی کوشش کررہے ہیں اور مسجد اقصیٰ کی سوگوار فضا سارے عالم کے مسلمانوں سے عہد وفا کی تکمیل کا تقاضا کررہی ہے۔

القدس کے نام (۲)

حرم قدسی میں بہت سی ایسی یادگاریں ہیں جن کا تذکرہ اقصیٰ کی مظلوم یادیں زندہ کرنے کے ساتھ جذبۂ حریت اور شوق جہاد کو ولولہ بخشتا ہے۔ چند اہم مقامات کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔ اللہ کرے ایمان کی تازگی اور رجوع الی اللہ وقیام للجہاد فی سبیل اللہ کا باعث ہو۔

دیوارِ براق:

یہ حرم کے جنوب مغرب میں ہے۔ اس کی لمبائی ۴۷ میٹر اور بلندی ۱۷ میٹر ہے۔ روایات میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معراج کی رات یہاں اپنی سواری کو باندھا تھا۔ اس مناسبت سے اسے دیوارِ براق کہتے ہیں۔ یہاں مُسلمانوں نے حرم کی فصیل کے ساتھ مسجد براق کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی اس کے ساتھ خانقاہ اور وقف جائیدادیں بھی تھیں۔ یہودیوں نے یہاں غاصبانہ قبضہ کرکے مکانات گرانے کے ساتھ مسجد بھی منہدم کردی اور وسیع ہموار احاطہ کو اپنی عبادت کے لیے مخصوص کرلیا۔ وہ اس دیوار کو ہیکل سلیمانی کا باقی ماندہ حصہ سمجھتے ہیں اور یہاں آکر روتے دھوتے اور دیوار کی درزوں میں درخواستیں لکھ لکھ کر رکھتے ہیں۔ اس دیوار کو انہوں نے ”دیوار گریہ“ کا نام دے رکھا ہے اور اس پر ملکیت کا دعویٰ جتاتے رہتے ہیں۔ ان کے اس احمقانہ اور بے بنیاد دعوے کی وجہ سے فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں ان کی اس وقت زبردست جھڑپ ہوئی تھی جب یہاں صہیونی جھنڈا لگانے اور مذہبی رسوم ادا کرنے کی وجہ سے مُسلمانوں میں اشتعال پھیلا۔ مسلمانوں نے ان کی یہاں رکھی ہوئی میز کرسیاں اُلٹ دیں اور دیوار میں اڑسی گئی پرچیاں نکال کر پھاڑ دیں۔ اس وقت ایک کمیشن بھی

نا تھا جو تحقیق کے بعد ١٩٣٠ء میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا کہ یہ دیوار اور اس کے اردگرد کی جگہ سلمانوں کی ملکیت ہے...... لیکن صدیوں کے شکست خوردہ اور ذلّت کے مارے ہوئے یہودی آج ''اِلَّا بحبل من اللہ وحبل من الناس'' کے مصداق رونے دھونے اور عالمی طاقتوں کو ساتھ ملانے سے بھٹ میں چھپی لومڑی کی طرح بہادر ہو گئے ہیں اور بزور یہاں قبضہ کر کے دوران عبادت نماز کے وقت بگل بجا کر نماز میں خلل ڈالتے رہتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب یہودیوں نے اپنے انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں ان کی نافرمانی اور گستاخی کی، ان کی وفات کے بعد ان کی لائی ہوئی کتب میں تحریف کی اور ان کی صریح ہدایت کے باوجود پیغمبر آخر الزمان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہ لائے تو اب ان کا رونا دھونا کیا کام آسکتا ہے؟ اور انبیاء بنی اسرائیل یا حضرت سلیمان علیہ السلام کی وراثت کا دعویٰ کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ نیز یہ کہ جب یہ دیوار سینکڑوں فٹ طویل دیوار کی ہم شکل اور اس کا ایک حصہ ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ بقیہ دیوار تو مسلمانوں کی تعمیر کردہ ہو اور اتنا سا ٹکڑا ہیکل سلیمانی کا بقایا ہو؟ سچ ہے ناحق دعوے کا وہی جواب مدعی کی سمجھ میں آتا ہے جو دلیل سے نہیں، طاقت سے دیا گیا ہو۔

سنہرا گنبد:

یہ مسجد اقصیٰ کے صحن میں مسجد کے ہال سے ٥٠٠ میٹر کے فاصلے پر ایک اونچے چبوترے پر قائم ہے۔ اس کو ''قبۃ الصخرۃ'' کہتے ہیں۔ قبہ کے معنی گنبد اور صخرہ کے معنی چٹان کے ہیں۔ یہ قبہ صحن حرم میں قدرا اونچی جگہ موجود ایک قدرتی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے اس لیے اسے ''قبۃ الصخرۃ'' یعنی چٹان کا گنبد کہتے ہیں۔ یہ عمارت مثمن الاضلاع (آٹھ پہلوؤں والی) ہے۔ اس کا ہر پہلو ٦٦ فٹ طویل ہے، اندرونی قطر ١٩٢ فٹ اور قبے کے قاعدے کا قطر ٦٦ فٹ ہے۔ یہ قبہ ٩٩ فٹ بلند اور لکڑی کا بنا ہوا ہے جس پر باہر کی طرف سونے کا رنگ چڑھا ہوا پیتل اور سیسا لگایا گیا ہے اور اندر کی طرف گچ کا استر کیا گیا ہے، جس میں خوبصورت سنہری کام اور پرتکلف آرائش وزیبائش کی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز ٦٦ھ مطابق ٦٨٥ء میں اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کیا اور تکمیل اس کے بیٹے ولید بن عبدالملک کے ہاتھوں ٧٢ھ مطابق ٦٩١ء میں

ہوئی۔ مشہور ہے کہ بنی امیہ نے اس کی تعمیر پر مصر کے خراج سے حاصل ہونے والی سات سال کی آمدنی خرچ کی۔ موجودہ عمارت ترک سلاطین سلطان عبدالحمید (۱۸۵۳ء) اور سلطان عبدالعزیز (۱۸۷۴ء) کے عہد کی مرمت کردہ ہے۔ چنانچہ دیواروں کی بیرونی مینا کاری، خوبصورت رنگین شیشوں کی ۳۸ کھڑکیاں اور انداز تزئین سب مخصوص ترکی طرز کا ہے۔ عمارت کے باہر چاروں طرف خوبصورت پتھروں پر سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ یٰسین کی آیات خط طغرا میں دلفریب انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔ یہ آیات سلطان عبدالحمید ثانی نے تحریر کروائی تھیں۔ کھڑکیوں کی بناوٹ میں اعلیٰ درجے کی حسن ترتیب اور بہترین جالی دار کام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

یہ قبہ ایک اونچے چبوترے پر ہے جس تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ ان سیڑھیوں کے اختتام پر محرابی دروازے ہیں جن سے ایک وسیع چبوترے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس چبوترہ کے بیچوں بیچ یہ خوبصورت قبہ قائم ہے۔ قبے میں اندر کی طرف ستون کی دو قطاریں ہیں، پہلی قطار چٹان کے اردگرد ہے، اس میں چار نہایت ضخیم اور چوڑے اور بارہ گول چھوٹے ستون ہیں، دوسری قطار ذرا فاصلے پر ہے اس میں آٹھ بڑے اور سولہ چھوٹے ستون ہیں، اس طرح اندرونی حصہ تین حصوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ پہلے میں چٹان رکھی ہے جبکہ درمیان کا حصہ ستونوں سے گھرا ہے اور تیسرا حصہ دروازے سے متصل ہے۔ آج کل دروازے کے ساتھ

[redacted]

فلسطینی مجاہد کے ساتھ ایک شام

محمد بسام نجیب الطرفین فلسطینی عرب تھا۔ گورا چٹا، سرخ و سفید، صحت مند جسم، لمبا قد، زبان کا کھرا، ہاتھ کا کھلا اور دل کا کشادہ۔ اس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، عربی ادب کا دلدادہ اور جہاد سے دلی رغبت رکھنے کے سبب میری اس سے گاہے گاہے ملاقات رہتی تھی۔ وہ میری عجمی عربی سے اور میں اس کی عربین اردو سے لطف اندوز ہوتا۔ میں فلسطین کو اس کی حقیقت بین آنکھوں کی مدد سے دیکھنا چاہتا تھا لہٰذا فلسطینی فدائین کی تحریک کے پس منظر و پیش منظر، ان کی قربانیوں کی تفصیلات، فلسطین کے مختلف شہروں اور مشہور تاریخی مقامات کے نام اور یہودیوں کی نفسیات کو جاننے کے لیے کرید کرید کر اس سے سوالات کرتا اور وہ دلجمعی اور توجہ سے اپنی پُر مغز اور ذہانت آمیز گفتگو کے ذریعے میرے شوق اور تجسس کی تسکین کرتا رہتا۔ اس گفتگو کا سب سے دلچسپ مرحلہ وہ ہوتا جب میرے کسی سوال سے اس کی آنکھوں میں چمک اُبھر آتی اور وہ کانوں کو بھانے والی آواز میں عربی سے اردو پر اُتر آتا تاکہ تفہیم میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ جب میں اس کی آنکھوں کو خاص انداز میں سکڑتے اور پھر اُبھرتی چمک کے ساتھ پھیلتے دیکھتا تو سمجھ جاتا کہ اب مجھے اس کی مخصوص تلفظ اور دلچسپ لہجے میں بولی گئی اردو سننے کو ملے گی اور میں اس وقت تک اس کے دلکش صوتی توازن سے محظوظ ہو سکوں گا۔

ایک دن میں نے اس سے ایسا ایک سوال پوچھ ہی لیا جسے عرصے سے نوک زباں پر لاتے ہوئے مجھے حجاب مانع ہو جاتا تھا۔ میں ہچکچاتا تھا کہ کہیں شہداء کی قربانیوں کی بے حرمتی نہ ہو۔ یوں تو میرے پاس اس اشکال کے کئی نظریاتی جواب تھے اور مجھے ان کے درست ہونے پر یقین تھا لیکن میں مجاہدین کے حملوں اور ان کے ردعمل کے بارے میں فلسطینی مسلمانوں کا نظریہ

خود ان کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ میری توقع کے مطابق اس کی خوبصورت گہری آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے بھنچ گئیں پھر ان میں مجھے وہ چمک طلوع ہوتی نظر آئی جو کسی اچھے سوال پر اس کی اندرونی مسرت کی علامت ہوتی تھی۔ وہ آگے جھک کر گویا ہوا:

’’شہادت کا یہ راستہ ہم نے خود چنا ہے، خوب سوچ سمجھ کر اور ہر پہلو پر غور کر کے، دراصل اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اندرونی طور پر ہم میں جاسوسوں اور زر خرید ایجنٹوں کی بھرمار تھی، باہر سے کسی مدد کا پہنچنا محال تھا۔ سو ہم نے دو فیصلے کیے: ایک تو یہ کہ اصلاحِ احوال کی مہم شروع کی جائے، بے دینی اور اسباب سے تہی دامنی دونوں جمع ہو جائیں تو ذلت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور مکمل شکست جلد ہی آ مسلط ہوتی ہے، سو ہم نے نوجوانوں میں دینداری کی طرف رجوع کی مہم چلانی شروع کی۔ اس کے اچھے نتائج نکلے اور جلد ہی نمازیوں کی صفوں میں نوجوان چہرے دکھائی دینے لگے۔ نئی نسل کا زیادہ وقت فٹ پاتھوں اور قہوہ خانوں کی بجائے اصلاحی حلقوں اور مساجد کی سیڑھیوں پر گزرنے لگا۔ ان میں اپنے آپ کو پہچاننے کا شعور اور تجسس پیدا ہوا اور جب دین سے تعلق نے ان کی روحانی تسکین کا سامان کیا تو ان کی زندگیوں کا رُخ بدلنے لگا۔ ہمارا دوسرا کام اپنے محدود وسائل میں دُشمن کے مقابلے کی تدابیر سوچنا تھا۔ اصلاحی محنت کے سبب ہمارے نوجوانوں میں عقابی روح بیدار ہو گئی تھی اور ان کا جذبۂ شہادت کفر کی ناقابل شکست برتری میں دراڑیں ڈالنے کو بے چین تھا۔ اس سے قبل کم وسائل اور محدود نفری کے ذریعے دُشمن سے مقابلے کے لیے گوریلا جنگ کا تصور پایا جاتا تھا۔ ہمارے لیے وہ بھی ممکن نہ رہی تھی لیکن ہم ناممکن کو ممکن بنانے کی تدبیر سوچتے رہے یہاں تک کہ مظلوموں کے ربّ نے ہمیں جانباز حملوں کا راستہ سُجھا دیا۔ اس میں ہمارے سلگتے جذبوں کی تسکین بھی تھی اور ہمارے دُشمن کے لیے موت کا پیغام بھی۔ یہودیت نے آج تک اپنی حرام دولت اور شیطانی ذہنیت کے سبب صرف ہمیں نہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو بہت ستایا ہے لیکن فدائی کارروائیوں نے ان کی ساری ابلیسیت کا تانا بانا بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ان کے شیطانی دماغوں کو اپنی عیاری پر فخر تھا اور وہ اس کا برملا اظہار کرتے تھے اور اپنے دوزخی

ساتھیوں)، ہندوؤں کو اپنے تجربات سے مدد دیتے تھے مگر بمبار حملوں نے ان کی سٹی گم کر دی ہے۔ ان کے تھنک ٹینکس کو اس سے اتنا زبردست شاک لگا ہے کہ وہ ہکا بکا رہ گئے ہیں۔ ہمارا یہ ہتھیار ایسا ناقابل شکست ہے کہ اس کے سامنے یہودیوں کے مہلک کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار بھی ناکارہ ہیں۔ اب میں آپ کے اصل سوال کی طرف آتا ہوں۔

عام مسلمان ہمارے حملوں کی کامیابی کی خبر سن کر خوش ہوتے ہیں لیکن اس اندیشے سے دل مسوس کر رہ جاتے ہیں کہ اب وحشی اسرائیلی شہری آبادی کو نشانہ بنائیں گے اور نہتے مسلمان زخمی، معذور یا شہید ہوں گے جو زندہ بچیں گے ان کا سہارا چھن چکا ہوگا اور ان کا ٹھکانا بلڈوز کیا جا چکا ہوگا...... یہ باتیں بظاہر ایسی ہیں کہ ہر کلمہ گو مسلمان ان سے غمگین و رنجیدہ ہوتا ہے لیکن ہمارے بھائیوں کو یہ حقیقت جاننی چاہیے کہ تحریک انتفاضہ (عربی میں حرکت، بیداری اور انقلاب کو انتفاضہ کہتے ہیں) شروع ہونے سے قبل ہماری بے سروسامانی کے سبب فریقین کے جانی نقصان کا تناسب ایک یہودی کے مقابلے میں دس مسلمان کا تھا۔ اس کو یہودی میڈیا فخر سے بیان کرتا تھا۔ اس عرصے میں بے شمار مسلمانوں نے مظلومیت کی حالت میں جان دی جب سے انتفاضہ شروع ہوئی یہ تناسب کم ہو کر ایک اور تین پر آ گیا ہے۔ اب تین مسلمانوں کی جان لینے پر یہودیوں کو اپنی ایک لاش اٹھانی پڑتی ہے۔ ہر طرح کے وسائل سے مالا مال یہودیوں کے مقابلے میں یہ تناسب اتنا ناقابل رشک بھی نہیں بلکہ یہ ہماری کامیابی ہے کہ ہم اپنا نقصان ایک تہائی تک لا کر یہودیوں کے نقصان میں مسلسل اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ہم سے ہمارا وطن، گھربار، مال واسباب اور جان و آبرو تو چھن ہی گئی تھی اور یہودی ہمیں لاشوں کا تحفہ دے کر فلسطین ہتھیانے پر تلے ہوئے تھے، اب ہم نے فیصلہ کرنا تھا کہ یہودیت کو چرکا لگا کر اس دنیا سے جائیں یا ان کے گھاؤ سہتے سہتے جان دیں۔ سو ہم نے خوب سوچ سمجھ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس لیے...... بسام کی گہری آنکھوں کی خوبصورت چمک مزید روشن ہوگئی اور وہ اپنے مخصوص لہجے میں اپنی بات میں وزن ڈال کر بولا: ...... اس واسطے آپ لوگ ہم سے آنسوؤں کے ذریعے ہمدردی نہ کیا کریں۔ ہم نے یہ

راستہ خود منتخب کیا ہے اور اس پر اس وقت تک چلتے رہیں گے جب تک یہودیت کے سر سے ناپاک منصوبوں کا خمار اتر نہیں جاتا۔"

بسام کی گفتگو نے مجھ پر سحر طاری کر دیا تھا۔ تحریک انتفاضہ کے دوسرے مرحلے کے دو سال مکمل ہونے پر میں نے فلسطینی شہداء اور اسرائیلی مرداروں کا موازنہ کیا تو مجھے اس کی دھیمے لہجے میں کی گئی وہ پُراعتماد باتیں یاد آ گئیں جو اس نے میرے اس سوال کے جواب میں کہی تھیں جو اکثر لوگوں کے دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے کہ فلسطینی جانبازوں کے حملوں کے جواب میں بالآخر نقصان مسلمانوں کو ہی اٹھانا پڑتا ہے پھر ان سے فائدہ کیا؟ دراصل یہ یہودیت کے تسلط کو چیلنج کرنے کا آخری حربہ ہے جو بے بسی کی موت سے بدرجہا بہتر ہے۔ عزت کی زندگی ممکن نہ ہو تو شہادت والی موت سے بڑھ کر سعادت والی کوئی چیز نہیں پھر اس سے یہودی معیشت کو زبردست نقصان پہنچتا ہے اور یہودیوں کی جان ان کے مال میں اٹکی ہوتی ہے نیز تحریک انتفاضہ سے قبل دنیا بھر کے یہودیوں کی مقبوضہ فلسطین کی طرف نقل مکانی میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا تھا اور ہر چھ مہینے بعد نئی یہودی بستیوں کی تعمیر کا اعلان ہو جاتا تھا، اب نہ صرف یہ کہ یہ سلسلہ رک گیا ہے اور موت کے خوف سے ادھ موئے یہودی سابقہ آبادیوں کے گرد حفاظتی دیواریں تعمیر کر رہے ہیں بلکہ ارضِ موعود میں سکونت ان کے لیے ایسا ڈراؤنا خواب بن گیا ہے جس کی دہشت سے وہ اسرائیلی حکومت کی ترغیبات کے باوجود ترک سکونت کر کے اپنے سابقہ ممالک کو واپس جا رہے ہیں اور اس بات پر شکر ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ارضِ فلسطین پر آباد ہونے کے بعد جذبات میں آ کر اپنے سابقہ ملکوں کے پاسپورٹ پھاڑے نہ تھے۔ سچ یہ ہے کہ بسام جیسے نوجوانوں نے امریکا و اسرائیل جیسی خونخوار طاقتوں کو نتھ ڈال رکھی ہے اور اُمّت مسلمہ اگر ان بے وسائل مسلمانوں کی طرف سے غفلت چھوڑ دے تو وہ اس نتھ کو ناک کی رسی بنا کر یہودیت کی کالی بھینس کو بہت دور تک ہانک کر لے جا سکتے ہیں۔

عجمی نسل کا عرب حکمران

جنگ کے دوران مخالفین کی صفوں میں اپنے آدمی داخل کر دینا جو ان کے ارادوں اور اقدامات کے بارے میں پل پل کی خبریں پہنچاتے رہیں، عسکری نقطۂ نظر سے بڑی کامیابی سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی منصوبہ ساز اس امر میں کامیابی حاصل کر لے کہ اپنے کسی مہرے کو دشمن کے اختیارِ اعلیٰ کے مرکز تک پہنچا کر اسے مقتدر ترین منصب پر فائز کروا دے اور اس کے ذریعے دشمن کا دماغ، کان اور آنکھ اپنے قبضے میں لے لے تو بلاشبہ اسے مثالی اور بہت بڑی کامیابی کہا جائے گا۔ ’’ابو مازن‘‘ اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ اس کے آباء واجداد ایران کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۶۰ ہجری مطابق ۱۸۴۴ء میں ایران میں باطنی فرقوں کی ایک نئی شاخ نے جنم لیا۔ باطنی فرقے سے مراد مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے وہ فرقے ہیں جو آیات، احادیث اور احکامِ شرعیہ کی من مانی تاویلات کے ذریعے ان کا وہ مطلب گھڑ لیتے ہیں جس میں انہیں آسانی محسوس ہو۔ وہ اسلام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس میں دل کو بھانے والی کوئی ممنوع چیز حرام نہ رہے اور نفس کو مشقت میں ڈالنے والی کوئی عبادت ایسی شکل میں باقی نہ رہے جس پر عمل میں مشقت برداشت کرنی پڑے۔ پھر خواہش پرستی کے اس مجموعے کو اپنا دین و مذہب بنا کر زیر زمین اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے فرقے مسلم دشمن قوتوں کے لیے نہایت کارآمد ہوتے ہیں، لہٰذا وہ ان کی سرپرستی کر کے مسلمانوں کے لیے فتنہ وفساد اور اپنے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایسے فرقے زیادہ تر نفس پرست اور نام نہاد روحانی پیشواؤں کی ان گمراہ کن کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو سیاسی یا

اقتصادی مفادات کے حصول کی خاطر اپنی دنیا بنانے کے لیے لوگوں کا دین خراب کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں قلعۃ الموت سے اٹھنے والے قرامطہ اور آج کے دور میں بلوچستان کے پہاڑوں کو مسکن بنانے والے ''ذکری'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔

ہاں تو آج سے تقریباً ایک سو ٦٠ سال پہلے ایران میں قلعۃ الموت کے کھنڈروں سے ایک نئے باطنی فرقے نے جنم لیا۔ اس کا بانی ایک خواہش پرست روحانی معالج مرزا علی محمد باب شیرازی (۱۲۳۵ھ/ ۱۲٦٦ھ بمطابق ۱۸۱۹ء/ ۱۸۵۰ء) تھا۔ اس نے اپنے پیروکاروں میں اس عقیدے کا پرچار شروع کیا کہ نعوذ باللہ خدا انسان میں حلول کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اس ''انسان'' کا مصداق خود اس کی اپنی ذات نے ہو جانا تھا۔ یہ اپنے ماننے والوں میں یوگی رجنیش کی طرح آزادانہ جنسی اختلاط کو رواج دینے کی کوشش کرتا تھا تاکہ خود اسے جنسی تسکین کے ذرائع میسر آسکیں۔ نماز زکوٰۃ کا انکار اور روزہ اور حج کو ساقط قرار دینے کے علاوہ جہاد کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ باطل فرقوں میں یہ چیز قدرِ مشترک رہی ہے کہ وہ جنسی آزادی کے گرم جوش حمایتی اور جہاد فی سبیل اللہ کے سب سے بڑے مخالف ہوتے ہیں۔ اس شخص کے شاگردوں میں ''بہاء اللہ'' نام کا ایک شخص دوسرے مفاد پرست خوشامدیوں پر بازی لے گیا اور اس نے اپنے فرقے کے خفیہ پیغام کو دور دور تک پہنچانے کے ساتھ کسی ایسی غیر مسلم طاقت کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش شروع کی جو اس کی لذت پرستی کے جذبے کی تسکین کے لیے سرمایہ اور مسلمانوں میں گمراہ کن نظریات کے پرچار کے لیے وسائل فراہم کر سکے۔ بالآخر ابلیس کے اس نمایندے کو ایک ابلیسی گروہ مل گیا جو خود تو خدا پرستی کا دعویدار ہے لیکن بقیہ دنیا کو شیطانی کاموں میں ملوث دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

ہوا یوں کہ اس زمانے میں سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں یہود کے چوٹی کے رہنماؤں کا خفیہ عالمی اجلاس ہو رہا تھا۔ بہاء اللہ سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا اور یہودیوں کو قائل کر لیا کہ وہ اگر اس کی سرپرستی کریں تو وہ ان کے لیے نرم لکڑی کا ایسا کارآمد دستہ ثابت ہو سکتا ہے جس کو وہ خنجر، کلہاڑی، تیشہ جس چیز میں چاہیں فٹ کر کے مسلم کش ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

یہودیوں کو ارضِ موعود میں واپسی کی مہم کامیاب بنانے کے لیے ''مسلم صہیونی'' درکار تھے، اس شخص میں انہیں وافر مقدار میں ایسے جراثیم نظر آئے جو اِن کی منشا کے مطابق رینگ سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے اسے اپنی سرپرستی میں قبول کرلیا۔ بہائیوں اور یہودیوں کا یہ گٹھ جوڑ اتنا بڑھا کہ جب ایران کی قاچار حکومت نے بہاء اللہ کے پیروکاروں کو اپنی حدودِ مملکت سے بے دخل کیا تو یہ ایران سے سیدھا مقبوضہ فلسطین جا پہنچے جہاں صہیونیت نواز برطانوی حکومت کے نمایندہ جنرل ایلن بی (جس نے القدس پر یہودی تسلط قائم کروا کر صلیبی جنگوں کے عیسائی ہیرو شاہ فرانس لوئس دوم کا کردار ادا کیا تھا) نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور اسرائیل کے شہر حیفہ میں ان کو اپنا مرکز بنانے کے لیے وسیع وعریض قطعہ زمین الاٹ کیا۔ ابو مازن کا خاندان ان بھگوڑوں میں شامل تھا۔ ابو مازن جب بڑا ہوا تو بہائی فرقے کا ذہین ترین نوجوان سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اس کی تربیت میں صہیونی دماغوں نے خاص توجہ سے حصہ لیا اور کچھ عرصہ قبل صہیونیت کے منصوبہ سازوں کا تربیت یافتہ یہ شخص فلسطین کا وزیر اعظم رہا ہے جسے دنیا محمود عباس مرزا کے نام سے جانتی ہے۔

کراچی میں پٹیل پاڑہ کے قریب بہائی فرقے کا مرکز ''بہائی ہال'' کے نام سے موجود ہے اور یہ مسلمان سمجھا جانے والا دنیا کا دوسرا فرقہ ہے جسے اسرائیل کی حدود میں اپنا مرکز بنانے اور تربیت گاہیں قائم کرنے کی کھلی آزادی ہے۔ بہائی فرقے کا مرکز اسرائیل میں دو جگہ ہے۔ ایک حیفہ میں جہاں ان کا بہت بڑا عبادت خانہ تمام تر متعلقہ لوازمات کے ساتھ قائم ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے اسرائیلی حکومت نے اپنی خفیہ ایجنسی ''شین بیت'' کو مامور کر رکھا ہے۔ دوسرا ساحلی شہر عکّا میں ہے۔ یہاں کسی زمانے میں شیرِ اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے صلیبیوں کو عبرتناک شکست دی تھی۔ آج وہاں مسلمان ہونے کے دعویدار فرقے کے مورثِ اعلیٰ بہاء اللہ کی قبر ہے۔ جب اس فرقے کے پیروکار صہیونیت کی خدمت سے فارغ ہوجائیں تو اس قبر پر حج کے لیے جاتے ہیں۔ اس فرقے نے ماضی قریب میں ارضِ فلسطین میں اپنے سرپرست یہودیوں کے پاؤں جمانے کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ مسلمانوں کو ان کی

زمینوں اور جائیدادوں سے بے دخل کر کے ان کی جگہ یہودیوں کو بسانے میں اس خبیث الباطن فرقے کے افراد کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں میں گھل مل کر زمین بیچنے کی صورت میں بہت سے فوائد کا لالچ دیتے اور نہ بیچنے کی صورت میں نقصانات کے اندیشے سے ''خیر خواہانہ'' طریقے سے آگاہ کرتے۔ آج بھی ان کی ڈیوٹی اسی طرح کے ایک کام پر لگائی گئی ہے۔

صہیونیت کی چھتری تلے پرورش پانے والے عجمی النسل سابق فلسطینی وزیر اعظم کو یک نکاتی ایجنڈا سونپا گیا ہے یعنی فلسطین کی اسلامی جہادی تحریکوں حماس، الجہاد الاسلامی اور الفتح کے خلاف ہر سطح پر ایسے اقدام کرنا کہ یہ عوام کی اخلاقی حمایت سے محروم ہو جائیں، ان کا زور ٹوٹ جائے اور ان کی عسکری کارروائیوں سے اسرائیل کو پہنچنے والے نقصانات سے بچایا جا سکے۔ اپنے دورِ اقتدار میں محمود عباس کا سب سے زیادہ زور فدائی حملوں کی حوصلہ شکنی پر رہا ہے۔ یہود و ہنود کو دنیا کی زندگی سے حریصانہ محبت ہے اس لیے وہ مسلمانوں کے جذبۂ شہادت سے از حد خائف رہتے ہیں کیونکہ تمام تر بدنظمی، بے سروسامانی اور پسماندگی کے باوجود یہی ایک چیز ہے جس نے مسلمانوں کو سر اٹھا کر زندہ رہنے کا بہانہ فراہم کر رکھا ہے۔ اگر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر پاکستانی افواج کے جوان جسم پر بم باندھ کر بھارت کے اسلحہ اور نفری کی برتری کے جواب میں ''فی ٹینک ایک جوان'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے فدائی حملوں کے ذریعے بھارتی ٹینکوں کی پیش قدمی نہ روکتے تو آج بنئے کی دھوتی نہ جانے پاکستان میں کہاں کہاں پھڑ پھڑا رہی ہوتی۔ بالکل اسی طرح اگر فلسطینی جانباز صہیونی منصوبوں کو اپنے جسموں کی قربانی سے سبوتاژ نہ کرتے تو آج بیت المقدس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی بنیادیں رکھی جا چکی ہوتیں۔

جس طرح کوئی پاکستانی شاعر، دانشور، اداکار یا فلمکار پاکستانی عوام کو بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھانے اور جغرافیائی سرحدوں کو کاغذی لکیریں قرار دے کر دونوں ملکوں کے عوام کو باہم قریب آنے اور تمام فاصلے مٹا کر ایک ہو جانے کا مشورہ دے تو سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ بھارتی لابی نے ایک اور بٹیر پال لیا ہے، اسی طرح فلسطینی مسلمان کسی شخص کے مخلص یا ساتھی ہونے کا اندازہ اس امر سے لگاتے ہیں کہ وہ صہیونیت کے خلاف جہاد میں کتنا سرگرم ہے؟ لیکن

مرزا صاحب کے بارے میں فلسطینی مسلمانوں کو کسی کسوٹی سے کام لینے کی ضرورت نہیں، سب جانتے ہیں کہ اسرائیلی ایجنٹوں نے پچھلے سالوں میں چن چن کر یاسر عرفات کی جانشینی کی ممکنہ حق دار شخصیتوں کو ٹھکانے لگایا ہے تاکہ صہیونیت نواز فرقے کے اس ذہین اور کارآمد مہرے کو آگے بڑھا کر فلسطین کے اعلیٰ ترین مقتدر منصب پر فائز کروایا جاسکے۔ فلسطینی مسلمانوں کی صف میں نقب لگانے کے لیے جن بہائیوں کو ۷۰ کی دہائی میں فلسطینیوں کی صف میں داخل کر دیا گیا تھا، انہوں نے اپنے آقاؤں سے حق وفاداری خوب نبھایا چنانچہ ان میں سے ایک صہیونی ایجنٹ کو وزارتِ عظمیٰ پر فائز کر دیا گیا۔ عین ان دنوں جب ابو جہاد اور ابو عیاد جیسی نابغۂ روزگار فلسطینی جہادی قیادت کو اسرائیلی ایجنٹ چن چن کر شہید کر رہے تھے، محمود عباس پیرس اور روم کے شاندار محل نما بنگلوں میں دادِ عیش دے رہا تھا۔ یورپ کے شہروں کو چھوڑیئے رام اللہ اور غزہ میں ان کے ایک ایک گھر کی قیمت ۱۰ ملین ڈالر بنتی ہے۔ یہودی سرمائے سے حاصل ہونے والی ان عیاشیوں کا حق اس نے جہادی تحریکوں کی حوصلہ شکنی اور مجاہدین کا مورال گرانے کی ہر ممکن کوشش کے ذریعے ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے اس کی سیاست انگریز والی سیاست رہی ہے کہ مظلوم مسلمانوں نے احتجاج کرنا ہے تو صرف نعرے لگائیں، جلسے کریں اور دل کا غبار فضا میں اڑا کر ٹھنڈے ٹھار ہو کر گھروں کو جائیں۔ ہتھیار اٹھانا یا خود کش حملے کرنا ان کے مفادات کے خلاف ہے۔ اس سے امن کی کوششیں متاثر اور مطالبات منوائے جانے کے امکانات سبوتاژ ہوتے ہیں۔

محمود عباس بڑے خیر خواہانہ انداز میں دلسوزی کے ساتھ فلسطینیوں کو سمجھاتے ہیں: ''جب فلسطینی اسرائیلیوں پر حملے کرتے ہیں تو اسرائیلی ان حملوں کو جواز بنا کر فلسطینیوں کو مارتے ہیں اس لیے اسرائیلیوں کے جواز کو ختم کیا جائے۔'' یہ کہنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے: ''پاکستان جب میزائل تیار کرتا ہے تو بھارت بھی دور مار میزائل کے تجربات کرتا ہے اگر علاقے میں کشیدگی کو روکنا ہے تو جدید اسلحہ کے حصول کی کوشش ختم کر دینی چاہیے۔'' فلسطینی مسلمان ان کے جھانسے میں آجاتے، اگر مرزا صاحب چند خطرناک غلطیاں نہ کر چکے ہوتے۔ یہ غلطیاں بالکل ایسی ہی تھیں جیسی ہمارے ہاں کے بعض دانشور دِلّی اور بمبئی کی یاترا کے بعد کر بیٹھتے ہیں اور پھر

باشعور پاکستانیوں کی نظر میں ہمیشہ کے لیے داغدار ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے فلسطینی ہوتے ہوئے بھی یہودیوں کی سب سے بڑی بستی ابوغنیم کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا۔ دوسرے یہ کہ وہ صہیونیت نوازی میں اتنا آگے چلے گئے کہ کھلم کھلا کہنے لگے اب مسلمانوں کو عالمِ اسلام کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ وہ تمام امیدیں مغرب سے رکھیں، اہلِ مغرب ہی ان کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ترنگ میں آ کر اپنی اہمیت جتانے کے لیے یہ کہہ بیٹھے کہ وہ اسرائیلی خفیہ تنظیموں کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں، لہٰذا ان کے مشوروں کو زیادہ غور کیے بغیر قبول کر لینا چاہیے۔ ایک پہاڑ جیسی غلطی مرزا جی نے یہ کی کہ فلسطینی مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوششوں میں لگے رہے کہ امریکا اور اس کے حلیف اسرائیل کے خلاف جنگ کے نتائج بھیانک ہو سکتے ہیں، چنانچہ وہ بیچ میں پڑ کر ''اوسلو معاہدہ'' کروانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس معاہدے سے فلسطینی مسلمان ''بھیانک نتائج'' سے محفوظ ہوئے یا نہ، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انہیں فلسطین کی ۸۰ فیصد زمین سے دستبردار کروا دیا گیا۔ اس طرح کی حرکتیں ہمارے ملک کے کچھ رہنما بھی بھارت کے حوالے سے کرتے رہتے ہیں۔ ان کے بیانات ایک ہی طرح کے ریموٹ کنٹرول سے منسلک ہوتے ہیں۔

''اوسلو معاہدے کے معمار'' کا خطاب پانے والا یہ عجمی النسل شخص کسی عرب ریاست کا پہلا غیر عربی سربراہ رہا ہے۔ حیرت ہے جب مسلمان اس قدر غفلت میں ہیں کہ اپنے باصلاحیت لوگوں کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھا رہے اس وقت یہود و ہنود طویل المیعاد منصوبہ بندی کے ذریعے ان کی آستین میں اپنے سانپ پال رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے ان سانپوں کا رنگ وروپ، ان کے ڈسنے کا انداز اور ان کے گندے زہر کی تباہ کاریاں ایک جیسی ہیں مگر ہم اپنی آستینوں میں جھانک کر نہیں دیکھتے کہ کیا چیز کا بلا رہی ہے؟ یہود و ہنود کا طریقہ واردات ایک جیسا ہے، فلسطین اور پاکستان میں سرگرم بیرونی ایجنٹوں کی کارستانیاں، کام کرنے کا انداز اور انہیں پڑھائے گئے بول ایک جیسے ہیں مگر ہم پھر بھی انہیں پہچان نہیں سکتے۔ جب چوکیدار ہی اندھاپے کے مرض میں مبتلا ہو تو چور کو کس چیز کا ڈر ہو سکتا ہے......؟

اے میری قوم کے لوگو!

ایک ابلیسی جواب:

باطل کی عادت رہی ہے کہ وہ اپنی ترویج کے لیے حق کی طرف نسبت کا سہارا لیتا ہے اور اس نسبت کی سند ایسی بیان کرتا ہے جس کو تحقیق کے معیار پر پرکھا ہی نہ جا سکے۔ اپنے گندے نسب کو چھپانے کی اور حق کے سرچشموں میں سے کسی سے اپنا سلسلہ جوڑنے کی جھوٹی کوشش، باطل کا وہ شیطانی ہتھکنڈہ ہے جسے طاغوت کے چیلے صدیوں سے آزماتے چلے آرہے ہیں۔ مثلاً: جب آپ کسی جوتشی، ماہرِ علمِ نجوم، ماہر عملیات و مستقبلیات کو دیکھیں کہ وہ کسی کو سعد و نحس اوقات کی تفصیل بتلا رہا ہے یا ''یہ ہفتہ کیسا گزرے گا؟'' یا ''آج کا دن کیسا رہے گا؟'' کے متعلق پیش گوئی کر رہا ہے اور اس کذّاب سے پوچھیں کہ یہ کون سا علم ہے جس سے تمہیں مالدار لوگوں کے مستقبل کی خبر تو ہو جاتی ہے لیکن اپنی خوار حالت کی ہوا نہیں لگتی؟ تو وہ کہے گا کہ یہ باطنی علم ہے جو فلاں مقدس پیغمبر یا بزرگ شخصیت سے منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ اور اگر آپ اس سے پوچھ لیں کہ ان پیغمبر یا بزرگ کی زندگی میں کہیں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اس طرح کا شغل رکھتے تھے بلکہ ان کی ساری زندگی ایسی چیزوں کو شیطانی کام کہتے اور ان سے روکتے روکتے گذری۔ آخر تمہارے پاس ان علوم کی ان تک نسبت کی سند کیا ہے؟ تو اس کے پاس ایک ہی جواب ہوگا اور یہ وہ ابلیسی جواب ہے جو تمام باطل گروہ، فرقے، افراد اور ادارے استعمال کرتے ہیں یعنی: ''یہ علوم ہم تک ''سینہ بہ سینہ'' منتقل ہوئے ہیں۔ کن بزرگوں سے سینہ بہ سینہ؟ سلسلۂ روایت بیان کرو؟ تو کذاب مبہوت رہ جائے گا۔

شرک کی ایک سائنٹیفک شکل:

دراصل شریعت میں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں جسے عام انسانیت سے پوشیدہ رکھا گیا ہو۔ ہدایت اور علومِ ہدایت تو ہر شخص کے لیے ہیں۔ انہیں بعض لوگوں کے ساتھ مخصوص کرنا اور بقیہ مخلوق کو ان سے محروم رکھنا ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ، مقرب فرشتے، برگزیدہ بندے، ان کے شاگرد اور بزرگانِ دین سب اس ظلم سے بری اور پاک ہیں۔ مستقبل کے احوال کسی کو بتلانا، علم غیب کے دعویٰ کے مترادف ہے اور ایسا دعویٰ کھلا شرک ہے اور کسی شخص سے ہاتھ دکھا کر، یا اپنا برج بتا کر ستاروں کی گردش کے حساب سے خیر وشر کی معلومات حاصل کر کے ان پر اعتماد کرنا، اس دعوے کی تصدیق ہے۔ شرک کی تصدیق نہ یہ کہ خالص شرک ہے بلکہ اس کی ترویج اور بدترین گناہ ہے۔ آج کل یہ شرک ہمارے ہاں بڑے سائنٹیفک انداز میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ اخباروں اور سائن بورڈز پر فون نمبر لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور دعوت دی جاتی ہے کہ ایک کال ملا کر آپ خفیہ علوم کے خزانوں سے وہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں جن تک عام لوگوں کی رسائی نہیں۔ مختلف اثرات والے پتھروں کے اشتہارات بھی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ یہ سب شرک فی الصفات اور شرک فی التصرف کی بدترین قسمیں ہیں جو یہود نے بابل کی جادونگری میں واقع طلسم کدوں میں ایجاد کی تھیں اور جن کے پھندے میں پھنسنے والا اپنی دنیا و آخرت تباہ کر بیٹھتا ہے۔

ستّر بڑوں کی روایات:

جب یہودیت کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے سیدنا حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل شدہ دینِ موسوی مراد نہیں ہوتا بلکہ اس سے وہ محرّف شدہ اور بنی اسرائیل کے دنیا پرست مذہبی پیشواؤں کی خود ساختہ موسوی شریعت مراد ہوتی ہے جو اللہ اور اس کے سچے انبیاء سے بغاوت پر مبنی ہے۔ حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال کے مارے ہوئے یہودی پیشواؤں نے شیطان کی پیروی کرتے ہوئے جو من چاہی شریعت وضع کی، اس کے مجموعے کا نام ''تلمود'' رکھا اور پھر مذکورہ بالا مشہور زمانہ ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہوئے اسے ان ستّر بزرگوں کی طرف منسوب کر دیا جو سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر احکام الٰہی لینے گئے

تھے۔ حسبِ دستور یہود کے پاس ''ستر بڑوں'' سے منقول ان روایات کی کوئی سند نہیں، ان کے روحانی پیشوا (جن سے علوم اسلامیہ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کرنے کے لیے ہمارے ملک کا ذہین افرادی سرمایہ یورپ اور امریکا کی یونیورسٹیوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے) انہیں ''رازداری'' کا وعدہ لے کر سمجھاتے ہیں کہ یہ احکام تحریری نہ تھے، زبانی تھے اور ''سینہ بہ سینہ'' منتقل ہوتے چلے آتے ہیں۔ ان خفیہ رازوں کو انہوں نے ''سبعین'' (SEPTUAGINTA) کا نام دیا اور اسے یہودیت کی بنیاد قرار دے دیا گیا۔ یہودیوں کا یہ مجموعہ دراصل ان کے شکم پرست اور دنیا کے پجاری مذہبی رہنماؤں کی تالیف تھی اور بنی اسرائیل کے ان علمائے سوء نے جھوٹ اور افتراء کے اس پلندے کو باضابطہ قانون کی شکل دے دی اور طے کرلیا کہ ان کی مخالفت کرنے والے تمام انبیاء بنی اسرائیل، ان کی وحی اور تعلیمات غیر قانونی اور گمراہی ہیں اور ان کی تبلیغ کرنے والا قابلِ گردن زدنی ہے۔ یہ وہ دور ہے جو سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد سے ۴۰۰ برس پیشتر کے عرصے پر پھیلا ہوا ہے اور ان چار صدیوں میں یہودی رؤسا، امراء اور زعماء نے جاہل روحانی پیشواؤں کے کہنے پر اپنے انبیاء کا بے دریغ خون بہایا۔

تاریخی دشمنی کا نقطۂ عروج:

اس دور میں یہود کی بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ انبیائے کرام اور حق کے داعی انہیں ان حرکتوں سے باز آنے کی تلقین کر رہے تھے، ان گناہوں پر سخت مصائب کی وعید سنا رہے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بشارتیں دے رہے تھے اور ساتھ ہی حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد اور دجالِ اکبر کے خروج کی خبر دے رہے تھے۔ ...... لیکن وہ قوم جسے اتنی فضیلت عطا کی گئی تھی کہ امتِ محمدیہ سے قبل کسی کو عطا نہ ہوئی تھی، وہ پے در پے انبیائے کرام علیہم السلام کے بھیجے جانے اور وقتی مصیبتوں اور عذابوں میں مبتلا ہونے کے باوجود شیطان کی پیروی سے باز آنے کو تیار نہ تھی، لہٰذا ان کو آخری موقع دینے کے لیے ایک بہت ہی صاحبِ فضائل و مناقب اور عجیب وغریب معجزات کے حامل پیغمبر (جناب عیسیٰ مسیح علیہ السلام) بھیجے گئے تاکہ یہود اپنی روش سے

باز آ جائیں ورنہ ان کو ان کے مقام سے معزول کر کے ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی جائے گی اور وہ ابدی اور دائمی ذلت وخواری کا نمونہ بنا دیے جائیں گے۔ مذکورہ مقدس نبی آئے لیکن یہ نامراد قوم اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر مزید پختہ ہوگئی۔ اس نے اس مقدس پیغمبر کو بزعم خود سولی دینے کی کوشش کی اور پھر باضابطہ اور پکے ٹھکے باغی بن کر حق اور اہل حق کی دشمن ہوگئی۔ اس نے اس نظریے کو فروغ دیا کہ ہم آنے والے دجالِ اکبر یعنی المسیح الدجّال کے منتظر ہیں اور اس کے علاوہ کسی مسیح یا نبی کو اپنا دشمن تصور کرتے ہیں۔ اس موقع پر اس نے تحریف وتبدیل کی بدنام زمانہ عادت سے کام لیتے ہوئے مسیح صادق کی آمد سے متعلق بشارتوں کو دجّالِ اکبر سے اور دجّال ملعون پر آنے والے ابتلاء وآزمائش کو سچے مسیح پر منطبق کرنا شروع کر دیا۔ اس تاریخی دشمنی (میں دہراتا ہوں: تاریخی دشمنی........ اے وہ لوگو جن کے دل میں ایمان کی ایک رمق اور دماغ میں عقل کا ذرہ باقی ہے سمجھ لو کہ اسرائیل کی طرف سے حال ہی میں مسلمان ممالک کے لیے ویزا کھولنا اور یہ کہنا کہ ہماری کسی مسلم ملک سے کوئی دشمنی نہیں، روئے زمین پر بولا گیا بدترین جھوٹ ہے) کا نکتۂ عروج وہ زمانہ تھا جب یہود کے تین قبیلے فلسطین سے نقل مکانی کر کے کھجوروں والی سرزمین ''یثرب'' میں آ کر آباد ہوگئے۔

۱۴۹۴ء کا سال:

عام طور پر مشہور ہے کہ یثرب میں مقیم یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اور بعثت کے منتظر تھے اور ان پر ایمان لانے کے لیے مدینہ منورہ آئے تھے۔ یہ بات ان چند خوش نصیب ہستیوں کی حد تک تو درست ہے جنہیں دونوں انبیاء اور دونوں کتابوں پر ایمان لانے اور دہرا اجر حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی لیکن یہود کی فطرت اور مزاج کو سامنے رکھ کر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہود کی اکثریت کے بارے میں یہ بات درست دکھائی نہیں دیتی۔ یہود دراصل اپنی معلومات کی حد تک اللہ کے مسیح کا کام (نعوذ باللہ) تمام کر چکے تھے اور اب انہیں صرف ایک خطرہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ خطرہ نہ تھا بلکہ دراصل تمام جہانوں کے لیے رحمت تھا لیکن طاغوت کے پجاری یہود، حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہما السلام سے آخری

نبی کے بارے میں بشارتیں سن کر بھی اس مجسم خیر و برکت کو اپنے دجالی منصوبوں کے لیے معاذ اللہ خطرہ سمجھتے تھے۔ یہود اس آخری خطرے سے نمٹنے کے لیے جزیرۃ العرب روانہ ہونے لگے اور ان کی ایک بڑی تعداد یثرب میں جمع ہوگئی۔ جن لوگوں نے خود اپنی قوم بنی اسرائیل میں آنے والے انبیاء بالخصوص حضرت یحییٰ وحضرت عیسیٰ علیہما السلام کو...... اپنے علم اور دعووں کی حد تک...... قتل کرڈالا تھا، ان کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ ایک دوسری قوم بنی اسماعیل میں آنے والے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کے انتظار میں یثرب آ بسے تھے، قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ درحقیقت وہ اپنے ناپاک مشن کی تکمیل کے لیے جتھے بنا کر تیاریوں کے ساتھ آئے تھے اور ''یثرب سے مدینۃ النبی تک'' کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی کارروائیوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ لوگ آپ پر ایمان لانے کے لیے جمع ہوئے ہوتے تو خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام نشانیاں ان کی کتابوں میں موجود تھیں، سب سے پہلے وہ ایمان لے آتے لیکن وہ تو عام یہود کو بھی ایمان نہیں لانے دیتے تھے اور ایمان لانے والوں کو قتل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چراغِ مصطفوی کو بجھانے کے لیے ان بدبختوں نے سفلی علوم کا سہارا لینے سے لے کر جنگجو مخالفین کو ورغلا کر مدینۃ الرسول پر چڑھا لانے تک ہر طرح کی اور ہر ممکن کوشش کی لیکن اسلام اور مسلمانوں پر اللہ کا فضل اور جہاد کی برکت تھی کہ ان کے یہ جانی دشمن ناکام و نامراد اور ذلیل و رسوا ہوئے۔ یہ ذلت و رسوائی ان پر مسلسل مسلط رہی اور وہ جزیرۃ العرب سے جلاوطن ہوجانے کے بعد ساری دنیا میں دربدر خاک بسر بھٹکتے رہے تا آنکہ ۱۴۹۴ء کا سال آ گیا۔

پانچ کونوں والی پُراسرار عمارت:

یہ وہ سال ہے جس میں کولمبس ہندوستان کی تلاش میں نکلا اور جزائر غرب الہند سے ہوتا ہوا امریکا دریافت کرگیا۔ اگر ابوعبداللہ نامی کم بخت اور والد کے نافرمان حکمران کی نااہلی سے اسپین سے مسلمانوں کی خلافت ختم نہ ہوئی ہوتی تو آج براعظم امریکا و آسٹریلیا کی دریافت کا سہرا مسلمانوں کے سر ہوتا اور وہاں عیسائیت اور یہودیت کی بجائے اسلام کا ڈنکا بج رہا ہوتا۔

غرناطہ کا سقوط ۱۴۹۲ء میں ہوا جبکہ مسلمان جہاز رانوں اور جغرافیہ دانوں کی بحری مہمات اور اکتشافی جدوجہد عروج پر تھی۔ اس کے صرف دو سال بعد ۱۴۹۴ء میں مسلمان ملاّحوں اور نقشہ دانوں کی مدد سے کولمبس امریکا دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسپین کے یہودی مسلمانوں کے دورِ حکومت میں امن وامان سے رہتے تھے کیونکہ مسلمان وسیع الظرف تھے اور عفوو درگزر سے کام لیتے تھے جبکہ ان کی جگہ لینے والے عیسائی متعصب اور تنگ دل تھے انہوں نے یہودیوں کا جینا دوبھر کردیا تھا، چنانچہ یہودی جوق درجوق اپنا سودی سرمایہ ساتھ لے کر بحرِ ظلمات کے پار نئی دریافت شدہ دنیا میں پہنچنے لگے۔ (یہودی اس نقل مکانی کو فرعون کی غلامی سے بھاگ کر ملک کنعان...... فلسطین...... میں بس جانے سے تشبیہ دیتے ہیں) اور یوں دنیا میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کے نام سے وہ سلطنت وجود میں آئی جو ''عظیم تر اسرائیل'' کی تشکیل اور دجّال کی عالمی حکومت کے باضابطہ قیام سے قبل ایک عبوری حکومت ہے۔ امریکا اگر عیسائی ریاست ہوتا تو اس کا سب سے بڑا تہوار کرسمس ہوتا جبکہ اس کا سب سے بڑا سرکاری تہوار THANKSGIVING ہے جو دراصل یہود کے مذہبی تہوار Jewish festival of Havrcest of Succoth کا دوسرا نام ہے۔ اس کے صدر کی رہائش گاہ جسے عرفِ عام میں وہائٹ ہاؤس کہتے ہیں دراصل یہودیوں کی اصطلاح میں وہ عبوری مرکزِ حکومت ہے جو اسرائیل سے باہر ہو اور ''ہیکل سلیمانی'' (جو ان کے خیال میں دجّال کا مرکزِ حکومت ہوگا) سے قبل اس کا قائم مقام ہو۔ امریکی وزارتِ دفاع کا مرکز اور سپریم کمانڈر ہیڈ کوارٹر کو مخمس یعنی پانچ کونوں پر مشتمل عمارت کی شکل میں بنایا جانا اتفاق نہیں، دراصل یہ ''پنج گوشہ'' عمارت حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر یا ڈھال (مہرِ سلیمانی یا سپرِ سلیمانی) کے نقش کے مطابق قائم کی گئی ہے اور یہودی معتقدات کے مطابق دجّالِ اکبر کے ظہور سے قبل دجّالِ اصغر کی فوج کا عالمی صدر دفتر ہے۔ یہاں ۲۷ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ جن میں سات ہزار ماہرینِ نفسیات ہیں۔ ان کے پاس ہر ملک کے ہر لیڈر کی فائل موجود ہے۔ عالمِ اسلام کے تمام رہنماؤں کے علاوہ جتنی اہم جماعتیں اور جتنی اہم سرکردہ شخصیات ہیں ان کا ریکارڈ اس ادارہ میں اکٹھا کیا

جاتا ہے اور یہ ماہرین نفسیات ان شخصیات کا مکمل تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں پالیسیاں تشکیل دیتے، ان سے نمٹتے اور اپنے اہداف متعین کرتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا یہودیوں کے طویل سیاسی و روحانی سفر کی درمیانی منزل ہے جس کی سرکاری مہر اور نشان...... مشہور فری میسن مہر اور نشان ہے۔ اس کا پہلا صدر اور بانی جارج واشنگٹن نہ صرف یہ کہ کٹر فری میسن تھا بلکہ اس کا شمار یہود کے نامور روحانی پیشواؤں میں ہوتا ہے۔ اس نے امریکا کی جنگِ آزادی کو فری میسن کے سیاسی و عسکری ماہرین کے ترتیب دیے گئے انقلاب فرانس کی طرز پر آگے چلایا اور یہود کے ماسٹر پلانرز کی بہترین منصوبہ بندی سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ستّر بزرگوں کی مجلس:

غور کرنے والوں کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ نہ صرف یہ کہ امریکا کے ریاستی اداروں کی تعمیر یہود کی فلاسفی کی آئینہ دار ہے بلکہ اقوامِ متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے بھی ان مخصوص علامات سے خالی نہیں جو یہود کے شیطانی دماغ کی تخلیق ہیں۔ مثلاً: سلامتی کونسل کی نشستوں کے انداز ترتیب کو لے لیجیے۔ یہ نصف دائروی نشست گاہ اس قدیم مجلس کی یادگار ہے جو کسی زمانے میں ہیکل سلیمانی کے احاطے میں یہود کے ''ستر بزرگوں'' کے لیے ترتیب دی جاتی تھی اور وہ CATENARIANARCH کے طرز پر بنی اس مجلس میں بیٹھ کر فیصلے جاری کیا کرتے تھے۔ گویا کہ موجودہ سلامتی کونسل ایک عبوری سلامتی کونسل ہے۔ جب (خدانخواستہ) مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر ہو کر عظیم ریاست اسرائیل قائم ہو جائے گی (عراق پر قبضہ اس کا ایک حصہ ہے جس میں حصہ لینے والی ابلیسی فوج کی مدد کے لیے خیر امت کے خیر العساکر حصہ لینے کے لیے کمربستہ ہو چکے ہیں) تو قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی یہ موجودہ سلامتی کونسل ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ''ستر بزرگوں'' پر مشتمل وہ سلامتی کونسل بن جائے گی جو ہیکل سلیمانی کے اندر اجلاس منعقد کرے گی اور دجّال کی عالمی حکومت کا نظام چلائے گی۔

کوئی تو بتائے!:

تو اے میری قوم کے لوگو! یہ ہے وہ داستانِ دل خراش جس کو سن کر تم میں کی اکثریت اسے

مولویوں کا پاگل پن قرار دے کر ہنسے گی......... لیکن قسم بخدا یہ ہنسنے کا موقع نہیں، رونے کا مقام ہے کہ ہمیں یعنی اہلِ پاکستان کو اللہ ربّ العزت نے اسرائیل کی ابلیسی ریاست کے مقابلے میں پاکستان کی شکل میں رحمانی سلطنت کے قیام اور تعمیر و ترقی کے لیے منتخب فرمایا لیکن ہم اپنا مقام و مرتبہ پہچاننے، اسلام اور اہلِ اسلام کی خدمت کرنے اور اپنی بنیادوں کی طرف پلٹ کر انہیں مستحکم کرنے کی بجائے نصف صدی سے بنی اسرائیل کی مانند ''وادی تیہ'' میں بھٹک رہے ہیں۔ قرآنی نظامِ حکومت اور مدنی معاشرے کی تشکیل کی بجائے مغربی نظامِ حکومت کے دلدادہ اور ابلیسی معاشرت پر فریفتہ ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے استقبال کی تیاری اور ان کے دشمن دجّالِ اکبر کی سلطنت کے خلاف اعلانِ جہاد کی بجائے دجّال کے استقبال پر آمادہ اور اس کے پایۂ تخت کو تسلیم کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ہمارا پیارا وطن اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل فوج ہمیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے دی گئی تھی، ہم نے اس وطن کو عالمی حکومت الٰہیہ کا پایۂ تخت اور اس کی فوج کو اسلام کے عالمی خادم بنانا تھا، مگر ہم اسے دجّال کی عبوری حکومت کا حلیف اور پاک فوج کو یہودیت کے معاونین بنانے کے ''عظیم اور تاریخ ساز'' فیصلے کر رہے ہیں۔ کسی قوم نے اپنے ساتھ وہ کچھ نہ کیا ہوگا جو ہم نے کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آخر کوئی تو بتائے کہ ہم کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ اور کس منزل کی طرف جا رہے ہیں؟

دو انوکھی مثالیں

اللہ تعالیٰ کی عادت مبارکہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی نیکی کا بدلہ اس کی قربانی کے مطابق اور بدی کی سزا اس کے گناہ سے ملتی جلتی دیتے ہیں۔ اس کی دو مثالیں بہت ہی سبق آموز اور انوکھی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرنے والوں کو اس بات کی خوشخبری دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کیا گیا سودا بہر حال نفع کا سودا ہوتا ہے اس میں خسارے کا کوئی امکان نہیں اور اس کے دشمنوں کو اس چیز سے ڈراتی ہیں کہ ان کی مہلت جتنی لمبی ہو لیکن ایک دن وہ ضرور گرفت میں آئیں گے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ دو مثالیں صرف اسلام کی ہی نہیں اس کائنات کی تاریخ کی منفرد مثالیں ہیں۔ اس اعتبار سے بھی کہ ان دونوں کا تعلق اس کائنات کے اختتامی دور سے ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ دنیا کے تین بڑے آسمانی مذاہب اسلام، عیسائیت اور یہودیت میں ہونے والی پیش گوئیوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان تینوں مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے مذہب اور نظریے کے سارے عالم پر غلبے کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں، ان دونوں مثالوں کا تعلق ان کے فیصلہ کن نتائج سے ہے۔

پہلی مثال خلیفہ آخر الزماں، مہدی منتظر، محمد بن عبداللہ (جو کہ حضرت حسن بن فاطمہ بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہوں گے) کی ہے۔ حدیث شریف میں قیامت کی جو علامات صغریٰ و کبریٰ بیان ہوئی ہیں ان میں حضرت مہدی (ان کے نام کے شروع میں امام اور آخر میں علیہ السلام کا لفظ نہ لگانا چاہیے۔ دیگر محترم ہستیوں کی طرح حضرت کا لفظ لکھنا چاہیے) کے بارے میں اس کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں کہ معنوی اعتبار سے وہ حد تواتر تک پہنچ گئی ہیں۔ ''متواتر'' اس حدیث کو کہتے ہیں جو صحیح ہو اور جسے ایسے ثقہ راویوں نے بیان کیا ہو جن کا کذب پر

اتفاق محال ہو۔ اگر لفظ ایک جیسے ہوں تو یہ تواترِ لفظی ہے اور جب یہ روایات معنوی طور پر بعینہٖ ملتی ہوں، الفاظ میں تھوڑا بہت اختلاف ہو تو ایسی حدیث کو ”متواتر معنوی“ کہتے ہیں اور جمہور علما کے نزدیک اس سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے۔ امام شوکانی (المتوفی ۱۲۵۰ھ) اپنی مشہور کتاب ”نیل الاوطار“ اور ”التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر والدجّال والمسیح“ میں حضرت مہدی کے بارے میں وارد تمام احادیث کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں: ”حضرت مہدی کے سلسلہ میں وارد ہونے والی قابلِ اعتماد احادیث کی تعداد ۵۰ ہے۔ ان میں صحیح بھی ہیں، حسن بھی۔ یہ سب احادیث بلاشک وشبہہ متواتر ہیں۔“ نواب صدیق حسن خان قنوجی (متوفی ۱۳۰۷ھ) نے اپنی کتاب ”الإزاعة لما کان ومایکون بین یدی الساعة“ میں کہا ہے کہ مہدی کے بارے میں مختلف سندوں سے اس کثرت سے احادیث آئی ہیں کہ وہ حدِ تواتر تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر اکابرِ علماء اسلام نے ان احادیث کے جمع اور تشریح وتوضیح پر خاص توجہ دی ہے اور اس بارے میں ۳۰ سے زائد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بندہ ان میں سے ایک درجن سے زائد کتابوں کو براہِ راست اور نصف درجن کے قریب کتب کے اقتباسات کو بالواسطہ بحوالہ دیگر کتب مطالعہ کر چکا ہے۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ آخر زمانہ میں اللہ تعالیٰ اُمّتِ محمدیہ میں اہل بیت میں سے ایک سیدزادہ تیار کرے گا جو مہلک فتنوں اور خونریز جنگوں میں مسلمانوں کی قیادت کرے گا۔ وہ سامرا کے تہہ خانے سے نمودار نہیں ہوگا بلکہ حسن بن فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے سادات خاندان کا ایک نوجوان ہوگا جس کا نام محمد بن عبداللہ ہوگا۔ یعنی اس کا نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام جیسا اور اس کے والد کا نام آپ کے والد کے نام جیسا ہوگا۔ وہ خلیفہ راشد اور قائد مہدی یعنی ہدایت یافتہ رہنما ہوگا۔ وہ اول تا آخر سراپا جہاد اور مجاہدِ اعظم ہوگا۔ جہاد اس کا اوڑھنا بچھونا ہوگا۔ جہاد کی برکت سے وہ ظلم وفتنہ سے بھرے ہوئے خطۂ ارض کو عدل وانصاف سے بھر دے گا۔ سات آٹھ یا نو برس تک حکومت کرے گا اس کے دورِ حکومت میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد لوگ اس طرح ناز ونعمت سے زندگی بسر کریں گے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ رات بھر میں مہدی کو تیار کر کے اس کی اصلاح کرے گا اور اس کی پشت پناہی کرے گا۔

''اللہ اس کی اصلاح کرے گا'' یہ حدیث شریف کا جملہ ہے۔ اس تعبیر کے کیا معنی ہیں......؟ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ١۔ اس میں کچھ چھوٹے چھوٹے نقص (صغیرہ گناہ) ہوں گے۔ اللہ اس کی توبہ قبول کرکے اس کو توفیق بخشے گا اور رشد و ہدایت اس کے دل میں ڈال دے گا۔ پہلے سے اس کی یہ کیفیت نہ ہوگی۔ ٢۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ اسے خلافت اور آخری زمانے کے فتنوں اور جنگوں کے درمیان مسلمانوں کی قیادت کے لیے تیار کرے گا۔ دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں۔

آج کل پیر نما گمراہ لوگوں اور سستی اور جھوٹی شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے خواہش مند کذابوں نے مہدی ہونے کے دعویٰ کو فیشن بنا لیا ہے۔ اگر عوام الناس کو حضرت مہدی کے بارے میں صحیح احادیث میں وارد شدہ علامات معلوم ہوں تو وہ کبھی ان دجالوں کے ورغلانے میں نہ آئیں گے۔ پہلی بات یہ یاد رہنی چاہیے کہ حضرت مہدی کسی غار کے دہانے یا کسی ملنگ کے آستانے پر کھڑے ہو کر دعویٰ نہ کریں گے۔ ان میں ایسی قائدانہ صفات ہوں گی کہ وہ گمنام رہنا چاہیں گے لیکن لوگ انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ دعویٰ تو کجا لوگوں سے چھپیں گے کہ کہیں ان کو امیر نہ بنا لیا جائے۔ لوگ ان میں قیادت کی صفات دیکھ کر ان کی بیعت پر اصرار کریں گے اور انہیں قیادت قبول کرنے پر مجبور کریں گے، لہٰذا جھوٹے مہدی کی پہلی علامت یہی ہے کہ مہدی ہونے کا دعویٰ کرے۔ ایسا شخص بلاشبہ کذّاب اور شیطان ہے۔ پھر حضرت مہدی عربستان میں ظاہر ہوں گے۔ ان کے ہاتھ پر امارت اور جہاد پر بیعت بیت اللہ اور مقامِ ابراہیم کے درمیان ہوگی۔ لہٰذا جو مہدی کہیں اور ظاہر ہوتا ہے یا جس مہدی کا جہاد سے تعلق نہیں اس کا دعوائے مہدویت لپیٹ کر اسی کے منہ پر مار دینا چاہیے۔ حضرت مہدی کے ہاتھ پر بیعت وہ لوگ کریں گے جن کے پاس کوئی قوت ہوگی نہ تعداد اور نہ ہی ساز و سامان۔ ان کو اپنوں پرایوں سب کی مخالفت کا سامنا ہوگا، حتیٰ کہ کچھ کم بخت مسلمان ان کو گرفتار کرنے کے لیے آئیں گے۔ حضرت مہدی اور ان کے ساتھی خانۂ کعبہ میں پناہ لیے ہوں گے۔ اس وقت سچے مہدی کی سب سے بڑی علامت ظاہر ہوگی جو یقینی علامت ہے اور جس میں نہ پائی جائے وہ مہدی (ہدایت یافتہ) نہیں، ضال و مضل (گمراہ اور گمراہ کنندہ) ہے۔ وہ یہ کہ یہ مخالف لشکر

مدینہ منورہ سے تھوڑی دور ذوالحلیفہ کے مقام پر سارا کا سارا زمین میں دھنس جائے گا۔ زمین پھٹے گی اور انہیں نگل کر دوبارہ پہلے جیسی ہو جائے گی۔ ایک دو آدمی بچ جائیں گے جو لوگوں کو اس عظیم حادثے کی خبر دیں گے۔ یہ خبر سن کر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ بیت اللہ کے یہ پناہ گزین ہی خلیفہ آخر الزماں ہیں جو مسلمانوں کے لیے جہاد کے قائد ہوں گے اور پھر جن لوگوں کی قسمت میں سعادت اور نیک بختی لکھی ہے اور جو گناہوں کے دور میں دین پر استقامت کے ساتھ جمے رہیں گے، اپنی زبانوں اور شرم گاہوں کو حرام سے آلودہ نہیں ہونے دیں گے، وہ جوق در جوق جماعتوں کی شکل میں آ کر ان کی بیعت کریں گے، یعنی ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر انکی اطاعت اور دین کی سربلندی کے لیے جان و مال سے جہاد کا وعدہ کریں گے۔ ان کا ایک ہی نعرہ ہوگا ''فتح یا شہادت'' سچے مہدی اپنے ان جانثاروں سے اپنے لیے کوئی مالی مفاد حاصل نہ کریں گے بلکہ انہیں ان چیزوں کی فرصت ہی نہ ہو گی۔ وہ تو فوراً ہی ایسے معرکوں میں کود پڑیں گے جو انتہائی خونریز اور مردانگی کا امتحان ہوں گے۔ سارا عالم ان سے جنگ پر کمربستہ ہوگا اور وہ اپنے مجاہد ساتھیوں کے ساتھ پورے عالم پر غلبۂ اسلام کے لیے میدان میں نکل آئیں گے۔ مختصر سے عرصے میں وہ جزیرۃ العرب کے ''کچھ'' عرب مسلمانوں سے، فارس کے ''کچھ'' فارسی مسلمانوں سے، لادین ترکوں سے، یورپ کے عیسائیوں سے، خوزستان اور کرمان (موجودہ روس) کے کمیونسٹوں سے اور آخر میں یہودیوں (امریکا اور اسرائیل) سے جہاد کریں گے اور ان سب جنگوں میں اللہ رب العالمین کے حکم سے ان کے مجاہدین کو فتح ہوگی۔ اللہ کے دین کا ہر سُو بول بالا ہوگا اور اسلام کو پورے کرۂ ارض پر وہ عروج نصیب ہوگا جس کی عرصہ سے مسلمان تمنا کرتے چلے آئے ہوں گے۔ جو مسلمان اس نیک بختی میں سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے گناہوں سے توبہ کرے، حُبِ جاہ وحُبِ مال سے پیچھا چھڑائے اور خود کو اور اپنی اولاد و متعلقین کو خونریز معرکوں میں مسلمانوں کی حمایت کے لیے جہاد کی بہترین تربیت دے کر تیار کرے۔

حضرت مہدی کے بارے میں یہ چند باتیں ۵۰ سے زائد ان احادیث اور ڈیڑھ درجن

سے زائد ان کُتب کا خلاصہ اور مصداق ہیں جو ان کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ انہیں نقل کرنے کی غرض یہ ہے کہ حضرت مہدی کا مقصدِ ظہور جہاد کے ذریعے اسلام کا غلبہ ہوگا۔ جو شخص مہدی ہونے کا دعویٰ کرے اور شعبدوں کے ذریعے جہاد کے علاوہ کسی اور بات پر لوگوں کو جمع کرے یا اپنی کرشماتی شخصیت جتا کر لوگوں کی عقیدت کا رخ دین کی بجائے اپنی ذات کی طرف موڑے، وہ کذّابِ اکبر ہے اور جو شخص عالمِ اسلام کے رہنماؤں سے بیزار ہو کر اسلام کے غلبے کے لیے کسی قائد کی خواہش رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرے، جہاد سے وابستہ رہے، اپنی نسلوں میں اس مبارک فریضے کو زندہ کرے، ان شاء اللہ ان فضائل سے کسی نہ کسی حد تک حصہ پالے گا جو حضرت مہدی کے ساتھ مل کر دجالِ اکبر سے لڑنے والے مجاہدین کو حاصل ہوں گے۔ مہدی منتظر کے ظہور کی بحث، قوتِ عمل اور جدوجہد کو معطل چھوڑ کر آسمان کی سمت نظریں لگانے اور کسی خودرو انقلاب کے انتظار میں دنیا پرستی میں لگے رہنے کا بہانہ نہیں، یہ تو جدوجہد پر استقامت اور آخرت کی تیاری کی ترغیب ہے۔

اب ہم اس بات کی طرف لوٹ چلتے ہیں جس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ اللہ رب العزت کی عادتِ مبارکہ ہے کہ نیکی یا بدی کے اَجر یا سزا کو اس کے مشابہ بناتے ہیں تاکہ ان کا انعام بندے کی قربانی اور ایثار کے مطابق ہو جائے۔ نواسۂ رسول حضرت حسن رضی اللہ عنہ وارضاہ نے امت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے بے مثال تواضع و ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ان کا یہ عمل اُمّت کی وحدت کے لیے انجام دیا گیا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کے نتیجے میں بہت سی قیمتی جانیں، اَموال، اوقات اور وسائل بچ گئے اور اسلام اور مسلمانوں کے فائدے میں استعمال ہوئے۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا یہ صلہ دیا کہ ان کی اولاد میں ایسے شخص کو پیدا کریں گے جس کی قیادت میں اُمّت ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائے گی، اس کے ذریعے پورے کرۂ ارض پر نظامِ خلافت قائم ہوگا اور اُمّت میں ایسا اتحاد و اتفاق دیکھنے میں آئے گا جو بے مثال اور عدیم النظیر ہوگا۔

دوسری مثال حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کی ہے۔ ان کے خلاف یہود نے جو حاملینِ کتاب اللہ تھے، بغاوت پر کمر باندھ لی۔ ان کی والدہ پر عظیم بُہتان باندھا اور ان پر جھوٹے الزامات لگا کر اور جھوٹی گواہیاں دلوا کر انہیں قتل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دور میں یہودیوں کے تین طبقات ہو گئے تھے۔ (ہم میں سے ہر ایک اپنے گریبان میں جھانکے کہیں وہ اس طرح کے کسی ایک طبقے میں سے تو نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے تم لوگ پچھلوں کی ہو بہو پیروی کرو گے) ایک طبقہ دین میں تحریف کر رہا تھا (جیسے آج کل کے مغرب زدہ اسکالروں کی اسلامائزیشن کی تحریک) انہیں فریسی کہتے تھے۔ دوسرا خود کو دین سے آزاد کر چکا تھا (جیسے آج کل کا خوش حال طبقہ، ہائی سوسائٹی کے افراد) یہ سن ہیدرن کہلاتے تھے۔ تیسرا طبقہ اسین (ESSENES) نامی تھا جو انتہائی متشدد اور شدت پرست تھا، یہ جاہل اور متشدد رہبان پر مشتمل تھا جیسے آج کل کے علمائے سوء ہوتے ہیں۔ ان تینوں طبقوں نے سیدنا حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ علیہ السلام کی دعوت کو دبانے اور ان کے مشن کو ناکام بنانے کے لیے ایسا فساد برپا کیا کہ ان کی جان لینے کے درپے ہو گئے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو محفوظ و مامون بچا کر زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا اور آخرت کے قریب جب ان کے یہی دُشمن اپنے عالمی لیڈر دجّالِ اکبر کی قیادت میں فلسطین میں جمع ہوں گے تو انہیں آسمان سے واپس اتار دیا جائے گا تاکہ دجّال ان کے ہاتھ سے اور اس کے چیلے چانٹے اسلامی لشکر میں شامل مجاہدین کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد چونکہ جہاد کے مکلف نہ تھے، ان میں سے ایک نے غدّاری بھی کی اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں (صحابہ کرام) کے نام لیواؤں (مجاہدین) کو یہ اعزاز حاصل ہو گا کہ وہ جناب مسیح بن مریم علیہ السلام کے ساتھ مل کر ان کے دشمنوں سے انتقام لیں اور جس طرح ان کے بڑوں نے اپنی جان پر کھیل کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور ان کے دشمنوں کو تہہ تیغ کیا، اس طرح ان کے آخری لوگ حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کے گرد جمع ہو کر جاں نثاری کا مظاہرہ کریں گے اور مغفرت و جنت کی ایسی بشارت پائیں گے جیسی ان کے بڑوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) کو ملی تھی۔

بہت سے انبیائے کرام دینِ حق کی دعوت کی پاداش میں قتل ہوئے مگر دشمنوں کے حملے سے بچ کر صحیح سالم آسمانوں پر جانا اور پھر واپس آ کر انہیں تہہ تیغ کرنا صرف اللہ کے پیارے بندے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انوکھی خصوصیت ہے۔ یہود عالمی اقتدار کو اپنی وراثت گردانتے ہوئے مسیحا (دجّال اکبر ان کا مسیحا ہے) کے ظہور کے لیے کتنی بھی سرگرمی دکھائیں لیکن درحقیقت وہ اپنے حتمی انجامِ کار کے لیے اسرائیل میں جمع ہوئے ہیں اور ان کا انجامِ کار وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ انبیاء میں بیان کیا ہے: ”اور جس بستی کو ہم برباد کر دیں تو ممکن نہیں کہ وہ دنیا میں پھر پلٹ سکے۔“ (الانبیاء: ۹۵) اسرائیل اور اُمّت مسلمہ کے مابین کشمکش دراصل عہدِ حاضر کی اُمّت مسلمہ اور سابقہ اُمّتِ مسلمہ جو اپنے منصب سے معزول ہو چکی ہے، کے درمیان وہ معرکہ ہے جس میں استقامت دکھانے والے ہی سرخ رُو ہوں گے۔

صدرِ پاکستان نے پچھلے ہفتے لاہور کے گورنر ہاؤس میں ایڈیٹروں اور کالم نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا ایشو امریکی خوشنودی کے لیے نہیں اٹھایا گیا بلکہ اس کا مقصد اسرائیل اور بھارت کے درمیان بڑھتے ہوئے فوجی تعلقات کو حد میں رکھنے کے لیے قومی ذہن کو تحریک دینا تھا۔ یہ ”تحریک“ انتہائی عجیب وغریب ہے۔ جب یہود نے ”میثاقِ مدینہ“ کے عنوان سے عہد و پیمان کر لینے کے باوجود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست سے غداری کی، ان کے دشمنوں کو اکٹھا کر کے ان پر چڑھا لایا، تو وہ آج ہماری طرف سے اسے یکطرفہ تسلیم کر لینے سے کس طرح ہمیں بخشنے اور ہمارے دشمنوں سے تعلقات کم کرنے پر راضی ہو جائیں گے؟؟؟ ہم نے خود کو امریکا کا بااعتماد حلیف ثابت کرنے کے لیے کیا نہیں کیا؟ کیا اس نے بھارت سے فوجی تعلقات کم کر دیے ہیں؟ اگر ہم بیرونی خطرات کے تحت اپنے اس تاریخی دشمن کی ریاست کو سندِ تسلیم عطا کر دیں تو کیا وہ ان قادیانی، بہائی اور آغا خانی ایجنٹوں کو واپس بُلا لے گا جو اس نے اپنے ہاں پال کر ہمارے یہاں چھوڑ رکھے ہیں؟ خدارا! اے اہلِ فکر و نظر! اے اہلِ حل وعقد! اس بات کو سمجھیے کہ یہود کا علاج بالمثل نہیں، بالضد ہوتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ یہودی باقی تمام انسانیت کو گویم اور جنٹائل کا نام دیتے ہیں یعنی انسان نما جانور۔ وہ پوری دنیا پر براہِ راست اقتدار چاہتے ہیں۔ ان کے اس عالمی حکمرانی کے منصوبے کے خدوخال دیکھنا چاہیں تو اسرائیل کی سرکاری ویب سائٹ TEMPLE MOUNT FAITHFUL.ORG ملاحظہ کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان سے خود کو تسلیم کروانا، ان کے مرحلہ وار منصوبے کا حصہ ہے۔ مختصراً ان کے Steps یہ ہیں: ریاستِ اسرائیل کا قیام اور عرب حریفوں پر کنٹرول، ارضِ موعود پر تمام دنیا سے یہود کو اکٹھا کر کے آباد کرنا، مسجدِ اقصیٰ کی بازیابی اور (نعوذ باللہ) انہدام، ہیکل سلیمانی کی تیسری مرتبہ تعمیر [پہلی دو مرتبہ اسے یہود کے دشمنوں نے ڈھا دیا تھا] آخری مرحلہ اسرائیل کے مسیحا اور عالمی بادشاہ مسیح ابن داؤد کی آمد اور اس کی عالمی سلطنت کا قیام۔ اسرائیلی قوم درحقیقت خدا کی واحد موعود قوم ہونے کی دعویدار ہے جبکہ پاکستانی قوم کو اللہ ربّ العزت نے قیامِ پاکستان سے لے کر خونریز جنگوں اور ایٹمی دھماکوں تک خصوصی تائید سے نوازا ہے۔ اور یہ اس وقت روئے زمین پر اسرائیل کا واحد مدِ مقابل ہے گویا کہ یہ قدرت کا انتخاب ہے۔ اسے قدرت نے روزِ اول سے دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جینے کا موقع دے کر جذبۂ جہاد کی حرارت عطا فرمائی ہے جو مسلمان کی آبرو اور تکریم کی ضامن ہے۔ ہمیں اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرنی چاہیے اور اپنی کم نگاہی اور کوتاہ بینی سے اس کی ناشکری نہ کرنی چاہیے کہ قانونِ ربانی ہے کہ نیکی کا اجر اور بدی کی سزا اس سے ملتی جلتی ملتی ہے۔

اے میرے معزز ہم وطنو! آؤ اس یومِ آزادی پر عہد کریں کہ اس وطن کی تعمیر کریں گے اور اپنی اور سارے دنیا کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے۔ ان پر غلامی مسلط کرنے والوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے کی بجائے انہیں اس انجام تک پہنچائیں گے جس تک انہیں پہنچانے کے لیے خدا نے ہمیں منتخب کیا ہے۔

تلاش کا سفر

شہرت کی خواہش انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے، یہ درحقیقت انسان کے لیے آزمائش ہے کہ وہ دوسری فطری خواہشات کی طرح اس پر قابو پاتا اور اسے مناسب حد میں رکھتا ہے یا نہیں؟ حضرات صوفیاء کرام جو انسان کے باطن کو لگنے والے امراض کی پہچان اور علاج کے ماہر ہوتے ہیں ان کی اصطلاح میں اس کو ”حُبِّ جاہ“ کہتے ہیں۔ کتبِ تصوف میں دیگر روحانی امراض کی طرح اس مرض کی علامت، اسباب، نقصانات اور علاج تفصیل سے تحریر ہے۔ تصوف دراصل نام اس علم کا ہے کہ جو گناہ انسان کا باطن یعنی دل، نفس اور ضمیر کرتا ہے ان کی صحیح صحیح تشخیص اور علاج کیا جائے اور جو جو نیکیاں اور اچھے اوصاف انسان کے اندر کی دنیا میں پائے جانے چاہییں ان کو حاصل کیا جائے۔ اہلِ تصوف کے یہاں مروّج تمام اذکار، افکار اور اشغال کا مقصد یہی ہے۔ جو محترم حضرات تصوف کے مخالف ہیں انہوں نے تصوف کو اہل تصوف سے سمجھا ہی نہیں یا پھر یار لوگوں کی گھڑی ہوئی جاہلی حرکتوں پر تصوف کا لیبل دیکھ کر گھبرا گئے ہیں۔ الغرض اس فن کے ماہرین کا اتفاق ہے کہ حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال دو ایسی جراثیم افزا بیماریاں ہیں جو کئی دوسری روحانی بیماریوں کو جنم دیتی ہیں۔

حُبِّ جاہ کا مرض یوں تو کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس مرض کی سب سے خطرناک صورت یہ ہے کہ انسان غیروں (یعنی غیر مسلموں) کی نظر میں مقبولیت یا پسندیدگی کا خواہش مند بن جائے یا ان سے حسنِ کارکردگی کی سند یا صلہ پانے کی امید اس کے دل میں جگہ بنا لے۔ اس وقت مسلم دنیا کے حکمران یا بااثر طبقے کی اکثریت اس مرض کے خطرناک مرحلے کا شکار ہے۔ اسی طرح جدید تعلیم یافتہ طبقے میں سے وہ لوگ جو مشرقی روایات سے دستبرداری کی

حد تک مغرب کے پیروکار بن چلے ہیں وہ بھی احساسِ کمتری، مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی کے سبب شعوری یا لاشعوری طور پر اس مرض کا شکار ہیں۔ ان کی ہر حرکت، ہر ادا، ہر فیشن اسی ذہنیت کا غماز ہوتا ہے۔ مسلم حکمرانوں کے ایامِ اقتدار کا ہر لمحہ اس کوشش میں گزرتا ہے کہ انہیں بہرصورت ان نادیدہ طاقتوں کی خوشنودی حاصل رہے جو ان کے خیال میں ''بادشاہ گر و بادشاہ ساز'' ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ طاقتیں جب ان سے پوری طرح خوش ہوں تب بھی ان کی نظر میں اس شخص سے کم ظرف کوئی نہیں ہوتا جو ان کے اشاروں پر اس لیے چلتا ہے کہ اسے فانی دنیا کے فانی مزے چند دنوں تک وافر مقدار میں ملتے رہیں۔ مراعات یافتہ اور مغرب سے مرعوب طبقے کی زندگی کا پہیہ بھی اس محور کے گرد گھومتا ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق نظر آئیں اور کسی لمحے بھی آؤٹ آف ڈیٹ دکھائی نہ دیں حالانکہ مغرب کے منصوبہ سازوں کی نظر میں ان کی حیثیت چابی کے بھالو یا ٹین کے بندر سے زیادہ نہیں ہوتی اور وہ ان کی ''پروقار شخصیت'' کو مضحکہ خیزی کا بدنما نمونہ سمجھتے ہیں اور مسلمانوں ہی پر کیا موقوف، مغربی ممالک جن کی روایات و ثقافت اور سیاست و معیشت یہود کے ابلیسی پنجے میں ہے خود ان کی قوم کا آدمی اس وقت تک ان کی نظر میں پسندیدہ نہیں جب تک وہ ان کی مرضی کا ساز بجانے والا طنبورہ نہ بن جائے، گویا کہ ان کی خودغرض نظر میں اہمیت صرف اور صرف ان کے مفاد اور منشا کی ہے چاہے اسے کوئی ان کا اپنا پورا کرے یا غیر۔ یہ ایک غیر مبہم حقیقت ہے لیکن چونکہ ہم میں وہ قوتِ ایمانی نہیں جو خاکی کو نوری سے بلند کرتی ہے نہ وہ قوتِ عشق ہے جو پست کو بالا کرتی ہے، لہٰذا ہم اس بات کو سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پاتے۔ آج کے رعب زدہ مسلمان کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کی از حد ضرورت ہے کہ مسلمان کی عزت غیروں سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی بجائے اس انفرادیت میں ہے جو خود اعتمادی سے پیدا ہوتی ہے اور اس خود اعتمادی کو حاصل کرنے کا آسان نسخہ سنتِ نبوی کی پیروی ہے، مغرب کی اتاری ہوئی پینٹیں اور گھسے ہوئے جوتے پہننے سے یہ گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا۔

آپ فوک برناڈاٹ کی کہانی کو لے لیجیے۔ یہ یورپی شخص زمانہ طالب علمی میں اسکاؤٹس کا

گروپ لیڈر تھا۔ اپنے شوق اور لگن کے سبب ترقی کرتے کرتے سویڈن کی ''صلیب احمر'' (ریڈکراس) کا سربراہ بن گیا۔ جنگِ عظیم دوم میں اس نے یہودیت کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ جب جرمنی میں یہودیوں پر نازی ازم کا کوڑا برس رہا تھا تو اس شخص نے عقوبتی کیمپوں سے یہودیوں کو بچا بچا کر نکالنے میں اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی۔ وہ چونکہ یہودیوں کو مظلوم سمجھتا تھا اس لیے اپنی جان پر کھیل کر سینکڑوں یہودیوں کو موت کے منہ سے نکال کر محفوظ مقامات تک پہنچاتا رہا۔ اس طرح اسے یہودیوں نے اپنا محسن قرار دیا اور یہ غیر یہودی شخص یہودیوں کے ہاں بہت معتبر بن گیا مگر اسے خبر نہ تھی کہ اس کے سامنے معصومیت، معقولیت پسندی اور شرافت کا روپ دھارنے والے یہودی ایک دن پاگل عفریت بن کر اس سے چمٹ جائیں گے اور اس کی جان لے کر چھوڑیں گے۔ ۲۰ مئی ۱۹۹۷ء کو اسے اقوامِ متحدہ کی طرف سے اسرائیل اور عربوں کے درمیان ثالث بنا کر بھیجا گیا، یہودیوں نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور ان کی طرف سے اس تقرری پر نہایت خوشی کا اظہار کیا گیا۔ برناڈاٹ نے اپنی صلح جو اور امن پسند طبیعت کے پیشِ نظر آتے ہی صہیونی جنونیوں اور نہتے فلسطینیوں کے درمیان لڑائی روکنے کے لیے اپنے پورے اختیارات استعمال کیے اور شر پسندی کو محدود سے محدود تر کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ اس نے فلسطین کے حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا اور ۱۵ ستمبر کو ''برناڈاٹ پلان'' پیش کیا۔ یہ پلان بھی اس کی منصف مزاجی اور صلح پسندی کا آئینہ دار تھا لیکن ''ویقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس'' (اور جو انصاف کا فیصلہ دینے والوں کو قتل کرتے ہیں) کے مصداق اس کے قتل کا پروانہ ثابت ہوا۔ اس نے تجویز دی کہ:

> ''اگر صیہونیوں کو انسانیت کے نام پر فلسطین کا کوئی حصہ دیا جائے تو ناگزیر ہے کہ ساتھ ساتھ فلسطینیوں کو بھی دو پیشکشیں کی جائیں۔ اولاً: یہ کہ وہ مستقبل میں جب جی چاہے فلسطین میں اپنے گھروں کو لوٹ سکتے ہیں۔ دوم: یہ کہ اگر وہ فلسطین میں دوبارہ واپس آنا چاہیں تو ان کی جائیدادوں پر قبضے کے عوض اسرائیل انہیں معقول معاوضہ ادا کرے گا۔''

خلاصہ اس پلان کا یہ تھا کہ کوئی فلسطینی مسلمان کسی بھی وقت یہ حق رکھتا ہے کہ یا تو فلسطین

میں واقع اپنے گھر میں لوٹ آئے یا اسے کوئی معقول معاوضہ دیا جائے۔ اب قطع نظر اس بات سے کہ اس تجویز میں بھی مسلمانوں سے زیادتی تھی یا نہیں؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس شخص کے ماضی کے ریکارڈ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سوچنا بھی احمقانہ بات تھی کہ وہ کوئی ''یہود مخالف'' منصوبہ بنا رہا تھا...... لیکن یہود کی محسن کشی کی عادت کی انتہا دیکھیے کہ وہ شخص جس نے تن تنہا اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تقریباً ۲۰ ہزار یہودیوں کو ہٹلر جیسے یہود کش سے نجات دلائی تھی اسے دوسرے ہی دن قتل کر دیا گیا اور اس کے قتل کا فیصلہ یہودیت کے اعلیٰ ترین دماغوں کے متفقہ فیصلے کے تحت ہوا اور اسے عام جاہل اور متشدد یہودیوں نے نہیں بلکہ اسحاق شمیر جیسے چوٹی کے رہنما کے حکم پر قتل کیا گیا اور یوں بوائے اسکاؤٹس کے سربراہ سے صلیب احمر (ریڈ کراس) کے اعلیٰ عہدے تک انسانی خدمت کی نیت سے پہنچنے والا شخص ان یہودیوں کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھا جن کو وہ مظلوم اور ہمدردی کے قابل سمجھتا چلا آیا تھا۔

تو میرے دوستو! یہ ہے کفر کی تاریخ اور یہ ہے اس کی ذہنیت، یہ ہم لوگوں کی بھول ہے کہ ہم ان کی نظر میں قابل اعتراض امور سے بچنا شروع کر دیں تو عزت و تکریم کے مستحق ہو جائیں گے۔ ان کی نظر میں سرخروئی حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادیت پر پوری خود اعتمادی کے ساتھ قائم رہیں۔ وہ لوگ بظاہر ایسے شخص کا جتنا بھی مذاق اڑائیں مگر اندر سے وہ اس سے مرعوب اور متاثر بلکہ خائف ہوتے ہیں۔ عزت، اللہ اور اس کے رسول کے لیے مقدر ہے جو مسلمان عزت کے ان دو سرچشموں سے ہٹ کر معزز بننا چاہے گا اس کا حشر ان کم ظرفوں جیسا ہوگا جو سقوطِ غرناطہ کے بعد جان و مال بچانے کے لیے مرتد ہو کر عیسائی بن گئے تھے۔ کوئی مسلمان اس سے زیادہ کسی غیر مسلم کی کیا اطاعت کر سکتا ہے کہ نعوذ باللہ اپنا مذہب ہی سرے سے چھوڑ دے مگر مقامِ عبرت ہے کہ ان کو تب بھی امان نہ ملی۔ عیسائی حکمران فرڈینینڈ اور اس کی متعصب ملکہ ازابیلا نے ان کے لیے انکویزیشن (INQUISTION) کا قانون بنایا۔ ان ''نومسیحیوں'' کی Door to Door رجسٹریشن کروائی گئی۔ اس قانون کی رو سے نئے عیسائیوں کو اذیت دینے کا یہ حربہ اختیار کیا گیا کہ انہیں مذہبی عدالتوں میں پیش کر کے ان پر

منافقت کا الزام لگایا جاتا اور سرِ عام اذیتیں دے دے کر آخر میں زندہ جلا دیا جاتا۔

اس موقع پر عیسائیوں نے ایسے مظالم ڈھائے کہ آج ان کی ایک جھلک پاکستان میں عیسائیت پھیلانے کے لیے سرگرم عیسائی مشنریوں کو دکھا دی جائے تو انہیں منہ چھپانے کی جگہ نہ ملے۔ ایسے بدنصیب مسلمانوں کا گھر بار اور مال و جائیداد چونکہ گرجاؤں کو مل جاتا تھا اس لیے پادری نامی مخلوق جو دنیا پرستی میں بدنامی کی حد تک شہرت رکھتی ہے، بے دریغ ان مسلمان مسیحیوں کو زندہ نذرِ آتش کرنے کی سزا دیتے جو اپنا مذہب چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہسپانیہ کے مذہبی ادارے دنیا کے امیر ترین مذہبی ادارے ہیں کیونکہ ہسپانیہ کے ہر بڑے شہر میں ان کو ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کے مکانات مفت مل گئے۔ آج اسپین اور پرتگال کی وسیع و عریض حدود میں ایک مسلمان کی قبر کا نشان نہیں ملتا البتہ قرطبہ اور غرناطہ میں مسلمانوں کے ۵۰۰ سالہ قدیم ہزاروں مکانات اور سینکڑوں مساجد ایسی ہیں جو آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں اور عیسائیوں کے زیرِ استعمال ہیں۔ مساجد کو گرجا گھر بنایا گیا اور مکانات کو لالچی پادریوں نے باہم تقسیم کر لیا۔ آج مراکش کے شمالی ساحل پر رہنے والے مسلمانوں کے پاس ان کے آبائی گھروں کی چابیاں موجود ہیں جو وہ اسپین میں چھوڑ کر آئے تھے اور وہ انہیں عیسائیوں کے تسلط سے آزاد کروانے کے لیے کسی نجات دہندہ کے منتظر ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ نجات دہندہ تو نجات کے طلب گاروں میں پیدا ہوگا ہم میں اس کی طلب کہاں؟ ہم تو ''جیو اور جینے دو'' کے فلسفے پر عمل پیرا ہیں۔

ایسے مکانات پر انکویزیشن کی ثبت کردہ مہریں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور ان حضرات کو تو ضرور دیکھنی چاہییں جو مسلمانوں کو تنگ نظر اور عیسائیت و یہودیت کو فراخ دل اور وسیع النظر سمجھتے ہیں۔ یہ مہریں دو قسم کی ہوتی تھیں: ایک کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس گھر کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ دوسری کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کا ''فیصلہ'' ہو چکا ہے۔ اب اسے کوئی نہ خریدے نہ اس میں رہنے کی جرأت کرے۔ ان مکانات پر موجود اعلیٰ عیسائی عدالتوں کی لگائی ہوئی یہ مہریں اپنے اندر کئی سبق رکھتی ہیں لیکن مقامِ عبرت ہے کہ ان کی خونی تاریخ سے سبق حاصل کرنے والے مسلمان کم ہیں اور بہکے رہنے کے شوقین کلمہ گو نسبتاً زیادہ ہیں۔ دو ماہ قبل ۱۰ جولائی

۲۰۰۳ء کو جب غرناطہ میں الحمراء محل سے متصل البائسن (اصل عربی نام البیاضین) پہاڑی کی چوٹی پر ۵۰۰ سال بعد قائم ہونے والی پہلی مسجد کے افتتاح کے موقع پر اذان دی گئی تو اس کی وجد آفرین صدا نے مسلمانوں کو پیغام دیا ہے کہ اللہ کی نظر میں مقبولیت کی فکر کی بجائے بندہ جب اپنے جیسے گندے بندوں کی نظر میں پسندیدگی کی جستجو کرنے لگتا ہے تو قدرت اسے بھٹکنے کے لیے اس وقت تک چھوڑ دیتی ہے جب تک وہ خود واپسی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اسپین کے مسلمانوں نے اپنی اصل کی طرف واپسی کے سفر کا آغاز کر دیا ہے نجانے بقیہ مسلم دنیا کب تلاش کے اس سفر کے لیے سنجیدگی سے آمادہ ہوگی۔

بچھوؤں کا ایکا

بچھو کے متعلق ماہرینِ حیوانات نے لکھا ہے کہ اس کی پیدائش اس کی فطرت کے مطابق ہوتی ہے یعنی یہ جس طرح ساری عمر اپنے پرائے، دوست دشمن کی تمیز کے بغیر خلقِ خدا کو ڈستا رہتا ہے اسی طرح بوقتِ پیدائش مادہ بچھو کے پیٹ میں موجود بچے عام جانوروں کی طرح جنم لینے کی بجائے اس کا پیٹ چیر کر دنیا میں آتے ہیں۔ چنانچہ پھر وہ ساری عمر اس حرکت کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں جو دنیا میں آتے ہی محسن کُشی کی بدترین شکل میں ان سے سرزد ہوئی تھی۔ انسانوں کی عادات پر اس حوالے سے غور کیا جائے تو نسلِ انسانی کے دو گروہ، یہود و ہنود، سیاہ اور سرخ بچھوؤں کی جوڑی دکھائی دیتے ہیں۔ امریکا نے یہودیوں کی اس قدر حمایت کی اور اس کی خاطر ایسے ایسے انسانیت کش اقدامات کیے کہ آج وہ کرۂ ارض پر سب سے زیادہ نفرت کیے جانے والا ملک ہے لیکن اس کے عوض یہودیت اس کے ساتھ کیا کرتی رہی؟ یہ بڑی دلچسپ داستان ہے جس کا تذکرہ ہم ”آپریشن سوزنا“ اور ”لبرٹی“ پر حملے کے حوالے سے کریں گے۔

پچھلی صدی کی چھٹی دہائی میں جب اسرائیل تازہ تازہ صفحۂ ہستی پر نمودار ہوا تھا، مصر میں جہاد اور رجوع الی الدین کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ اسرائیل اس سے حد درجہ خائف تھا اور اس کی خواہش تھی کہ مصر سے خود ٹکرانے کی بجائے امریکا کو اس سے بھڑا دیا جائے۔ اس کے لیے اس نے وقفے وقفے سے دو انتہائی عیارانہ اور انسانیت و اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں بری طرح ناکام ہو گئیں اور اسرائیل بہت ہی شرمناک انداز میں بے نقاب ہوا۔

ان میں سے پہلا منصوبہ ”آپریشن سوزنا“ کا تھا جو ۱۹۵۴ء میں ترتیب دیا گیا۔ یہ اسرائیلی حکومت کی طرف سے امریکا کے خلاف خفیہ دہشت گردی کا منصوبہ تھا جس کے مطابق مصر میں

قیام پذیر امریکیوں کو قتل اور امریکی تنصیبات کو دھماکے سے اڑایا جانا تھا اور پھر مستند ''قرائن و شواہد'' سے یہ ثابت کیا جاتا کہ یہ کارروائی مصریوں نے کی ہے۔ اس طرح امریکا کا مصر سے براہِ راست تصادم شروع ہوجاتا اور اسرائیل نہرِ سوئز کے کنارے کھڑے ہوکر تفریحی تماشا دیکھتا جیسے کہ اس نے سقوطِ کابل اور قندہار کے وقت کیا۔ یہودی ایجنٹ حکم ملتے ہی سرگرم ہوگئے۔ انہوں نے قاہرہ اور اسکندریہ میں کچھ عمارتیں اور امریکی لائبریری دھماکے سے اڑانے کی کامیاب کارروائی کی (قارئین اس موقع پر وطنِ عزیز اور دنیا بھر میں مغربی باشندوں اور املاک کے خلاف ہونے والی دہشت گردانہ کارروائیوں کو ذہن میں رکھیں) لیکن جب وہ ایک امریکی سینما گھر میٹرو گولڈ وائن میئر تھیٹر کو دھماکے سے اڑا رہے تھے تو اسرائیلی ایجنٹ کے ہاتھ میں وہ بم پھٹ گیا جس کے بارود سے تلف ہونے والی جانوں کو وہ مصر کے بے خبر مسلمانوں کے کھاتے میں ڈالنا چاہتا تھا۔ اسرائیلی ایجنٹ کے رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے سے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ دنیا کو علم ہوگیا کہ اسرائیلی اس قدر پست اخلاق اور کمینگی کے مارے ہوئے دہشت گرد ہیں کہ اپنے محسن کو اپنے دشمن سے بھڑانے کے لیے اس کی جان لینے سے بھی نہیں چُوکتے۔ یہ بلاشبہ بدترین قسم کی جنونیت تھی اور اس سے اس قدر گردوغبار اٹھا کہ اسرائیلی وزیر دفاع پنہاس لیون کو مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا۔ (یاد رہے کہ یہ اتنا اہم شخص تھا کہ اس کی جگہ لینے کے لیے ڈیوڈ بن گوریان جیسے صہیونی لیڈر کو سیاست میں داخل ہونا پڑا) بعد میں یہ کہانی ''لیون کے معاملات'' کے نام سے شائع ہوئی اور اس کا ذکر معروف انسائیکلو پیڈیا انکارٹا میں بھی پایا جاتا ہے...... لیکن یہ یہودیت کے اثر سے خالی نہیں۔ اس کے الفاظ اس موقع پر یہ ہیں:

''بن گوریان وزیر دفاع پنہاس لیون کی جگہ لینے کے لیے ۱۹۵۵ء میں سیاست میں داخل ہوا۔ پنہاس لیون نے مصر کے مغرب کے ساتھ تعلقات کو سبوتاژ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد استعفیٰ دے دیا تھا۔'' (انکارٹا انسائیکلوپیڈیا ۲۰۰۱ء، مضمون: بن گوریان)

آپ دیکھیں کہ یہودی مصنف ذرائع ابلاغ میں کس طرح بین الاقوامی غلط بیانیاں کرتے اور مطلب کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں، یہ مضمون اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ اینکارٹا کا

دوسرا جملہ کچھ اس طرح ہونا چاہیے:

”پنہاس لیون جسے زبردستی استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا کیونکہ اس کو امریکا کے خلاف دہشت گردانہ کارروائیوں کی کھلم کھلا سرپرستی کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ امریکا کو اسرائیل کے دشمن پر حملے کرنے کے لیے اکسایا جائے۔“

اس ناکام سازش میں اسرائیلی وزیرِ دفاع کو امریکا کے خلاف دہشت گردانہ کارروائیوں کی سرپرستی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود امریکی حکومت نے جوابی ردعمل کے طور پر تل ابیب کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی حتیٰ کہ اس سے سفارتی تعلقات بھی نہ توڑے بلکہ اس کی اربوں ڈالر کی مالی وفوجی امداد میں کمی تک کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔

سیاہ بچھو کے اپنی فطرت بد سے باز نہ آنے کی دوسری مثال ”لبرٹی“ پر دہشت گردانہ حملہ ہے۔ یو ایس لبرٹی امریکا کا عظیم الجثہ بحری جہاز تھا جو ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل کے تحفظ کے لیے بحرِ احمر میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ۸ جون ۱۹۶۷ء کو چند اسرائیلی لڑاکا طیارے جن پر سے شناختی نشان مٹا کر ان کا رنگ تبدیل کر دیا گیا تھا، یو ایس لبرٹی پر حملہ آور ہو گئے، ان کا ساتھ دینے کے لیے چند غیر نشان شدہ تار پیڈو کشتیاں بھی اپنے اس محافظ پر جھپٹیں اور دم بھر میں ۳۴ ”قیمتی“ امریکی جانیں تلف ہونے کے ساتھ ۱۷۴ امریکی زخمی ہو گئے۔ یہودی ہوابازوں نے سب سے پہلے لبرٹی کے ریڈیو ٹاور پر حملہ کیا تا کہ امریکا کے چھٹے بحری بیڑے کو علم نہ ہو سکے کہ یہ کارستانی ان کا پروردہ کلوٹا بچھو کر رہا ہے۔ نشانات سے خالی لڑاکا طیارے اس وقت تک خوفناک انداز میں اپنی مدد کو آئے ہوئے امریکیوں پر بمباری کرتے رہے جب تک انہیں اطمینان نہ ہو گیا۔ بقیہ کسر تار پیڈو کشتیوں نے پوری کی اور ان امریکی سپاہیوں کو بھی نہ بخشا جو حفاظتی کشتیوں کے ذریعے جان بچا کر فرار ہو رہے تھے۔ اسرائیلی کشتیوں پر نصب مشین گنوں سے نکلنے والی گولیاں ان امریکی فوجیوں کو چاٹتی رہیں تا کہ دنیا کو باخبر کرنے کے لیے کوئی ذی روح زندہ نہ بچے اور ”مصر“ کی یہ دہشت گردی امریکا کو غضبناک کرنے کے لیے کافی ہو جائے۔ اسرائیلی حملہ آور اپنا کام مکمل سمجھ کر واپس چلے گئے لیکن اس موقع پر جہاز کے کپتان اور اس کے معاون عملے

نے ایسی غیر معمولی حاضر دماغی اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا کہ اسرائیل اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ سب مل کر جہاز کو کسی نہ کسی انداز میں اس وقت تک چلاتے اور ڈوبنے سے بچاتے رہے جب تک ان کا رابطہ اپنے بحری بیڑے سے نہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنی ہائی کمان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا کہ یہ حملہ مصر کی نہیں، ان کے اپنے ''بچوت'' اسرائیل کی کارروائی تھی۔ لبرٹی کے کپتان کی جرأت اور فرض شناسی نے اسرائیل کے اس منصوبے کو طشت از بام کر دیا اور اسرائیلیوں کو موقع نہ دیا کہ وہ دو دھوکے بازیاں ایک ساتھ کریں۔ اسرائیلی جیٹ طیارے امریکی عملے کے سروں پر بہت قریب سے گزر کر حملہ آور ہوئے تھے اور ان کے پائلٹوں نے امریکیوں کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے دوستانہ انداز میں ہاتھ بھی ہلائے تھے جس کی وجہ سے جہاز کے کپتان اور عملے کو حملہ آوروں کی شناخت میں کوئی غلطی نہ لگ سکتی تھی۔ جب یہ سازش بے نقاب ہو گئی تو قوم یہود نے اپنی روایتی کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ گھڑا گھڑایا عذر پیش کر کے معذرت کر لی کہ یہ حملہ شناخت کی غلطی کے باعث ہوا تھا۔ اس وقت کے امریکی وزیر مملکت ڈین رسک اور چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف ایڈمرل تھامس مورر نے واضح بیان دیا کہ یہ حملہ ہرگز اتفاقی نہ تھا بلکہ یہ عمداً کی گئی کارروائی تھی۔ اس لیے کہ حملے کے وقت دن بہت روشن تھا، لبرٹی پر امریکی پرچم لہرا رہا تھا اور جہاز پر بین الاقوامی شناخت کے مقرر شدہ نشانات اور اعداد واضح طور پر لکھے ہوئے تھے۔ مگر امریکا کے یہودی میڈیا نے مذکورہ حملے کے خلاف کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ اسرائیل کی ''قریب از حقیقت'' معذرت کو آسانی سے قبول کر لیا گیا اور امریکا کے اعلیٰ سرکاری و فوجی عہدیداروں کے واضح الزامات کے باوجود یہودی لابی نے اس معاملے کی رسمی تحقیقات بھی نہ ہونے دی۔ اس کے مقابلے میں اب تک ایسا کوئی ثبوت بالکل نہیں پایا جاتا کہ افغانستان کی حکومت ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بارے میں کچھ جانتی تھی یا اس نے اس حملے کی منظوری دی تھی لیکن ان جڑواں ٹاوروں پر حملے کے آدھے گھنٹے کے اندر ایک سابقہ یہودی وزیر خارجہ نے افغانستان کو نامزد ملزم ٹھہرا کر اس پر حملوں کے لیے

فضا کو آتش بار بنا دیا تھا۔ کہاں آدھا گھنٹہ اور کہاں ۳۵ سال کا طویل عرصہ؟ لبرٹی پر حملے کو آج ۳۵ سال ہونے کو آئے ہیں لیکن اس کی تحقیقات کا آغاز بھی نہیں ہو سکا۔

امریکی نظامِ حکومت پر یہودیت کے غلبے کا یہ عالم ہے کہ یو ایس لبرٹی کے کمانڈنگ آفیسر کیپٹن ولیم میک کو اسرائیلی حملے کے دوران جرأت و ہمت کا شاندار مظاہرہ کرنے پر امریکا کا سب سے بڑا اعزازی ایوارڈ ''کانگریس میڈل آف آنر'' دیا گیا لیکن اس کی تقریب امریکی نیول یارڈ میں نہایت خاموشی سے منعقد کی گئی حالانکہ قواعد اور روایات کے مطابق یہ کارروائی وہائٹ ہاؤس میں انجام دی جانی چاہیے تھی۔ یہ صرف اس لیے کہ ۳۴ امریکی فوجیوں کو ہلاک اور ۱۷۴ سے زائد کو زخمی کرنے والے ''معصوم دشمن'' کے نازک جذبات کو ٹھیس نہ پہنچ جائے۔

یہ ہے وہ انصاف جسے امریکا دنیا پر مسلط کرنے چلا ہے۔ امریکا میں مقیم عربوں، پاکستانیوں اور دیگر مسلمانوں پر ناطقہ بند کرنے والے امریکی حکام اور باشعور امریکی عوام کو سوچنا چاہیے کہ وہ یہودی امریکی جو اسرائیلی دہشت گردی کے ان سنگین واقعات کے بعد بھی اسرائیل سے تعاون جاری رکھے ہوئے ہیں، کیا وہ امریکا سے غداری کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ کیا اسرائیل کو امداد دلوانے والے یہودی امریکا کے قانون سے باغی نہیں؟ ان خونیں واقعات کے بعد بھی اگر امریکی حکام اور عوام مسلمانوں کو دہشت گرد تارکین وطن اور یہودی شہریوں کو پرامن باشندے سمجھتے ہیں تو انہیں سیاہ بچھو کے زہرناک ڈنک سے کون بچا سکتا ہے؟ اور یہود کی اس فطرت کو جان لینے اور ہمارے تاریخی دشمنوں سے ان کے حالیہ گرم جوش گٹھ جوڑ کے بعد بھی اگر ہم ان سے ''بوجوہ'' تعلقات قائم کرنے پر مُصر ہیں تو خدا کی اس وسیع و عریض خدائی میں ہمارا امدادگار اور حمایتی کون ہو سکتا ہے؟؟؟

ہزار چہروں والا آدمی

یحییٰ عباس فلسطین کے ان بیٹوں میں سے تھا جن پر فلسطین کی مائیں ہمیشہ فخر کرتی رہیں گی، اس کے کارنامے فلسطینی نوجوانوں کے دل میں کفر سے ٹکرانے کا عزم جواں رکھیں گے اور فلسطین کے بچے اس کی نقل اتارتے اتارتے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے رہیں گے۔ یحییٰ عباس نے صہیونیت کے خلاف جہاد کو کئی ایسے رخ دیے جس سے کوئی آشنا نہ تھا۔ اس کی انقلابی سوچ اور عبقری ذہانت نے کئی ایسی چیزیں متعارف کروائیں جس نے فلسطین کی تحریکِ جہاد کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا حالانکہ وہ عام سا نوجوان تھا اور اس کے بچپن، لڑکپن اور آغازِ جوانی کے دنوں کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اپنے اندر اتنی زبردست عبقری صلاحیت چھپائے ہوئے ہے، مگر ایک واقعے نے اس کی زندگی بدل دی اور وہ گلیوں میں کھیلنے والے لڑکے سے اعلیٰ اخلاق و کردار کا مالک مجاہد اور فدائی مجاہدین کا استاذ بن گیا جس پر دوست رشک کرتے اور دشمن خوف کھاتے تھے۔

یہ آج سے تقریباً ۱۵ سال قبل رمضان المبارک کا ایک دن تھا جب یحییٰ عباس کی زندگی بدلنے والا واقعہ پیش آیا۔ مسلمان آدھے روزے رکھ چکے تھے اور مقدس مہینے کا آدھا دورانیہ باقی تھا۔ فلسطین کی مساجد میں نمازیوں کی حاضری عام دنوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ فلسطین کی مشہور تاریخی مسجد ''مسجدِ ابراہیم'' میں تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی چونکہ مسلمانوں نے آج تک یہودیوں کی کسی عبادت گاہ پر حملہ نہ کیا تھا اس لیے وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کوئی بدبخت یہودی، روزہ دار عبادت گزاروں پر حملہ کر سکتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں نے یہودیوں پر موثر حملوں کا آغاز ہی نہ کیا تھا۔ یہ سعادت قدرت نے یحییٰ عباس کی قسمت میں لکھی

تھی کہ وہ خالی ہاتھ فلسطینی نوجوانوں کو دیوہیکل ٹینکوں کے سامنے کھڑا کرے اور انہیں جنگ کے ایسے گُر سکھائے جو اس سے قبل فنونِ حرب کی کسی کتاب میں تھے نہ سینہ بسینہ منتقل ہونے والے رازوں میں ان کا شمار تھا اور نہ کسی ماہر عسکریات کی قوتِ خیالیہ نے ان کا خاکہ تشکیل دیا تھا۔

ہوا یوں کہ نمازیوں سے بھری مسجد میں ایک انتہا پسند اور کٹر متعصب یہودی گھس آیا۔ یہ یہودیوں کے اس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو تین رات پرانی سڑی ہوئی مچھلی سے زیادہ بدبودار اور جنگلی گدھے سے زیادہ موٹی عقل کے ہوتے ہیں۔ ان سے عام یہودی بھی تنگ رہتے ہیں۔ اس یہودی کے دماغ میں اپنی حکومت کی پشت پناہی اور فلسطینی مسلمانوں کی بے بسی کے سبب کچھ زیادہ ہی ہوا چڑھ گئی تھی۔ اس نے مسجد میں گھستے ہی فائر کھول دیا اور پلک جھپکتے میں کئی نمازی اپنے رب سے جا ملے، متعدد شدید زخمی ہوگئے، مسجد کا فرش خون سے بھر گیا، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اچانک یہ کیا آفت ٹوٹ پڑی اور اس شیطان صفت یہودی کو آخر کیا ہوا؟ جب مسجد کا فرش خون سے دھویا جا رہا تھا تو کسی مذبح خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سب کی آنکھیں تاسف سے نم تھیں مگر ایک نوجوان ایسا بھی تھا جس کے چہرے پر رنج و غم کی بجائے سنجیدگی آمیز فکر اور غصہ آمیز کرب کے آثار تھے۔ یہ نوجوان یحییٰ عباس تھا۔ بے بسی کا احساس اسے بری طرح ستا رہا تھا۔ اس نے اسی لمحے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی قوم کو یہودیوں کے رحم وکرم پر نہ چھوڑے گا اور ایسا کچھ کر دکھائے گا کہ آئندہ کوئی یہودی مسلمانوں کی عبادت گاہ میں گھسنے سے پہلے اپنے انجام کو سو مرتبہ سوچے گا۔

وہ تنہا ہی عزم و ہمت کے بل بوتے پر انجانے راستے پر نکل کھڑا ہوا۔ قدرت نے اس کے جذبے کی لاج رکھی اور ایک وقت ایسا آیا کہ اسرائیلی وزیر اعظم سے لے کر اسرائیلی انٹیلی جنس کے چیف تک اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ اس کے کارنامے اتنے خفیہ، حیرت انگیز اور غیر متوقع ہوتے تھے کہ یہودی ادیبوں نے اس کے متعلق داستانیں گھڑ گھڑ کے اسے یہودی ادب کا دیومالائی کردار بنا دیا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ ”ہزار چہروں والا آدمی“ ہے جو بیک وقت کئی جگہ موجود ہوتا ہے۔ کیسے اور کہاں؟ اس کے متعلق کسی کو کچھ پتہ نہ چلنے پاتا تھا۔

اس میں ایک بڑی صفت یہ بھی تھی کہ شاگردوں تک اپنا فن منتقل کرنے کی امتیازی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کے تربیت یافتہ نوجوانوں نے اسرائیل کے طول وعرض میں ایسی کارروائیاں کیں جنہوں نے یہودی ریاست کو جڑوں سے ہلا دیا اور ایک وقت ایسا آیا جب اسرائیلی ہر اس شخص کو گرفتار کر لیتے تھے جس نے یحییٰ کو دیکھا ہو، سنا ہو یا اس کے بارے میں کچھ جانتا یا کسی طرح کی معلومات رکھتا ہو۔ اسرائیلی حکام اس کی گرفتاری میں ناکامی کو اپنے لیے کتنی بڑی شکست سمجھتے تھے اس کا اندازہ اسرائیلی انٹیلی جنس کے سربراہ یعقوب بیرس کے اس بیان سے ہوتا ہے جو اس نے ایک مرتبہ یحییٰ عباس کی گرفتاری میں ناکامی پر جھلا کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ یحییٰ بیرزیت کی الیکٹریکل انجینئرنگ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اُردن جانا چاہتا تھا۔ اس نے جب اس غرض کے لیے ویزے کی درخواست دی تو صہیونی انتظامیہ نے اسے رد کر دیا۔ اس پر انجینئر یحییٰ عباس نے تعلیم کو خیر باد کہہ کر عملی زندگی میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا اور پھر وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ اسرائیلی انٹیلی جنس کے سربراہ کو کہنا پڑا:

”اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ نوجوان ہمارا یہ حشر کرے گا تو ہم اسے ویزے کے ساتھ ساتھ جانے کے لیے ایک ملین ڈالر بھی دیتے“۔

یحییٰ عباس نے جس وقت میدانِ عمل میں قدم رکھا اس وقت جنگ میں صہیونیت کا پلّہ خطرناک حد تک بھاری تھا۔ وسائل، اسلحے اور عالمی استعمار کی پشت پناہی سے قطع نظر سب سے بڑی برتری انہیں یہ حاصل تھی کہ ان کے عوام محفوظ تھے جبکہ فلسطینی عوام کو کسی طرح کی ڈھال میسر نہ تھی۔ اسرائیلی حکومت نے یہودی قابضین کو ایسی بستیوں میں بسا رکھا تھا جن کے بارے میں اسرائیلی انٹیلی جنس کا دعویٰ تھا کہ وہ مکمل طور پر محفوظ ہیں۔ وہاں بسنے والے یہودی بھی اپنے آپ کو ہر طرف سے محفوظ سمجھتے تھے اور ان کی بجائی ہوئی چین کی بانسری سن کر دنیا بھر کے یہودی آ آ کر یہودیوں کی آبادی میں اضافہ کر رہے تھے اور فلسطینی مسلمان سمٹ سمٹ کر مہاجر کیمپوں کی عسرت زدہ اور بے یارومددگار زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے جا رہے تھے۔

اگر کچھ عرصہ اور یہ صورتحال جاری رہتی تو مجاہدین کے حوصلے پست ہو جاتے اور مسلمان

یہودیوں کی برتری کے سامنے لاچار و مجبور ہو جاتے۔ اس موقع پر یحییٰ عباس آگے آیا اور اس نے فدائی حملوں کی نت نئی ترکیبوں کے ذریعے صہیونیت کے خلاف جنگ کو ایسا رخ دیا جس نے آج تحریکِ جہاد کو بے مثال جوش اور ولولہ عطا کر رکھا ہے اور صہیونیت اس وقت کو روتی ہے جب اس کا سامنا یحییٰ عباس جیسے باصلاحیت مجاہد سے ہوا تھا۔ صہیونیت کے بڑے دماغ آج بھی جب جمع ہوتے ہیں تو اس بات کا اقرار کیے بغیر ان کے پاس چارہ نہیں ہوتا کہ یحییٰ نے صہیونیت کے خطرناک منصوبوں کو بے جان کر دیا ہے اور ان کو ایسی زک پہنچائی ہے جس کی تلافی دجّال کی آمد تک ان سے نہ ہو سکے گی۔

یحییٰ کا کمال یہ تھا کہ اس نے جنگ کو صہیونیت کی چوکھٹ تک پہنچا دیا اور یہودیوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر کے دنیا بھر سے یہودیوں کی اسرائیل آمد پر روک لگا دی۔ اس کا جو طریقہ اس نے سوچا وہ عسکری تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس نے دنیا کو گوریلا جنگ کی ایک نئی قسم ''فدائی جنگ'' سے متعارف کروایا اور اس کے ذریعے ایسے حیرت انگیز نتائج حاصل کیے کہ مشہور یہودی ایجنٹ کرنل لارنس کے ''کامیابی کے سات ستون'' فرسودہ اصول بن کر رہ گئے۔ اس کی کامیاب فدائی کارروائیوں نے تحریکِ جہاد کو ایسا حوصلہ اور عزم بخشا کہ حضرت مہدی کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے والے افراد بھی ایک نئے عزم کے ساتھ میدان میں آگئے اور فدائی حملے یحییٰ عباس اور اس کے شاگردوں کا ایسا صدقہ جاریہ بن گئے جو دجّال کی آمد تک یہودیوں کو زوردار کچوکے لگاتے رہیں گے۔

یحییٰ عباس حد درجے کا بہادر، نڈر اور بیباک ہونے کے ساتھ انتہائی محتاط بھی تھا۔ حزم و احتیاط اس کی وہ صفت تھی جو آج کل خفیہ کارروائیوں پر متعین مجاہدین میں بھی معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اپنی جہادی سرگرمیوں کو حد درجہ راز میں رکھتا تھا اور اس بارے میں کسی کوتاہی کو برداشت نہ کرتا تھا۔ راز داری اور ہر قیمت پر راز داری کی وہ اس شدت سے پابندی کرتا تھا کہ یہ اس کی شخصیت کا جزو لاینفک بن چکا تھا۔ اس نے راز داری کو اس کامیابی اور خوبی سے نبھایا کہ اس کے متعلق کوئی یقین سے نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کس وقت، کہاں اور کس حلیے میں موجود ہوگا؟

حتیٰ کہ وہ سنسنی خیز موضوعات پر لکھنے والے یہودی مصنفین کا مرغوب موضوع بن گیا تھا۔ انہوں نے اس کو یہودی ادب کی دیومالائی کہانیوں کا حصہ بنا ڈالا اور اس کے بارے میں سُنے گئے واقعات میں زیبِ داستان کے لیے عجیب وغریب باتوں کا اضافہ کر کے اسے ماورائی مخلوق کا درجہ دیدیا۔ یہودی مصنفین نے یحییٰ کے متعلق سنسنی خیز کہانیاں لکھ کر خوب شہرت اور دولت کمائی۔

یحییٰ روپ بدلنے کا بھی بہت ماہر تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے کئی شناختی کارڈ اور متعدد پاسپورٹ ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی جگہ موجود ہوتا ہے۔ یہ ان قلم کاروں کا مبالغہ تھا ورنہ ایک انسان ایک وقت میں ایک سے زیادہ جگہ کیسے موجود ہو سکتا ہے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس کی شکل کے آدمی بیک وقت متعدد جگہوں پر موجود ہوتے تھے اور دیکھنے والے یا مخبروں اور جاسوسوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اصل یحییٰ کون ہے اور نقلی کون سا؟

اگر اس کے متعلق کوئی جاسوس خبر دیتا کہ وہ دریائے نیل کے کنارے ریسٹورنٹ میں کسی کا انتظار کر رہا ہے تو تھوڑی دیر بعد دوسرے مخبر کی طرف سے خبر آتی کہ وہ تھوڑی دیر پہلے طرابلس کے ایئرپورٹ پر سوڈان جانے والی پرواز کے لیے بورڈنگ کارڈ حاصل کر چکا ہے۔ اس صورت حال نے اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ پھر ایک کمال اس میں یہ تھا کہ بھیس غضب کے بدلتا تھا، جب وہ یہودی آبادیوں میں آوارہ گردی کر رہا ہوتا تو کوئی نہ پہچان سکتا تھا کہ کٹر مذہبی یہودی شخص کے تمام لوازمات سے آراستہ یہ شخص ''حماس'' کا عظیم مجاہد ہے جوان بستیوں میں نقب لگانے کی جگہ تلاش کر رہا ہے اور جب وہ کسی یہودی نو آباد کار سیٹھ کا روپ دھار کر حیفا کے پوش علاقوں میں آمدورفت رکھتا تو کوئی نہ جان سکتا تھا کہ یہ سرمایہ کار یہاں کس غرض سے آوت جاوت لگائے ہوئے ہے۔ اسرائیل کا وزیر اعظم اسحاق رابن، یحییٰ شہید کے اس کمالِ فن سے اس قدر مرعوب تھا کہ ایک دن کہہ اٹھا: ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں انجینئر یہیں پارلیمنٹ ہی میں نہ پہنچا ہوا ہو۔'' اس نے ان اطلاعات کے بعد یہ کہا تھا جن کے مطابق یحییٰ شہید اسرائیلی سفارت کاروں کے روپ میں تل ابیب کے اندر دیکھا گیا تھا اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہر غیر ملکی سفارت کار کو روک کر پوچھیں کہ کہیں آپ

انجینئر یحییٰ کے ہمزاد تو نہیں ہیں؟

اللہ تعالیٰ یحییٰ شہید کو اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اس نے مجاہدین کے لیے جو انوکھی تدبیریں وضع کیں، مجاہدین کو ان میں اضافے اور جدت کی توفیق دے اور شہید کی عبقری جہادی کارروائیوں کو اس کے لیے بہترین صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

فلیش پوائنٹ

’’آپ وہ ہیں جو بولتے نقشے لکھتے ہیں۔‘‘

’’معاف کیجیے! میں نے آپ کو پہچانا نہیں، ویسے بھی نقشے بنائے جاتے ہیں لکھے نہیں جاتے۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے آپ ایسے ہی چکر دیتے ہیں۔ اصل بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا ایک ہی موضوع رہ گیا ہے، ہمیشہ فلسطین پر لکھتے رہتے ہیں؟‘‘

’’ہاں! میرے خیال میں بیت المقدس وہ فلیش پوائنٹ ہے جہاں بھڑکنے والی جنگ کے شعلے تیسری اور عظیم ترین عالمی جنگ (الملحمۃ الکبریٰ، آرمیگاڈون) کی شکل اختیار کرلیں گے۔ القدس اس جنگ کا اگلا محاذ ہوگا جس کے بارود میں یہودی اب آگ ڈالنے والے ہیں۔‘‘

کیا مطلب؟

’’مطلب یہ کہ مشرق وسطیٰ میں ایک زبردست قسم کا ہمہ گیر اور کلی انفجار ہوگا جس کے نتیجے میں عالمگیر جنگ ہوگی اور اسرائیل سارے عرب ملکوں اور پھر سارے مسلمان ملکوں پر قابو پانے کی کوشش کرے گا تاکہ ستارۂ داؤدی والا جھنڈا صہیون کے پہاڑ پر گاڑ کر ہیکل سلیمانی میں بچھائے گئے تختِ داؤدی پر مسیح دجّال اکبر کو بٹھا سکے۔ مسیح دجّال کی عالمی پریس کانفرنس کی تیاریاں بھی مکمل ہیں جسے سیٹلائٹ کے ذریعے دنیا بھر کے ٹیلی ویژنوں پر دکھایا جائے گا بس صرف ایک عالمی واقعہ ہونا باقی ہے اور اسرائیل کی آخری ’’عظیم تاریخی تمثیل‘‘ کے لیے اسٹیج کی مکمل تیاری کے لیے بس ایک واقعہ رونما ہونا باقی ہے اور وہ ہے ایک قدیمی زمین پر دجّال کی عبادت کے لیے ایک عبادت گاہ کی تعمیر۔ یہ عبادت گاہ ایک مخصوص جگہ تعمیر ہوگی یعنی ماؤنٹ

موریا (Mount Moriah) پر، یہ وہ جگہ ہے جہاں یہود کے دعویٰ کے مطابق یہ عبادت گاہ کئی مرتبہ پہلے بھی تعمیر ہو چکی ہے۔ یعنی عین وہ جگہ جہاں مسجدِ اقصیٰ کی چار دیواری ہے جس کے اندر مختلف اسلامی یادگاریں ہیں جن میں سے اہم ترین مسجد کا ہال اور صحن میں واقع ایک خوبصورت گنبد ہے جو فنِ تعمیر کی عمدگی کے لحاظ سے دنیا کے سات عجوبوں میں شامل کیے جانے کے لائق تھا مگر اسے آٹھویں عجوبے کے طور پر بھی تسلیم نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی......... بلکہ مسلمانوں کی اکثریت سے اگر پوچھا جائے کہ مسجدِ اقصیٰ سے کیا مراد ہے؟ تو وہ ان یہودیت زدہ نام نہاد محققین کی باتیں دہرانا شروع کر دیں گے جو یہود کے مقاصد کی تکمیل کے لیے طرح طرح کی الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔‘‘

‘‘لیکن ان الجھنوں کے علاوہ بھی تو بہت سے ایسے مسائل ہیں جو سلجھن چاہتے ہیں؟’’

‘‘بالکل! کیوں نہیں؟ لیکن یہ مسئلہ ایسا ہے جس کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کو ان تمام مقاصدِ عالیہ کی دعوت دی جاسکتی ہے جو دعوت الی الخیر کا حصہ ہیں اور ان مہلک چیزوں سے ڈرا وا سنا کر مستقبل کی فکر کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے جن سے وہ بے خبر ہیں۔ پھر ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں ایسے گل کھلنا شروع ہو گئے ہیں جو مسجدِ اقصیٰ پر یہود کے حق تولیت کے دعویدار ہیں۔ ان کی نرالی منطق یہ ہے کہ ‘‘مسجدِ اقصیٰ پر قانونی حق تو مسلمانوں کا ہے لیکن اخلاقی حق یہود کا ہے۔! یہود اور اخلاقی حق...... سبحان اللہ! نیز یہ کہ القدس کے حصول کے لیے بنی اسرائیل کی جنگ قتال فی سبیل اللہ ہے کیونکہ یہ ان کو عطا کی گئی میراث ہے۔’’ اب ایسی صورت حال میں اس موضوع پر جان نہ کھپائیں تو کیا کریں۔’’

‘‘اچھا یہ بتائیے! فلسطینی مجاہدین جو خودکش حملے کرتے ہیں کیا یہ جائز ہیں؟’’

‘‘آپ کو ان کے شرعی جواز میں شبہہ ہے یا عملی افادیت میں؟’’

‘‘اتنی مشکل باتیں تو میں نہیں جانتا لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ اسلام میں خودکشی جائز نہیں ہے۔’’

‘‘یہ خودکشی نہیں، کفرکشی ہے۔ بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ حملے خود اپنی جان لینے کے لیے نہیں، دشمن کا نقصان کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔’’

''میرے ایک دوست جو عرب ممالک میں رہ کر آئے ہیں، کہتے تھے کہ قتلِ نفس کی حرمت معلوم من الدین بالضرورۃ ہے۔''

''انہوں نے اس کا نام لینے میں غلطی کی اس لیے ان سے قیاس کرنے میں بھی غلطی ہوئی۔ یہ قتلِ نفس نہیں، فداءِ نفس ہے۔ اس کو قتلِ نفس قرار دینا فدائی جانبازوں کی قربانیوں کی توہین اور یہود و ہنود کو اس آخری کاری وار سے تحفظ فراہم کرنے کے مترادف ہے جس کا کوئی توڑ یا جواب ان کے پاس نہیں۔''

''ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ جس طرح جہاد کے لیے زنا یا شراب خوری جائز نہیں ہو سکتی اسی طرح خودکشی بھی جائز نہیں۔''

''انہوں نے اس دلیل میں دو غلطیاں کی ہیں: ایک تو وہی کہ اسے خودکشی کہا جبکہ خودکشی اور فدائی حملہ میں وہی فرق ہے جو مردار کے عفونت زدہ جسم میں اور شہید کے پاک وجود میں ہے۔ خودکشی کر کے اپنی جان دینے والا اپنی زندگی سے تنگ، اپنے خدا سے ناراض اور اس کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے۔ کفر کش حملہ کر کے اپنی جان فدا کرنے والا شہادت کا متمنی، اپنے خدا کے دیدار کے شوق میں بیتاب اور اس کی رحمت کا طالب ہوتا ہے۔ دوسری غلطی یہ کی کہ انہوں نے زنا کو قتل پر قیاس کیا جبکہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ قتل تو دو قسم کا ہے: ایک جائز اور ایک ناجائز یعنی اپنے آپ کو قتل کرنا ناجائز اور دشمنِ دین کو قتل کرنا جائز بلکہ کارِ ثواب ہے جبکہ زنا اور شراب خوری میں ایسی کوئی تقسیم نہیں کہ دشمن کی عورتوں کے ساتھ زنا یا دشمن سے چھینی گئی شراب پینا جائز ہو۔''

''عرب کے بعض علما اسے ناجائز کہتے ہیں۔''

''ان محترم ہستیوں کو حق گوئی کا یہی ایک موقع ملا؟ پورا جزیرۃ العرب اس وقت کفر کے نرغے میں ہے۔ اس کے متعلق ایک جملہ کہتے ہوئے ہکلا جانے والوں کو فدائی حملوں کے خلاف کھل کر کہنے کی جرأت کیسے ہو جاتی ہے؟ کوئی تو معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔''

''لیکن اس سے نقصان تو مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے۔''

’’یہ یہود کا ’’دجالی‘‘ پروپیگنڈہ ہے۔ آپ جانبین کے نقصان کے اعداد و شمار دیکھیں تو ایسا کبھی نہ کہیں گے۔ فدائی حملوں سے پہلے روایتی حملوں میں فریقین کے جانی نقصان کا تناسب ایک اور دس تھا۔ اب یہ گھٹ کر ایک اور تین رہ گیا ہے اور جس دن فدائی مجاہدین ان حملوں کی تکنیک کو جدید سے جدید تر کرنے میں کامیاب ہوگئے اس دن یہ تناسب تین اور ایک اور پھر دس اور ایک بھی ہوسکتا ہے۔ مالی نقصان میں کنجوس یہودیوں کا جو حال ہے اس کا تو تصور بھی مشکل ہے۔ مسلمان کا ایک گھر گرتا ہے لیکن یہودی بستیوں کی پوری کی پوری تعمیر کا خرچ باہر سے آنا رک جاتا ہے۔ بس بات یہ ہے کہ جب یہودی ’’دیریاسین‘‘ جیسے واقعات میں مسلمانوں کا اجتماعی قتلِ عام کرتے تھے تو اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے۔ اب جب وہ مسلمان آبادیوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے ہیں تو اسے حقیقت سے بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمان دانشور مسلمان نوجوانوں کو سمجھائیں کہ تم یہودیوں کو چھیڑ کر اپنی مصیبت (جو کہ درحقیقت یہودیوں کی شامت ہوتی ہے) کو آواز مت دو۔‘‘

آپ خواہ مخواہ وکالت کرتے ہیں، اس کو نہیں دیکھتے کہ اس میں بے گناہ مارے جاتے ہیں۔‘‘

’’دیکھیے! اس موضوع کو خواہ مخواہ نہ کہیے۔ یہ وہ ٹیکنالوجی ہے جس نے ١٩٦٥ء کی جنگ میں پاکستان کا دفاع کیا ورنہ آج جہاں میں اور آپ کھڑے ہیں یہاں ہر طرف مسلی ہوئی دھوتیاں اور منڈھی ہوئی چوٹیاں نظر آ رہی ہوتیں۔ آئے دن خبریں آتی ہیں کہ بھارت میں فلاں جگہ پاکستان کے جاسوس پکڑے گئے۔ کسی ایک آدمی کے پکڑے جانے سے کتنا زبردست نقصان ہوتا ہے جبکہ فدائی حملوں میں ایسا کوئی نقصان نہیں۔ پھر آپ بے گناہ کس کو کہتے ہیں؟ ان یہودیوں کو جو دنیا بھر سے دجّال کے استقبال کے لیے ارضِ موعود میں ایک ایک اینٹ رکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے من حیث القوم جرائم اتنے ہیں کہ اب ان کا کوئی فرد بے گناہ نہیں۔ کوئی اصل مجرم ہے کوئی اس کا معاون۔ پھر یہ اصول یاد رہنا چاہیے کہ اعتبار اصل مقصود کا ہوتا ہے ضمنی اور تبعی چیزوں کا نہیں۔ اصل حملہ دشمن پر ہوتا ہے ضمن میں کوئی بے گناہ زد میں آجائے تو اس کی ذمہ داری جانباز جوان پر نہیں۔‘‘

”ہمارے اپنے مسائل بہت ہیں، ان پر لکھنا چاہیے۔ فلسطین ہم سے بہت دور ہے۔“

”اپنے ملک وقوم کی خدمت سے کسے انکار ہے؟ یہ ہے تو ہم ہیں، لیکن یاد رکھیے! سارے اسلامی خطے مسلمان کا ملک ہیں، سارے کلمہ گو ایک قوم ہیں، حرمین کی طرح بیت المقدس ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے خصوصاً جبکہ اسلامی اخوت کے جذبات پیدا ہونے سے حب الوطنی اور تعمیرِ ملت کی تحریک پیدا ہوتی ہے تو فلسطین پر لکھنا اپنے ہی وطن پر لکھنا ہے۔ اجتماعی امور کے حوالے سے ملت کو بیداری کا پیغام درحقیقت تعمیرِ وطن کے لیے ذہن سازی ہے۔ اگر کوئی شخص بیت المقدس پر یہود کے قبضے سے اپنے دل میں کسک محسوس نہیں کرتا تو اپنے وطن کا درد کیسے محسوس کرے گا؟ آج نصف صدی سے زائد تقریباً ۵۸ برس (۱۹۴۸ء میں قیامِ اسرائیل سے تاحال) ہونے کو آئے ہیں بیت المقدس کی تعمیر و درستگی نہیں ہوسکی۔ مسلمانوں کا عظیم ترین ورثہ ان کی آنکھوں کے سامنے ضائع ہو رہا ہے۔ میں یہاں ”آنکھوں کے سامنے“ کا لفظ محاورۃً کہہ گیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دو نسلیں گزر چکی ہیں (پچیس سال میں ایک نسل اوسطاً گزر جاتی ہے۔ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق اقل مدت بلوغ ۱۲ سال اور اقل مدت حمل چھ ماہ ہے۔ اس طرح ۲۵ سال میں انسان دادا بن سکتا ہے) انہوں نے مسجدِ اقصیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تک نہیں۔ باہر کی بات چھوڑیے اگر کسی فلسطینی مسلمان سے پوچھیے کہ آپ خود بیت المقدس کبھی گئے ہیں؟ آپ نے وہاں جمعہ کی کتنی نمازیں پڑھی ہیں؟ تو وہ آپ کو جواب اثبات میں نہ دے سکے گا۔ فلسطین یا اردن کے مہاجر کیمپوں میں پل بڑھ کر جوان ہونے والے مسجدِ اقصیٰ کی جزوی تفصیلات سے کیسے واقف ہوسکتے ہیں؟ اگر آج خدانخواستہ مسجدِ اقصیٰ کے انہدام کی کوئی شیطانی کوشش ہوتی ہے (۲۰۰۶ء سے ۲۰۱۲ء کے درمیان اس سے بھی بڑے واقعات ہوکر رہیں گے) تو کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی مسلمانوں کی موجودہ نسل کو خبر ہی نہ ہوگی کہ ان کے ساتھ کیا ہوا لہٰذا ہم مسجدِ اقصیٰ کو ہر زاویے سے مسلم نوجوان کے ذہن میں ثبت کرنا چاہتے ہیں۔ اس ورثے کی عظمت اور اس کا سوگوار حسن اسے آتش بہ جگر بنا کر چھوڑے گا اور اگر ایک کُرد نوجوان سلطان ایوبی بن سکتا ہے تو مسلمان مائیں

بانجھ نہیں ہوئیں، اقصیٰ کے فاتح نہ سہی، محافظ تو جنم دے سکتی ہیں۔''

''اچھا ایک بات تو بتائیے! القدس کی تصویریں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔''

''یہ سب ''ضربِ مؤمن'' والوں کے تقویٰ کی برکت ہے۔ لوگ سمجھتے تھے جاندار کی تصویر کے بغیر اخبار نہیں چل سکتا۔ ''ضربِ مؤمن'' میں جاندار کی ایک بھی تصویر نہیں ہوتی لیکن یہ اپنی تصاویر کی وجہ سے مشہور ہے۔''

''پھر بھی بتائیں تو سہی؟''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں، دیکھیں وہ رہی سامنے مسجدِ اقصیٰ! آئی نظر! وہ غیرت کے افق اور حمیت کی حدِ نظر کے پار! ہماری میراث! ہماری غیرت کا امتحان! ہماری سربلندی اور دشمنوں کی رسوائی اور ذلت کا نشان! آپ دل میں اسلاف کی سی غیرت اور مسلمان ماؤں، بہنوں کی حرمت کی حفاظت کا جذبہ پیدا تو کیجیے! یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں۔''

داؤدی پتھر کی مار

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیر، لومڑی اور گیدڑ اکٹھے مل کر شکار کو گئے، شام کو جب دن بھر کی کمائی تقسیم کرنے کا وقت آیا تو شیر نے ان دونوں سے کہا تم اسے تقسیم کرو۔ ان دونوں نے عرض کیا: ”نہیں بادشاہ سلامت! آپ تقسیم فرمایئے۔“ ”اچھا تو پھر میں ہی اسے تقسیم کیے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر شیر آگے بڑھا، شکار کی تین ڈھیریاں بنائیں اور پہلی ڈھیری کو گھسیٹ کر اپنی طرف کرتے ہوئے کہا: ”یہ میری ہوئی اس واسطے کہ میں شکار میں شریک تھا۔“ پھر اس نے دوسری ڈھیری کو بھی گھسیٹ کر پہلی سے ملا دیا اور اس کی وجہ یوں بیان کی: ”یہ بھی ہماری ہی ہے اس لیے کہ مابدولت جنگل کے بادشاہ ہیں۔“ بعد ازاں وہ تیسری ڈھیری کی طرف بڑھا اور اس پر اپنا پنجہ رکھ کر گویا ہوا: ”رہ گئی یہ، تو جس کی ہمت ہو وہ اسے لے لے۔“ لومڑی اور گیدڑ میں ہمت تو کیا ہوتی لیکن رذالت ان میں اتنی تھی کہ اپنے قبیلے میں پہنچنے کے بعد اس بات پر ڈینگیں مارتے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ انہوں نے بادشاہ سلامت کے ساتھ شکار پر جانے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

ہم جب بھی یاسر عرفات کی شکل دیکھتے یا بیان پڑھتے ہیں تو یہ لطیفہ یاد آتا ہے اور آج کل جب سے صہیونی استعمار کو ان کی زندگی میں ان کا متبادل دریافت کرنے کی کوشش میں مگن دیکھتے ہیں تو لومڑی کے بعد گیدڑ کی جوڑی بھی پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ یاسر عرفات صاحب یوں تو فلسطین کے ”اقتدار چوک“ کے گھنٹہ گھر ہیں کہ گزشتہ پانچ دہائیوں میں فلسطین کی تاریخ کے جس جھروکے سے جھانکیں، موصوف بارہ کی سوئی پیشانی پر سجائے چوک کے وسط

میں خوشامدانہ مسکراہٹ کی نحوست چہرے پر جمائے نظر آئیں گے۔ فلسطین پر غاصبانہ قبضے سے آج تک کے پچاس سال سے زائد عرصہ میں یہودی دہشت گردوں نے لاتعداد مسلمانوں کی جان لی، بے شمار مسلم قائدین کو شہید کیا لیکن معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ وہ اس ''عظیم مجاہد'' کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے اور یہ ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ''شہادت پروف'' قسم کی چادر اوڑھے ان کے قلب میں موجود رہے اور ایسی ریاست کی کامیاب حکمرانی کرتا رہا ہے جس کا تخت کامیابی کے ساتھ ہوا میں معلق ہے۔ اس کی زندگی کا حاصل یہ تھا کہ یہ ہر موقع پر یہودیوں کے ساتھ سمجھوتے کر کے اپنی فالج زدہ اور نیم زندہ نیم مردہ قسم کی حکومت کے لیے مہلت کی چند مزید ساعتیں حاصل کرتا رہا اور اس کی واحد کامیابی یہی تھی کہ یہ ''القدس فروشی'' کے عوض چند رعایتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں ہم ایسی ہی ایک رعایت کا ذکر کرتے ہیں جو اوپر ذکر کیے گئے لطیفے کے تذکرے کا سبب بنی۔

آج سے تقریباً دو دہائیاں قبل اسرائیلی وزیر اعظم ایہود ابارک (جسے اس زمانے کے اخبار نویس احد بارک لکھتے تھے) نے طویل مذاکرات اور پرجوش مصالحتی مشنوں کے بعد یاسر عرفات کی فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ ایک منصوبے پر اتفاق کیا جس کے تحت ''الاقصیٰ مسجد کمپلیکس'' کو تین حصوں (تین سطحیں کہنا زیادہ مناسب ہے) میں تقسیم کیا جانا تھا۔

(١) زمین پر موجود مسجد اقصیٰ، ملحقہ صحن اور جو کچھ چہار دیواری میں ہے۔

(٢) جو کچھ کہ مسجد کے نیچے زمین میں ہے۔

(٣) جو کچھ کہ مسجد کے اوپر فضا میں ہے۔

اس میں سے پہلا حصہ یاسر عرفات کو مرحمت فرمایا گیا تھا اور ایہود ابارک اور ان کی ٹیم نے اسرائیل کے لیے ''صرف'' زمین کے نیچے والے حصے پر ''اکتفا'' کیا کیونکہ یہودیوں کے خیال میں مسجد اقصیٰ کے نیچے ان کی عبادت گاہ مدفون ہے۔ اس ''مصالحانہ اور قطعی طور پر منصفانہ اور غیر جانبدارانہ'' منصوبے کے مطابق تیسرے حصے کو آزاد چھوڑ دیا گیا لیکن دنیا بھر کو اس آزادی کا مطلب معلوم تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ فلسطینی اتھارٹی اور حکومت اسرائیل میں سے صرف

اسرائیل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ٹرانسپورٹر یا جنگی طیارے رکھ سکے۔ گویا کہ یاسر عرفات جو اس معاہدے کو اپنی عظیم فتح بتاتے ہوئے خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا، اس کا اقتدار اسرائیلی اقتدار کی دو سطحوں کے بیچ میں بھنچا ہوا تھا۔ درمیان کی سطح پر اسے جو ''خودمختارانہ'' اقتدار دیا گیا تھا اس کی علامت کے طور پر اس کو اجازت عطا کی گئی کہ وہ القدس کے مقدس شہر پر اپنا پرچم لہرا سکے۔ یہ وہ ''فراخدلانہ'' رعایت تھی جو مجاہدِ اعظم صاحب حاصل کر سکے لیکن اس معمولی رعایت پر بھی شدت پسند اسرائیلی گروپوں نے اپنے وزیراعظم پر سخت تنقید کی، اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں اور ایک یہودی ''ربی'' (مذہبی رہنما) نے یہاں تک کہا: ''ہم اس وقت اپنی عبادت گاہ کی دو ہزار سال قبل کی تباہی کا ماتم نہیں کر رہے بلکہ آج کی تباہی کا ماتم کر رہے ہیں۔'' یہ بات اس مناسبت سے کہی گئی کہ جس دن یہ اعلان ہوا اس روز یہودی عوام رومی بادشاہ ٹائٹس کے ہاتھوں اپنے ہیکل کی تباہی کے دن کی یاد منا رہے تھے۔ ٹائٹس ۷۰ء میں گزرا ہے، اس نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ایہودا بارک نے اس دن کو مذکورہ بالا اعلان کے لیے اس خاطر چنا تھا کہ اسرائیلی قوم اس منصوبے میں مضمر عیارانہ تقسیم سے خوش ہو گی مگر متعصب اور جنونی یہودیوں نے اس کے اس دجل کو بھی رومی بادشاہ کے جرم سے ملا دیا۔

یہ اس وجہ سے ہوا کہ اسرائیل میں درجنوں ایسے جنونی گروپ کام کر رہے ہیں جن کی زندگی اور جدوجہد کا واحد مقصد ''مسجدِ اقصیٰ'' کا انہدام اور اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہے۔ (یاد رہے کہ الاقصیٰ یا بیت المقدس کا اطلاق اس پوری چاردیواری اور اس کے اندر موجود ہر چیز پر ہوتا ہے جسے قارئین بارہا مختلف زاویوں سے دیکھنے کی سعادت ''ضربِ مؤمن'' کی وساطت سے حاصل کر چکے ہیں اور جس میں مسجد کا ہال اور گنبدِ صخرہ دونوں شامل ہیں۔ اب اس بارے میں ابہام ختم ہو جانا چاہیے اور اس بحث میں نہ پڑنا چاہیے کہ مسجدِ اقصیٰ سے سبز گنبد والا مسجد کا ہال مراد ہے یا زرد گنبد والا قبۃ الصخرۃ؟ یہودیوں کے تیار کردہ ہیکل کے ماڈل بھی آپ کئی مرتبہ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یاد رکھیے کہ اب بات دہائیوں کی نہیں، مہینوں یا چند ایک سالوں کی رہ گئی ہے) ان گروپوں نے امریکا اور یورپ میں کئی تنظیمیں بنا رکھی ہیں جو مسلمانوں

کی اس عظیم عبادت گاہ کو تباہ کرنے کے لیے چندہ جمع کر کر کے بھیجتی ہیں۔ یہ چندہ ٹیکس فری ہوتا ہے اور محض یہودیوں سے نہیں بلکہ اس کا زیادہ تر حصہ عیسائیوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ عیسائیوں کو رام کرنے کے لیے انہوں نے جیوش کرسچن کوآپریشن (JEWISH CHRISTIAN CO-OPERATION) ٹائپ کے فورم اور انٹرنیشنل کرسچین ایمبیسی (International Christian Embassy) قسم کی تنظیمیں بنا رکھی ہیں۔ ان تنظیموں نے مسیحیوں کو یہود سے قریب تر لانے کا انقلابی کام اس شاطرانہ طریقے سے انجام دیا ہے کہ کبھی سارا مغرب یہودیوں کا جانی دشمن ہوتا تھا لیکن آج کے اہل مغرب یہود کی بجائے مسلمانوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ کبھی یہود کا لفظ نفرت کی علامت ہوتا تھا مگر آج کے مسیحی، یہود کی محبت میں گرفتار ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہودیوں سے شدید نفرت کے اظہار کے طور پر ہر بری چیز کی نسبت ان کی طرف کرنا ایک روایت بن گیا تھا اور کئی تنظیمیں معاشرے کو محض یہودیوں کے وجود سے پاک کرنے کے لیے وجود میں آئی تھیں۔ ان کی سرپرستی پاپائے روم کیا کرتا تھا اور اسی بنا پر برطانیہ اور جرمنی سے یہودی نکالے گئے۔ جلاوطنی کی یہ رسم تیرہویں صدی سے شروع ہو کر پندرہویں صدی تک رہی۔ یہودیوں کی بابت عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات میں خبیث ترین اور شریر ترین مخلوق یہودی ہیں مگر آج کے مسیحی اسرائیل کی توسیع اور استحکام کے لیے یہودیوں سے بھی زیادہ پیسہ خرچ کر رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ہم پر اس لیے مہربان ہے کہ ہم یہودیوں پر مہربان ہیں۔

دوسری طرف اس سے بھی بڑا غضب یہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ کی تاریخ میں پہلی بار مسلمان اپنے ازلی دشمن کی پہچان سے محروم ہو گئے ہیں جبکہ اہلِ کتاب کرۂ ارض کے ہر پست و بالا مقام پر باہم متحد ہو کر ان کا گھیراؤ کر رہے ہیں۔ یہ دشمن کی فکری یلغار کی کامیابی نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان ممالک اس کی زہریلی دشمنی بھول کر اسے تسلیم کرنے کی باتیں کر رہے ہیں، مسلمان اہل علم القدس کو یہود کی وراثت اور الاقصیٰ پر یہود کا حق تولیت تسلیم کرنے پر بحث مباحثے کا آغاز کر چکے ہیں، مسلم دانشوروں کی اکثریت مسئلہ فلسطین کو سیاسی یا نسلی رنگ دینے کی کوشش

کرتی ہے جس کی بنا پر مسلم عوام کے ذہن میں ''قبلۂ اول'' کی بجائے ''مسئلہ فلسطین'' کا لفظ راسخ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے سمجھ دار لوگ بھی اسے عربوں کا سیاسی مسئلہ سمجھنے لگے ہیں جبکہ خدائے وحدہ لاشریک کی قسم فلسطین کا قضیہ سیاسی نہیں، ایمان کا مسئلہ ہے۔ اس ذات کی قسم جس نے حرمین اور القدس کو تقدس بخشا یہ صرف قبلۂ اول کا نہیں، قبلتین کا مسئلہ ہے۔ یہ محض حرم قدسی پر قبضے کی جنگ نہیں، حرمین پر تسلط کا معرکہ ہے۔ یہ وقت بحث مباحثے کا نہیں، توبہ، رجوع الی اللہ اور مؤمنانہ عزم کو زندہ کرنے کا ہے۔ آج فتنۂ دجال ٹی وی، ڈش انٹینا اور کیبل کے ذریعے گھروں میں گھس چکا ہے، یہ وقت بے حیائی کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے اور ''معرکۃ المعارک'' (عظیم ترین جنگ) کی تیاری کا ہے جو ہم سے نفاق کے ہر شعبے سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی علانیہ بغاوتوں کو یکسر چھوڑ دینے کا تقاضا کرتی ہے۔ فلسطین کے بچوں نے اپنے ہاتھوں میں ویسا ہی پتھر تھام رکھا ہے جیسا حضرت طالوت کے لشکر کے بہادر نوجوان جناب سیدنا داؤد علیہ السلام نے جالوت کی پیشانی پر مارا تھا۔ عراقی مجاہدین ٹینکوں کا مقابلہ گدھا گاڑیوں سے کر رہے ہیں۔ ان پتھروں اور گدھا گاڑیوں نے جالوت کے لشکر پر دہشت طاری کر رکھی ہے۔ مشاہدات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اب یہودی ہلاک شدگان اور مسلمان شہداء کا تناسب گھٹ کر تین اور ایک رہ گیا ہے جبکہ کسی وقت یہ ایک اور دس ہوتا تھا۔ نیز اسرائیل سے واپس جانے والوں میں ۶۰ فیصد اضافہ اور آنے والوں میں ۷۰ فیصد کمی ہوگئی ہے اور اس طرح نہتے فلسطینی جانبازوں نے تن تنہا وہ کام کر دکھایا ہے جو مالدار عرب ریاستوں سے نہ ہو سکا۔ وہ حواس باختہ ہو کر مسلم تہذیب و روایات اور تشخص و ثقافت، کو مٹانے اور دینی اداروں کے بابرکت نظام کو سبوتاژ کرنے پر تل گیا ہے۔ اب یا تو کامل ایمان ہوگا یا کامل نفاق، بیچ کا ڈھل مل کرتا درجہ ختم ہونے والا ہے۔ اب یہ فیصلہ صاحبِ ایمان لوگوں نے کرنا ہے کہ وہ کس لشکر، کون سے گروہ اور کس جماعت میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟؟؟

ہیکل سلیمانی: فسانہ یا حقیقت

افواہیں اور حقیقت:

گزشتہ ہفتے کے دن جب یہودیوں کے ایک متعصب ترین گروہ نے قبلہ اول، ثالث الحرمین الشریفین، مسجد اقصیٰ کے قریب ”ہیکل سلیمانی“ کی علامتی بنیاد کے طور پر تقریباً پانچ ٹن وزنی سنگ مرمر کا ایک پتھر رکھنے کی کوشش کی تو وہ افواہیں حقیقت میں بدل گئیں جو صہیونی عزائم کے حوالے سے سننے میں آتی رہی تھیں۔ باخبر مسلم زعماء اور فلسطینی مجاہدین کے رہنما بے خبر اور اپنے حال میں مست مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے کہ یہودی ہیکل سلیمانی کا نقشہ تیار کیے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اس کا قیمتی ترین ماڈل بھی بنا رکھا ہے اور اپنی مذہبی روایات (جن میں سے اکثر ایسی عجیب وغریب رسومات اور قصے کہانیوں پر مشتمل ہیں جو بلاشبہ من گھڑت اور یہودی پادریوں کی خود ساختہ ہیں) کی روشنی میں اس کی تعمیر کا خاکہ اور مطلوبہ دیگر اشیاء مہیا کی ہوئی ہیں۔ بس وہ ایسے مناسب موقع کی تلاش میں ہیں جب ہزاروں سال بعد وہ اپنی قوم کو یہ خوش خبری سنا سکیں ہم نے ”ہیکل سلیمانی“ کی تیسری مرتبہ تعمیر کا کارنامہ انجام دے لیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جب ”معماران ہیکل“ کے نام سے موسوم متشدد اور جنونی قسم کے یہودیوں کی ایک جماعت مسجد اقصیٰ کے ”باب المغاربہ“ کے قریب دیوار براق (جسے یہودی دیوار گریہ کہتے ہیں) کی سیدھ میں یہ پتھر رکھنے کے لیے جمع ہوئی (جس کی خریداری کے لیے امریکی یہودیوں نے بطور خاص چندہ دیا تھا) تو فلسطینی مسلمانوں نے نہتے ہونے کے باوجود شدید مزاحمت کی اور ان ”دلاور“ یہودیوں کو چند سیکنڈ میں مار بھگایا جو اپنی قوم سے ہیکل کا معمار ثالث

ہونے کا اعزاز حاصل کرنا اور یہودیت کی تاریخ میں نام لکھوانا چاہتے تھے۔ اطلاعات کے مطابق موقع پر موجود مسلمانوں کو اور کچھ نہ ملا تو انہوں نے پاس پڑے پتھروں اور اپنے جوتوں سے یہودیوں کی خبر لی اور ان کی ساری شیخی کو گندے پانی کی جھاگ کی طرح اڑا دیا۔ ان انتہا پسند یہودیوں کی رسوا کن اور ذلت آمیز پسپائی پر قریب کھڑے یہودی سپاہی اور فوجی تیخ پا ہو کر فلسطینی مسلمانوں پر چڑھ دوڑے اور متعدد کو زخمی کر دیا، لیکن فلسطینی مسلمانوں نے یہ زخم ہنسی خوشی سہہ کر ثابت کر دیا کہ وہ جیتے جی مکار یہودیوں کا منصوبہ کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ اس موقع پر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''ہیکل سلیمانی'' کیا ہے؟ یہودی اس کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ مسجد اقصیٰ پر ان کے دعوے کے دلائل میں کتنا وزن ہے؟ خدا اور رسول کی نافرمان اور انبیاء علیہم السلام کی گستاخ یہ مردود و مغضوب قوم مستقبل میں کیا ارادے رکھتی ہے؟ ان کی کھوپڑی میں جمع شدہ یہ گندے بخارات کس طرح نکالے جا سکتے ہیں اور ان کے اس دماغی فتور کا علاج کیا ہے؟ ذیل کی سطروں میں آپ انہی چند سوالوں کا جواب ملاحظہ فرمائیں گے۔

ہیکل کیا ہے؟

ہیکل کے معنی معبد کے ہیں یعنی عبادت گاہ۔ یہودیوں کا عقیدہ اور دعویٰ ہے (اور انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ بودا دعویٰ نہ ہوگا) کہ جہاں آج مسجد اقصیٰ کی چار دیواری ہے وہاں کسی زمانے میں حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ السلام کی تعمیر کردہ عبادت گاہ تھی جو بعد میں منہدم ہوگئی۔ معراج کی رات جب سید الاولین والآخرین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو (بشمول حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ السلام) یہاں نماز پڑھائی اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس فتح کر کے یہاں مسجد اقصیٰ کی جدید تعمیر کی بنیاد رکھی تو اس وقت یہودی در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اب جبکہ صدیوں کی ذلت سہنے کے بعد دوبارہ القدس پر قابض ہوگئے ہیں، اس لیے وہ یہاں ہیکل تعمیر کر کے اپنی اس مذہبی یادگار کو زندہ کرنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھٹکار کے سبب زمانے کے بھول بھلیوں میں ان سے گم ہوگئی تھی...... لیکن کیا واقعی یہودیوں کا یہ نظریہ اور دعویٰ درست ہے؟ مسلمانوں،

عیسائیوں اور خود یہودیوں کے مستند مذہبی مآخذ اور تاریخی حقائق اس کی تردید کرتے ہیں۔

آسمانی کتب، مذہبی صحائف اور تاریخی مآخذ کی روشنی میں یہ بات ناقابل تردید حقیقت کے طور پر ثابت ہے کہ جہاں آج مسجد اقصیٰ موجود ہے، اس جگہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور سے ہزاروں سال قبل ابتدائے آفرینش میں ہی عبادت گاہ موجود تھی اور یہودیوں کے دنیا میں وجود سے قبل اللہ کے نیک بندے اس جگہ کو اپنی پیشانیوں کے لمس سے آباد کرتے چلے آئے تھے۔ بعض مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ سب سے پہلے حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما الصلوٰۃ والسلام نے تعمیر کی اور اس میں جنات سے کام لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جگہ ابوالانبیاء والبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے عبادت گاہ کے طور پر معروف تھی۔ صحیح بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر میں چالیس سال کا فاصلہ ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی تھی۔ اس حساب سے بیت المقدس کی اولین تعمیر دور سلیمانی سے بہت عرصہ قبل ہو چکی تھی۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی مقدس کتابوں کی رُو سے بھی یہ امر ثابت ہے اور کوئی یہودی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

استحقاق کا دعویٰ کیسے؟

پھر دوسری بات یہ ہے کہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر کے بعد بھی یہاں کئی مرتبہ تعمیرات ہوئی ہیں۔ بعض مرتبہ زلزلہ کی وجہ سے اور بعض مرتبہ بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار کی وجہ سے مکمل انہدام کے بعد نئی تعمیر ہوئی ہے۔ چھٹی صدی قبل از مسیح کے اوائل میں بابل (عراق میں پروان چڑھنے والی ایک قدیم تہذیب کا مرکز) کے حکمران بخت نصر کو جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر مسلط کیا تو اس نے یروشلم کو فتح کر کے یہاں کے یہودیوں کو پیوند زمین کر دیا۔ بقیہ کو غلام بنا کر لے گیا، اس زمانہ میں ڈیڑھ سو سال تک وہاں ویرانی اور ملبہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اہل مصر، فارسیوں اور رومیوں کی فلسطین پر حکومت کے مختلف ادوار گزرے ہیں اور ان کے دور میں یہاں تعمیرات بنتی اور منہدم ہوتی رہی ہیں۔ اس بات سے تاریخ کا ادنیٰ

طالب علم واقف ہے اور یہودیوں کو اس سے انکار کی مجال نہیں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مسجد اقصیٰ کی موجودہ تعمیر سے قبل یہاں بے شمار مرتبہ تعمیرات ہوئی ہیں۔ تو جب حضرت سلیمان علیہ السلام سے قبل یہاں عبادت گاہیں موجود تھیں اور ان کے بعد مختلف قوموں کے ہاتھوں تعمیرات ہوتی رہیں اور یہود کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خود کو اس جگہ کا اوّلین یا تنہا وارث ثابت کر سکیں تو آخر کس بنیاد پر وہ اس کے استحقاق کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ محض اتنی بات کہ بنی اسرائیل کے جلیل القدر نبی سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس جگہ ایک مرتبہ تعمیر کی تھی، یہود کے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہرگز کافی نہیں، کیونکہ فارسیوں اور رومیوں سمیت دنیا کی نجانے کتنی قوموں نے اس مقدس جگہ کو بنی اسرائیل سے پہلے اور ان سے زیادہ عرصہ تک بطور عبادت گاہ کے آباد رکھا ہے تو صرف یہودی ہی اس کے دعویدار کیونکر ہو سکتے ہیں؟

القدس کا وارث کون؟

اگر بالفرض بغرض بحث یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں سب سے پہلی تعمیر سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی تھی نیز یہ کہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں موجودہ مسجد اقصیٰ کی بنیاد پڑنے تک یہاں اور کوئی تعمیر نہیں ہوئی تو پھر بھی یہودیوں کو اس مقدس خطے کے ہتھیانے اور یہاں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس وجہ سے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وراثت کے ہرگز حقدار نہیں، یہ بدبخت قوم تو دیگر انبیاء کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان میں بھی سنگین گستاخی کرتی ہے اور ان کے والد سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کی بھی سخت بے ادبی کی مرتکب ہوتی ہے۔ ان کی موجودہ تورات میں ان جلیل القدر انبیائے کرام کے بارے میں ایسے واقعات ہیں کہ قلم میں مجال نہیں کہ ان کو نقل کر سکے۔ حضرات علمائے کرام اور طلبہ علوم دینیہ کی نظر سے وہ اسرائیلی روایات ضرور گزری ہوں گی جن کی تردید حضرات مفسرین سورۂ صٓ میں حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام کے قصص کے ذیل میں کرتے ہیں۔ علمائے اسلام نے ان روایات کو اصلی الفاظ کی بجائے نسبتاً ہلکے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ یہودیوں کے اصل الفاظ اگر پڑھ لیے جائیں تو انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے

۱۔ یہ سطور اس وقت تحریر کی گئیں جب موصوف زندہ تھے۔

کہ یہ بدباطن قوم ان مقدس ہستیوں کے بارے میں کیسے توہین آمیز نظریات رکھتی ہے اور یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ آج کل ہیکل کے سنگ بنیاد کے حوالے سے انٹرنیٹ پر یہودی جو تفصیلات جاری کررہے ہیں ان میں صاف طور پر ان غلیظ اور من گھڑت روایات کا ذکر موجود ہے جن کو پڑھ کر اس بدبخت قوم پر ازلی رسوائی کی مہر لگنے کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ الغرض جب قوم یہود سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بھی گستاخ اور بے ادب ہے (جبکہ یہودیوں کا قومی نشان، ستارہ داؤدی اور ان کا مذہبی ارمان ہیکل سلیمانی انہی دو عظیم المرتبت باپ بیٹوں کی طرف منسوب ہے) اور قرآن کریم کی سچی خبر کی رو سے حضرت داؤد علیہ السلام نے اس قوم کے لیے بددعا بھی فرمائی ہے (دیکھیں سورۂ مائدہ: ۷۸) تو یہ راندۂ درگاہ یہودی ان حضرات کی وراثت کا دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں؟ ان کے حقیقی وارث تو درحقیقت مسلمان ہیں جو نہ صرف ان انبیاء کی عظیم فضیلت کے قائل ہیں بلکہ ان سے سچی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔

سمجھنے کا نہ سمجھانے کا:

ہیکل کی بنیاد رکھنے کا حالیہ قصہ بھی ایسا عجیب وغریب ہے کہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ یہودیوں کی مذہبی روایات کے مطابق ہیکل کی تیسری تعمیر مسیح موعود کے ظاہر ہونے کے وقت ہوگی جو یہود کو ہزاروں سال کی ذلت سے چھٹکارا دلوائیں گے اور پھر فرشتے اس کی تعمیر کریں گے۔ کٹر یہودیوں کے نزدیک موجودہ مسجد اقصیٰ میں داخل ہونا بھی جائز نہیں کیونکہ اس کے نیچے ہیکل اول ودوم کے آثار موجود ہیں جن کے اوپر چلنا بے ادبی سے خالی نہیں۔ اس واسطے اکثر یہودی اس تعمیر کے لیے کسی غیبی واقعے کا انتظار کررہے ہیں، مگر چند منچلے یہودیوں سے صبر نہیں ہوتا، وہ فرشتوں کی بجائے خود یہ فریضہ انجام دینا چاہتے ہیں مسجد میں داخلے کے جواز کے لیے انہوں نے یہ تاویل نکالی ہے کہ وہاں ہم نماز اور دعا کے لیے جائیں گے اس بہانے سنگ بنیاد رکھ دیں گے (یہ حیلہ قرآن کریم اور کتب تفسیر میں مذکور یہودیوں کے ان حیلوں سے ملتا جلتا ہے جن کے ذریعے وہ حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کرلیا کرتے تھے۔ مثلاً دیکھیے: سورۂ اعراف میں اصحاب السبت کا قصہ) یہودیوں کا یہ گروہ عرصہ دراز سے مسجد اقصیٰ کے انہدام کی کوشش کررہا ہے۔ کبھی مسجد کی بنیادوں کے نیچے آثارِ قدیمہ کی تلاش کے بہانے سرنگیں کھودی

جاتی ہیں اور کبھی مفسد یہودی اپنے ساتھ ایسا کیمیکل لے جاتے ہیں جو مسجد کی اینٹوں کے درمیان بھرے گئے مصالحے کو ریزہ ریزہ کردے اور ان کی مشکل آسان ہو جائے۔

سوز بھری صدا:

فلسطینی مسلمان اگرچہ یہودیوں کے نرغے میں گھرے ہوئے اور محصور و مجبور ہیں، لیکن ایسی حیرت انگیز شجاعت اور ہمت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، جس کا اندازہ خود یہودیوں اور ان کے سرپرستوں کو بھی نہ تھا۔ اور اس دور میں جبکہ جمہوریت اور انسانی حقوق کا غلغلہ ہے اور لمحے بھر میں ایک واقعے کی خبر دنیا کے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی ہے، اہل فلسطین پر یہودی ایسے مظالم کر رہے ہیں جو مہذب دنیا کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں...... لیکن آفرین ہے ان بے کس و بے بس مسلمانوں کو کہ انہوں نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا۔ وہ حوصلے اور بہادری کی ایسی تاریخ رقم کر رہے ہیں جس کا آج کے بے خبر مسلمانوں کو تو احساس نہیں لیکن مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس پر بجا طور پر فخر کر سکیں گی۔ آج مسجد اقصیٰ سوگوار ہے، اس کا شکوہ فلسطینی مسلمانوں سے نہیں کیونکہ وہ مقدور بھر کوشش سے پہلو تہی نہیں کر رہے، اس کا شکوہ دنیا بھر کے ان سرمایہ دار مسلمانوں سے ہے جن کا دل فلسطینیوں کی مظلومیت پر نہیں کڑھتا، ان نوجوانوں سے ہے جن کی جوانیاں دنیا پر لگ رہی ہیں، ایوبی کے ان فرزندوں سے ہے جو اس کی طرف نسبت پر فخر تو کرتے ہیں لیکن اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کے لیے قربانی دینے پر تیار نہیں۔ مسجد اقصیٰ سے سوز بھری صدا آتی ہے: آج جو مسلمان میرے غم میں شریک نہیں، کل وہ محشر کی عدالت میں میرا سامنا کس طرح کرے گا؟

سامری کا بچھڑا

آپ جانتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کا اطلاق اس پوری چار دیواری پر ہوتا ہے جسے حرم قدسی بھی کہتے ہیں لیکن عام بول چال میں صرف اس ہال کو بھی مسجد اقصیٰ کہہ دیتے ہیں جو نماز کے لیے مخصوص ہے۔ اس واسطے اس حدود میں واقع ایک ایک انچ کی حفاظت اہل توحید کا فرض منصبی ہے اور اس میں سے ذرا سے ٹکڑے سے دستبردار ہونا بھی سخت بے غیرتی اور بدنصیبی ہوگی۔ موجودہ دور میں اپنے گھناؤنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جس طرح کی مکارانہ سازشیں، دھوکہ وفریب اور ضرورت پڑے تو سفاکانہ دہشت گردی کا جو مظاہرہ یہود نے کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی......لیکن حیرت کی بات ہے کہ دنیا انہیں مظلوم اور معصوم سمجھتی ہے اور ان کے ہاتھوں ستم سہنے والے مسلمان دہشت گرد قرار پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم یہود کا ہر فرد اپنے حصے کا کام کرتا ہے۔ ان کے صحافی جھوٹ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ان کے سرمایہ دار صہیونیت کے لیے پیسہ لٹانے سے دریغ نہیں کرتے، ان کی خواتین اور بوڑھوں سے بھی جو بن پڑے اسے کر گزرتے ہیں، ان کے منصوبہ ساز ذاتی مفاد کی بجائے اجتماعی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہیں، ان کے سوچنے والے دماغ یہودیت کے لیے سوچتے ہیں اور عمل کرنے والے جسم یہودیت کو پروان چڑھانے کے لیے کارکردگی دکھاتے ہیں۔ سیاسی لیڈروں سے لے کر مذہبی رہنماؤں تک سب صہیونیت کے لیے راستہ ہموار کرتے ہیں خواہ اس کے لیے کتنا ہی بدترین اخلاقی جرم کرنا پڑے۔ اس وجہ سے انہیں عارضی غلبہ ملا ہوا ہے......لیکن جس دن مسلمان دنیا سے زیادہ آخرت کو، زندگی سے زیادہ شہادت کو اور ذاتی سے زیادہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے

لگیں گے، اس دن یہودیت مردہ چھپکلی کی طرح زمین سے چمٹی ہوئی کراہ رہی ہوگی۔ بس اس چیز کا شعور مسلمانوں میں پیدا ہونے کی دیر ہے، یہودیت کا طلسم فنا ہونے اور اس کی برتری پامال ہونے میں اتنا وقت بھی نہ لگے گا جتنا سامری کے بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ سمندر میں بہانے میں لگا تھا۔

عظیم تر اسرائیل کیا ہے؟

پچھلی مجلس کے اختتام پر بات چل رہی تھی کہ بعض حضرات عرب حکمرانوں کے بارے میں حقائق پر مشتمل تبصروں کو سوءِ ادب گردانتے ہیں اور مقاماتِ مقدسہ کی تعمیر کے حوالے سے ان کی خدمات کے پیشِ نظر اس بارے میں سکوت کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ بات سن کر وہ کرنل صاحب یاد آجاتے ہیں جن کی خوش اطواری ہم نے زمانہ طالب علمی کے آخر میں ملاحظہ کی تھی۔ یہ کرنل صاحب وردی اور بوٹوں کے بوجھ سے آزاد کردیے گئے تھے، لیکن ان کا کرنیلی جتانے کا شوق سرد نہ ہوا تھا۔ وہ ہر لمحہ یہ باور کراتے رہنا چاہتے تھے کہ وہ کوئی خاص قسم کی مخلوق ہیں جن کو ہر آدمی ''سر'' کہہ کر پکارے، ''یس سر'' کہہ کر جواب دے، ان کے لیے راستہ چھوڑ دے، دروازہ کھولے، اگر ان کی ''اسٹک'' گر جائے تو اٹھا کر پیش کرے، جب وہ آجائیں تو سب مؤدب ہو جائیں اور جب تک وہ رخصت نہ ہو جائیں تب تک ان کے رُعب سے سہمے رہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وردی اتر جانے کے بعد کون کسی کے یہ ناز اٹھاتا اور چونچلے برداشت کرتا ہے لیکن کرنل صاحب نے اپنے اس ذوقِ انانیت کی تکمیل کے لیے یہ راستہ ڈھونڈ لیا تھا کہ وہ محلے کی مسجد کمیٹی کے صدر منتخب ہوگئے۔ اب تو خدا دے اور بندہ لے۔ مسجد میں گویا مارشل لا نافذ ہوگیا۔

سب سے پہلے کرنل صاحب نے مسجد کی کھڑکیوں اور دروازوں میں جالیاں لگوائیں، صحن کے فرش کو جھاگ والے پاؤڈر سے مل مل کر آئینہ نما بنایا گیا، نالیوں کے متعلق حکم ہوا کہ چاندی کی طرح چمکی ہوئی ہونی چاہییں، بیت الخلاء کے لیے الگ سے چپلیں رکھوادی گئیں، کیاریوں اور پودوں کو پانی لگانے کا نظم الاوقات طے کیا گیا، دریوں کو سونگھ سونگھ کر دیکھا جانے لگا کہ کہیں ان کی

دھلائی باسی تو نہیں ہو گئی۔ غرض یہ کہ کرنل صاحب نے اپنی فراغت کا ایسا بھرپور حل تلاش کیا کہ فوجی چھاؤنی اور مسجد کے احاطے میں فرق معلوم کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ بظاہر یہ سب کچھ کرنل صاحب کے دل میں موجود خانۂ خدا کی خدمت کے جذبے کا مظہر تھا لیکن کرنل صاحب کے انداز واطوار کا مشاہدہ کرنے سے...... جو ہم لطف لے لے کر کیا کرتے تھے...... یہ بات شبہے سے بالاتر ہو جاتی تھی کہ وہ یہ سب کچھ اپنی صدارت کے تحفظ، حکم دینے کی عادت کی تسکین اور انانیت سے اٹی ہوئی اکھڑ طبیعت کی تشفی کے لیے کیا کرتے تھے۔ مسجد میں ان کے آنے کا انداز، کمیٹی کے دیگر ارکان اور خدام مسجد کے ساتھ ان کا یہ رویہ اور وقتاً فوقتاً ان کے نادر شاہی فرامین سب اس امر کے غماز تھے کہ اس شخص کو خانہ خدا کی خدمت کے اجر وثواب اور انوار و برکات سے کوئی خاص غرض نہیں، یہ اپنی طبیعتِ ناموزوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ رفاہی خدمات انجام دے رہا ہے۔ جس شخص کے اقدامات حکیمانہ نہیں حاکمانہ ہوں، جس کا رویہ اخلاقیات سے عاری اور نخوت بھرا ہو، وہ اگر خانۂ خدا سے تعلق میں اخلاص وخدمت کا دعویٰ کرے تو اس پر یقین کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ڈاڑھی منڈے مچھڑ پیر کی گالیوں کو ”پہنچی ہوئی سرکار کے تبرکات“ سمجھ کر سینے سے لگائے پھرے۔

حرمین شریفین کے موجودہ خدام کی تعمیری وتوسیعی خدمات بلاشبہ مثالی ہیں لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ان میں کرنل صاحب مذکور کی عادات واطوار کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان حضرات نے اپنے ملک میں کھیل، تفریح اور ”انٹرٹینمنٹ“ کو خوب فروغ دے رکھا ہے۔ یورپ اور امریکا میں کون سی ایسی تفریح ہے جو انہوں نے اپنے عوام کو گھر بیٹھے مہیا نہ کر رکھی ہو لیکن مجال ہے ان کی حدود مملکت میں جہاد کے بارے میں کسی کو ایک لفظ کہنے کی اجازت ہو۔ ان کے پڑوس میں اسرائیل کا ہر نوجوان عسکری تربیت سے آراستہ ہے لیکن یہ ”محافظین حرمین“ اپنے نوجوانوں کے لیے جہادی تربیت کو شجر ممنوعہ قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے عوام پر جو جبری نظام مسلط کر رکھا ہے اس کی شدت کی انتہا یہ ہے کہ ان کی حدود مملکت میں جہاں تین افراد جمع ہو جائیں وہاں چوتھا حکومتی جاسوس ہوتا ہے جو اس بات کی کھوج لگاتا ہے کہ کہیں شیخ اُسامہ کا

تذکرہ یا امریکا کی مخالفت کے سنگین جرم کا ارتکاب تو نہیں ہو رہا۔ ان صاحب ایمان حکمرانوں کی اُمّت مسلمہ کے لیے دل سوزی کا یہ عالم ہے کہ یورپ و امریکا کی کوئی تفریح گاہ ایسی نہیں جہاں وہ دادِ عیش نہ دیتے ہوں اور ان کے جو نوجوان مغربی دنیا کے تفریحی اداروں سے دل بہلائیں تو یہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ ان کی توجہ بٹی رہے، لیکن اگر کسی کے متعلق معلوم ہو جائے کہ یہ سرزمین جہاد میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے یا وہاں سے ہو کر آیا ہے تو اس کے متعلق ان کی تشویش اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک وہ سلاخوں کے پیچھے نہیں پہنچ جاتا۔ ویسے تو مسلمانوں کی بدحالی کا تذکرہ کرتے ان کی زبانیں نہیں تھکتیں لیکن انہوں نے اپنی جیلوں میں مجاہدین یا امریکا مخالفین کے لیے ایذاء رسانی کے جو طریقے فراہم کر رکھے ہیں ان کو سن کر انسان کو یقین نہیں آتا کہ یہ حکمران اپنے دل میں مسلمانوں کا اس قدر ''درد'' رکھتے ہوں گے۔ اس موضوع کا ذکر صاحبِ ایمان کے لیے کوفت و رنج کا باعث ہے لیکن اس بحث کو چھیڑے بغیر فلسطین کے ان زخموں سے آشنائی نہیں ہو سکتی جو یہود مردود کے ہاتھوں اس مقدس سرزمین کو لگے ہیں اور ان حکمرانوں نے ان کے علاج کے لیے اتنا بھی نہیں کیا جتنا یہ اپنے پالتو جانوروں کے لیے کرتے ہیں۔

عرب کی مالدار ریاستوں کے مطلق العنان بادشاہوں کی اُمّت مسلمہ سے خیانت دنیا کے سامنے نہ آتی اگر لارڈ رچرڈ کی تجوری میں موجود ''گریٹر اسرائیل'' کا خفیہ نقشہ آشکارا نہ ہو جاتا۔ رچرڈ ایک کٹر یہودی تھا، انتہائی متعصب اور شدت پسند، مالدار اتنا تھا کہ اسے خود بھی اپنی دولت کا صحیح صحیح اندازہ نہ تھا۔ اس نے اپنی ساری دولت صہیونیت کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اعلان بالفور کے ذریعے یہودی ریاست کا خاکہ تشکیل دیا گیا تو اس وقت صہیونی منصوبہ سازوں کے سامنے اہم مسئلہ فلسطین میں یہودی آبادی کا تناسب بڑھانے کا تھا۔ اس شخص نے دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں بسانے کے لیے اپنی خزانوں کے منہ کھول دیے۔ اس نے فلسطینی باشندوں کو منہ مانگی قیمت ادا کر کے ان سے زمین خریدنا شروع کی اور اور وہاں یہودی بستیاں تعمیر کرنے کے لیے پیسے کو بے دریغ

لٹایا۔ اس وقت کے علما نے عوام کو سختی سے منع کیا کہ وہ یہودیوں کو زمین بیچ کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہ ماریں۔ دردمند مسلمانوں نے دنیا بھر کے مشاہیر علما سے اس بارے میں فتاوٰی منگوائے اور عوام الناس کو مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی لیکن رچرڈ جیسے یہودیوں کی دولت نے عامۃ المسلمین کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا اور وہ مہنگی قیمتوں کے لالچ میں اپنی زمین دھڑا دھڑ فروخت کرتے چلے جا رہے تھے۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور کابل کے بعض علاقوں میں یہ کھیل ایک بار پھر دہرایا جا رہا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ عوام الناس اس وقت تک ہوش کے ناخن نہیں لیتے جب تک پانی سر سے اونچا نہیں ہو جاتا۔ علمائے کرام کی نصیحتوں اور مسلم زعماء کی اپیلوں پر کسی نے کان نہ دھرا اور رچرڈ جیسے سرمایہ دار یہودیوں کی وجہ سے فلسطینی زمینوں کی ملکیت اس وقت تک یہودیوں کے کھاتے میں منتقل ہوتی رہی جب تک یہودی اکثریت میں نہ ہو گئے۔ جیسے ہی ان کی آبادی کا تناسب مطلوبہ مقدار تک پہنچا تو انہوں نے مسلمانوں کو زبردستی ان کے گھروں سے بے دخل کر کے ہجرت پر مجبور کرنا شروع کر دیا اور وہ دولت مسلمانوں کے کچھ کام نہ آئی جو بزعم خود انہوں نے یہودی سرمایہ داروں سے اینٹھی تھی۔ لارڈ رچرڈ جب مرا تو اس کی دستاویزات سے "عظیم تر اسرائیل" کا نقشہ برآمد ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ اسرائیل تو ابھی ابتدائے نحوست ہے آگے آگے نجانے کیا غضب دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر یہ برآمد شدہ نقشہ آپ دیکھ لیں تو دل پر ہاتھ رکھ کر آپ بار بار سوچیں گے کہ اس نقشے میں دیے گئے رقبے (جو نیل سے دجلہ اور صنوبر والی زمین (لبنان) سے کھجوروں والی زمین (مدینہ منورہ) تک پھیلا ہوا ہے) اب کون سا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ ہم اور آپ بلکہ ہر وہ انسان جسے روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کو اس حال میں اپنے اعمال کا جواب دینا ہے کہ اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان کوئی اور حائل نہ ہوگا، صلیبیوں کے کندھے پر چڑھ کر آنے والے اس صہیونی طوفان کو روکنے کے لیے کیا کر رہا ہے؟؟؟ کیا ہم سب عرب حکمرانوں کی طرح اپنے آپ میں مست رہ کر یہود اور ان کے آلہ کار عیسائیوں کے لیے تمام راستے کھلے چھوڑ دیں گے؟؟؟ یہ مسلمانوں کی غیرت کو درپیش وہ چیلنج ہے جس کے جواب کی تیاری پر ان کا مستقبل موقوف ہے۔

القدس کے فدائیوں کے نام

یہ ۸/ دسمبر ۱۹۸۷ء بروز منگل کی ایک یخ بستہ شام کا ذکر ہے، فلسطین میں زبردست سردی پڑ رہی تھی، سڑکیں سرِ شام سنسان ہوگئی تھیں اور لوگ جلد از جلد اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جانا چاہتے تھے تاکہ آگ کے سامنے بیٹھ کر شعلوں کی تپش کو جسم کی رگوں میں اتار دیں اور ہڈیوں میں اترتی سردی سے چھٹکارا پاسکیں۔ فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ ہونے کو تقریباً ۴۰ سال ہوآئے تھے (ارضِ مقدس انگریز کی بددیانتی اور یہود نوازی کے سبب ۱۴/ مئی ۱۹۴۸ء کو یہود کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہوئی تھی) فلسطینی مسلمان عالمی طاقتوں اور ان کو استعمال کرنے والے عیار صفت یہودیوں کی حرکتیں دیکھ رہے تھے، ان کی مکاریوں کا بے نیازی سے جائزہ لے رہے تھے اور ان میں تاحال اس ننگے ظلم کے خلاف کوئی مربوط ردِعمل نہ پایا جاتا تھا۔ نہ قومی اور اجتماعی سطح پر انہوں نے ارضِ مقدس میں آگھسنے والے غاصبوں کے خلاف کسی تحریک یا جدوجہد کی منظّم صورت اپنائی تھی۔ ان کی صفوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، لیکن یہ خاموشی ایسی تھی جو کسی طوفان کی آمد سے قبل سمندر کی سطح پر ہیبت ناک انداز میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ عالمی استعمار اور صہیونی تحریک کے گماشتوں کی حرکتوں کا تماشہ کر کر کے ان مکاروں کے خلاف ان کے دلوں میں چالیس سال سے جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا وہ پھٹ پڑنے کو تھا۔ بس ایک ہلچل یا دھماکے کی ضرورت تھی جو منگل کی اس شام کو ایک درندہ صفت یہودی ڈرائیور نے فراہم کردی۔

ہوا یوں کہ فیکٹریوں میں کام کرنے والے فلسطینی ملازم تھکے ہارے اپنے گھروں کو جارہے تھے۔ یہ غریب اور خستہ حال افراد کرائے کی مسافر گاڑیوں میں لدے پھندے ٹھسے

ہوئے تھے اور ایک سخت جاں گسل دن گزار کر جلد از جلد اپنے کچے پکے گھروں میں پہنچ کر اپنے بیوی بچوں کے درمیان سکون کے چند لمحات گزارنا چاہتے تھے۔ مخالف سمت سے ایک دیوہیکل ٹرک آ رہا تھا جس کے اسٹیرنگ کے سامنے ایک خبیث صفت یہودی بیٹھا ہوا تھا۔ چونکہ یہودیوں کو آج تک ان کی خونریز کارروائیوں کا کوئی جواب نہ ملا تھا اس لیے یہ شیر ہوگئے تھے۔ کمینہ صفت لوگوں کی یہ خصلت ہوتی ہے کہ وہ کمزور پر شیر بن جاتے ہیں اور طاقتور کے سامنے بھیگی بلی...... جبکہ شریف آدمی طاقت کا بے جا مظاہرہ کرنے والوں کے سامنے تو ڈٹ جاتا ہے اور اس کا سر نیچا کرنے تک اپنا سر تانے رکھتا ہے، مگر اپنے سے کمتر لوگوں کی جلی کٹی بھی ہنس کر سن لیتا ہے اور ان پر ہاتھ اٹھانا تو کجا، جواب دینا بھی بلند ہمتی سے کم درجے کی بات سمجھتا ہے۔ یہودی ڈرائیور فولادی ٹرک پر اونچی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے جب دیکھا کہ سامنے ٹوٹی پھوٹی گاڑیوں میں سوار غریب مسلمان چلے آ رہے ہیں تو اس کو خباثت سوجھی۔ یہ بدبخت جان بوجھ کر ٹرک کو مخالف سمت میں لے گیا اور ان گاڑیوں پر چڑھا ڈالا۔ مسافر گاڑیاں دیوہیکل ٹرک کی زوردار ٹکر سے کھلونوں کی طرح چکنا چور ہوگئیں۔ چار مسلمان موقع پر خالق حقیقی سے جا ملے جبکہ دیگر شدید زخمی ہوگئے۔ بات سنگین تو تھی لیکن اتنا آگے نہ بڑھتی جتنی کہ اسرائیلی حکام کے تعصب نے بڑھا دی۔

انہوں نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر ڈرائیور کو اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کی گاڑی میں بٹھایا اور موقع سے غائب کروادیا۔ ان کے خیال میں انہوں نے ہوشیاری سے کام لیا تھا لیکن درحقیقت ان کی یہ حرکت ان کے لیے خودکشی کے مترادف ثابت ہوئی اور اس صریح جانبداری نے فلسطینی مسلمانوں کے دل میں بڑھتے ہوئے غم و غصے کے لاوے کو تیلی دکھا دی اور ان میں سے کسی کے دل بھی اب تک یہودی غاصب حکومت کی طرف سے کسی انسانیت کی توقع تھی بھی تو ختم ہوگئی اور دشمن کے ہاتھوں مرنے کی بجائے ''اسے مارو یا عزت سے مرجاؤ'' کا فیصلہ کر کے میدان عمل میں نکل آئے۔ اس دن یہودی ڈرائیور تو محفوظ مقام پر پہنچ گیا تھا لیکن اپنے پیچھے وہ آگ لگا گیا تھا جس نے یہودیوں کا چین سے جینا دوبھر کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کو اپنے لہو

سے ایسی آگ بھڑکانے پر مجبور کر دیا جو غاصب یہودیوں کی مکاری کا جواب بن جائے اور انہیں ارضِ مقدس پر قبضے کو ہضم نہ کرنے دے۔ اس آگ کا نام ''انتفاضہ'' تھا جسے دنیا فلسطینی مجاہدین کی سرگرم تحریک جہاد کے نام سے جانتی ہے۔ فلسطین کے بیٹوں نے سیاست، مطالبات، مذاکرات، احتجاج اور مظاہروں کو فضول جان کر بالآخر وہ راستہ اپنایا جو یہودیوں کو گُدّی سے پکڑ کر موت کی اس وادی میں دھکیلتا جس کے ڈر سے وہ دنیا بھر سے بھیڑوں کی طرح ہانک کر ارضِ مقدس میں آلائے تھے۔ ''انتفاضہ'' کی تحریک کا پہلا شہید حاتم السیسی تھا، اس کے بعد فلسطین کے فدائیوں نے اس چراغ کو اپنے لہو سے روشن کر رکھا ہے اور ایثار و قربانی کی دنیا میں انہوں نے ایسی ایسی قندیلیں جلائی ہیں جو رہتی دنیا تک آزادی و حریت کے متوالوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رہیں گی۔

تحریک انتفاضہ اگرچہ دیر سے شروع ہوئی لیکن اس نے کام ہر پہلو سے کیا۔ یہ فقط غاصبوں پر جا برسنے کی دعوت نہ تھی بلکہ اس میں نوجوانوں کی اصلاح، انہیں دین کی حقیقت سمجھنے، اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے ذہن سازی کے مربوط عمل کو ملحوظ رکھا گیا تھا چنانچہ جن خوش نصیب نوجوانوں نے اس سے وابستگی پیدا کی، انہوں نے اپنے عہد کو اس شاندار انداز سے نبھایا کہ آج عالمی لغت میں اعلیٰ مقصد پر فدا ہونا اور حماس کا نظریاتی فدائی مجاہد ہونا ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کو اشکال رہتا ہے کہ فلسطینی فدائین کے ان حملوں سے حاصل وصول کیا ہوتا ہے، الٹا مسلمانوں پر صہیونی تشدد بڑھ جاتا ہے لیکن اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صہیونیوں کا تشدد فدائی حملوں کے آغاز سے پہلے اس سے بھی زیادہ تھا، اب تو ان کو انتقامی کارروائیوں کا خطرہ بے دھڑک ظلم سے روکے رکھتا ہے اور مسلمان آبادیوں پر کارروائی کے لیے آنے والے فوجی گھبراتے ہیں کہ ان پر کہیں سے کوئی ان دیکھا حملہ نہ ہو جائے۔ پچھلے دنوں اخبار میں خبریں آچکی ہیں کہ اسرائیلی فوجیوں کے ایک گروپ نے مسلم آبادیوں میں ڈیوٹی دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب ان فوجیوں کو خصوصی مراعات دی جاتی ہیں جو بنی اسرائیل کے

بندروں کی ''یہودی ریاست'' کے تحفظ کے لیے جان جوکھوں میں ڈال کر ان آبادیوں میں ڈیوٹی کے لیے ہمت باندھتے ہیں جہاں ہر لمحے انہیں مسلمان نوجوانوں کی عقابی نظروں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے یکطرفہ میدان مار رکھا تھا اور نہتے شہریوں پر بلا جھجک دل دہلا دینے والے ظلم کے خوفناک کوڑے برساتے تھے۔ ''دیریاسین'' کا واقعہ اس کی بدترین مثال ہے۔ یہ واقعہ ۹/ اپریل ۱۹۴۸ء یعنی اسرائیلی ریاست کے قیام سے صرف ایک مہینے پہلے پیش آیا تھا۔ اس زمانہ میں خفیہ صہیونی ایجنسیوں نے ہر طرف دہشت برپا کر کے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے کے لیے سفاکیت کی انتہا کر دی تھی، انگریزوں کی ناک تلے...... جی ہاں! انہی انگریزوں کی ناک تلے جن کے دیس میں پہنچ جانے کو آج مسلم نوجوان اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں اور اس منافق قوم کی زیادتیوں کو بھلائے بیٹھے ہیں..... یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ نہتے مسلمانوں کی بستیوں پر چھاپے مار کر بہادری کی داستانیں رقم کر رہے تھے۔ انگریزی قانون صرف مسلمانوں کے لیے تھا جو انہیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کی مدافعت سے روک رہا تھا البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر کہیں نکل جانے والے مسلمانوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ یہ فلسطینی مسلمان پڑوسی ممالک میں دربدر کی جو ٹھوکریں کھا رہے تھے ان کی ایک جھلک آپ آنے والے ''اے بنی اسرائیل'' نامی مضمون میں دیکھ سکتے ہیں جو پاکستان کے ایک مشہور ادیب جناب قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت سوانح حیات سے لیا گیا ہے۔

اس زمانے میں مسلمانوں پر جو مظالم کیے گئے اسے ایک مغربی مصنف آرنلڈ ٹائن بی نے اپنی کتاب (A Study of History) میں نقل کیا ہے اور اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ دنیا بھر میں اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے یہودیوں کے یہ مظالم تو جرمن نازیوں کے ان مظالم سے بھی زیادہ تھے جس کا مزہ انہوں نے تازہ تازہ چکھا تھا مگر پھر بھی باز نہ آئے تھے۔ ۹/ اپریل ۱۹۴۸ء کی رات دیریاسین کے مکینوں کو کبھی نہ بھولے گی جب مسلح یہودی ان کی بستی پر چڑھ آئے اور ایسی ننگ انسانیت کارروائیاں کیں جو کوئی ایسی قوم نہیں کر سکتی جس میں شرافت

اور اخلاق کی ذرا سی رمق بھی موجود ہو۔ ان ظالموں نے مسلمان نوجوانوں اور مردوں کو گھروں سے نکال کر بے دریغ شہید کیا۔ (یاد رہے کہ اس بستی کے کسی شخص نے کسی یہودی کو قتل یا اس پر حملہ نہ کیا تھا مگر پھر بھی ان کے خلاف وہ کچھ ہوا جو انسان کو لرزا دیتا ہے۔ یہ فدائی حملوں کی برکت ہے کہ یہودی پہلے سے زیادہ طاقتور ہیں مگر کم از کم ایسی حرکت آج وہ سوچ بھی نہیں سکتے) بچیوں اور عورتوں سے جو سلوک کیا گیا اس سے حیا کی پیکر ان شریف زادیوں کی چیخوں سے آسمان ہلا جاتا تھا مگر سنگ دل یہودیوں پر اس دن شیطنت سوار تھی۔ وہ انہیں زبردستی ہنکاتے تھے، چلنے پر مجبور کرتے تھے، ان کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے گرد اسلحہ لہرا لہرا کر قہقہے لگاتے تھے۔ وہ دن اس بستی والوں کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا مگر ان کو جرمِ ضعیفی کی ایسی سزا دی جا رہی تھی جس کا تصور بھی انسان کو لرزا دیتا ہے۔ افسوس کہ آج تک ان مظالم کا صحیح انتقام نہیں لیا جا سکا ہے اور یہودیوں کا یہ قرض روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلم نوجوان کے ذمہ باقی ہے۔ یہودی چاہتے تو ان سب کو ان کے مردوں کی طرح شہید کر سکتے تھے مگر اس سے ان کی ناپاک فطرت کی تسکین نہ ہوتی تھی۔ وہ ان عورتوں، بچوں، بچیوں اور بوڑھوں پر امریکا اور برطانیہ کے دیے گئے اسلحے سے دہشت بٹھانا چاہتے تھے۔ جب ابلیسیت کا یہ رقص اختتام کو پہنچا تو اگلے دن یہودی میراثی کرائے کی گاڑیوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے: ”ہم نے دیر یاسین کی آبادی کے ساتھ یہ کیا اور یہ کیا، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔“

اور قارئین کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس روز حملہ آور یہودیوں کا سرغنہ کون تھا؟ وہی پاگل گینڈا جسے لوگ ایرل شیرون کہتے ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کو اس سے مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا حل نکالنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس بدطینت شخص نے اس شرمناک کارروائی کی تکمیل کی اطلاع پا کر اپنے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا تھا: ”تم نے آج تاریخ رقم کی ہے، قوم یہود تمہارے کارنامے کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔“ فلسطینی مسلمانوں کے پاس اپنی بے بسی کا کوئی علاج نہ تھا اور بنی اسرائیل کے ملعون بھیڑیے ظلم و ستم کی تاریخ یونہی رقم کرتے

رہتے اگر دسمبر ۸۷ء کا وہ واقعہ پیش نہ آتا جس کا ذکر مضمون کے آغاز میں ہوا ہے اور جس نے مسلمانوں کو بالآخر کچھ کر گزرنے کا عزم دے کر ایک نئی راہ سجھائی۔ کم نفری اور کم ہتھیار سے دشمن کے خلاف لڑنے کے لیے اس وقت تک گوریلا جنگ ایجاد ہوئی تھی جو فلسطین کے مخصوص حالات کے تحت مجاہد جانبازوں کے لیے ممکن نہ تھی لہٰذا انہوں نے عسکریت کی دنیا میں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا اور دنیا کو فدائی حملوں کی تیکنیک سے متعارف کروایا جو خالی ہاتھ اور وسائل سے تہی دست مسلمانوں کے لیے تحفہ اور ان کے دشمنوں کے لیے سر پر لٹکتی ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کے متعلق معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی نوک پیٹ کو پہلے چاک کرے گی یا اس کا پھل گردن کا پہلے صفایا کرے گا۔ شروع شروع میں مجاہدین کے رہنما اس جانثار فدائی کا تعارف شائع کرتے تھے جو کامیاب کفر کش حملہ کرتا تھا، مگر اس کا نقصان یہ ہوتا تھا کہ یہودی فوجی اس کا گھر مسمار کر دیتے تھے۔ تب یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہید کا نام ظاہر نہ کیا جائے گا اور اب تو وفا کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے کہ باہر سے آنے والے مجاہد بھی فدائی دستوں میں شریک ہو کر اخوت و ایثار کے جذبے کا مظاہرہ کر رہے ہیں جس کی نظیر دنیا کی اور کوئی قوم مشکل سے ہی پیش کر سکے گی۔ قربانیوں اور جنت کی بلندیوں کی طرف یہ سفر جاری ہے اور خوش نصیب آگے بڑھ بڑھ کر اپنی پاک جانوں کا نذرانہ اس مقدس مشن کے لے پیش کرتے رہیں گے جس کی تکمیل بالآخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی کے مبارک ہاتھوں سے ہوگی۔ القدس کے فدائیو! تمہیں یہ اعزار مبارک ہو۔

اے بنی اسرائیل......!

بیروت کا شمار بھی دنیا کے ان مہذب شہروں میں ہوتا ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بندرگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی بید کی چھڑی گھما گھما کر بہت سے گداگروں کو منتشر کر رہا تھا جو سیاحوں پر بھوکی چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ فلسطینی مہاجرین کا ایک خاندان سپاہی کی نظر بچا کر ایک طرف سہما کھڑا تھا۔ ظاہراً وہ دست سوال دراز نہیں کر رہے تھے، لیکن ان کے چہرے اپنی بے زبانی سے پکار پکار کر ان کی بے بسی اور خستہ حالی کی فریاد کر رہے تھے۔ اس خاندان میں ایک چھ سات سال کا لڑکا تھا، ایک آٹھ نو سال کی لڑکی تھی اور ان کی ماں ایک ادھوری بہار کی طرح تھی جسے وقت سے پہلے ہی خزاں نے پامال کر دیا ہو۔ وہ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی، کبھی راہ گیروں کی طرف اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھک منگوں کو بھگا رہا تھا۔ مجھے رکتا دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا: ''کیا آپ ہماری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں؟'' جس طرح ہمارے یہاں کے فقیر دیا سلائی یا بوٹ پالش کا سہارا لے کر بھیک مانگتے ہیں، اسی طرح فلسطین کے مہاجرین تصویر کھنچوا کر بخشش کی امید رکھتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال، تیکھے تیکھے نقوش اور اداس آنکھیں تصویر کشی کے لیے بڑے تابناک موضوع ہیں اور کیمرے والے سیاح ان کی فوٹو اتار کر بڑی فراخ دلی سے بخشش دیتے ہیں۔

تصویر کی فرمائش سن کر میرا جی چاہا کہ میں اس بچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لوں اور کہوں کہ میرے معصوم فرشتے! ابھی خدا نے وہ مصوّر پیدا نہیں کیا جو تیری تصویر کا حق ادا کر سکے۔

تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، اس جھلستی ہوئی دھوپ میں تمہارے پاؤں ننگے ہیں اور تمہاری سہمی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی خشک ہو چکی ہے۔ وہ تیری ماں ہے جسے قدرت نے شباب کی منزل سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے، اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر شاید کوئی فریاد لرز رہی ہے، لیکن وہ سپاہی کے ڈر سے اپنا منہ نہیں کھول سکتی یا شاید اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک غضبناک بددعا تڑپ رہی ہے جو اس نے صرف اس ڈر سے روکی ہوئی ہے کہ کہیں اس دنیا کا بھی وہی حشر نہ ہو جو عاد اور ثمود کی بدنصیب اقوام کا ہوا تھا، اور وہ تیری گڑیا سی بہن جس نے ایک ہاتھ میں اپنی ماں کا دامن تھاما ہوا ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ تمہیں واپس بلا رہی ہے تاکہ کوئی راہگیر تمہیں زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ نہ لے جائے، اس ننھی سے معصوم بچی کے پاؤں بھی ننگے ہیں، اس کے کپڑوں میں بھی بہت سے سوراخ ہیں، اس کے سنہری بال ریشم کے اُلجھے ہوئے گچھوں کی طرح پریشان اور گھنگریالے ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذرے ابرق کی طرح چمک رہے ہیں۔ بچی کی پلکیں گھنی اور نوکدار ہیں اور اس کی اداس آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی اتھاہ گہرائیاں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر یہ بچی آسمان پر پیدا ہوئی ہوتی تو بے شک جنت کی حور بنتی لیکن وہ اس بے رحم زمین پر پیدا ہوئی اور بنی آدم اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں خدا کا یہ نادر شاہکار بھوک سے مرجھایا ہوا ہے، خوف سے سہما ہوا ہے، بے گھر ہے، بے سہارا ہے، اداس ہے، پامال ہے......

اس بچی کی جلد زیتون کی طرح تازہ اور شفاف ہے۔ اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے اس میں ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور فلسطین کے پھولوں کی نکہت اور فلسطین کے انگوروں کا رس رچا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے وجود میں القدس کی ان گنت صدیوں کے تقدس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پرورش بڑے بڑے بزرگوں کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ اس کی تربیت میں آسمانی صحیفوں کا ہاتھ ہے جو خدا نے اس برکت والی زمین پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آباؤ اجداد ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک ٹکڑے اور سہارے کی ایک جھونپڑی کے لیے ننگے پاؤں اور ننگے سر بیروت کی گلیوں میں

پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو ایک بار پھر وہ گھر یاد آنے لگا ہے جس سے ڈھائی ہزار سال قبل خدا نے انہیں نکال باہر کیا تھا۔ یہودیوں کا جدید ترین مقدس **خط ۱۹۱۷ء کو بالفور** کے دفتر خارجہ کی جانب سے نازل ہوا اور جس میں بشارت دی گئی تھی کہ شاہِ انگلستان کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر مہیا کرنے کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں یہودیوں کی ہر ممکن مدد کرے گی......

جس عقیدت مندی سے یہ یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر اسی طرح انہوں نے اپنی الہامی کتاب تورات کو بھی مانا ہوتا تو شاید بنی اسرائیل کو ہزاروں سال تک دربدر کی خاک نہ چھاننا پڑتی۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا جہان کے لوگوں پر فضیلت دی۔ جب خدا نے تمہیں قوم فرعون کے پنجے سے چھڑایا جو تمہیں بڑے بڑے دکھ دیتے تھے۔ تمہارے لڑکوں پر چھری پھیرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جب خدا نے تمہارے لیے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تم کو بچا کر فرعون کے آدمیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر ''من وسلویٰ'' اتارا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری اور اس میں سے تمہارے لیے پانی کے بارہ (۱۲) چشمے پھوٹ نکلے۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن بھی یاد کرو جب خدا نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم حق کے ساتھ باطل کو نہ ملانا اور خدا کی آیات کو سستے داموں نہ بیچنا، لیکن تم اس وعدے کو وفا نہ کر پائے اور تم نے بڑی ہٹ دھرمی سے بچھڑے کو اپنا خدا بنا لیا۔ تم نے من وسلویٰ کی نعمت کو ٹھکرا کر ساگ پات، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز کی فرمائش کی۔ اپنی اکڑ میں آ کر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹلایا اور بعض کو ناحق جان سے مار ڈالا اور خدا نے تمہاری نافرمانیوں کی پاداش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ کبھی تم کو بجلی نے لے ڈالا، کبھی تم راندہ درگاہ ہو کر بندر بنا دیے گئے، کبھی تمہارے سر پر طور کا پہاڑ لٹکا دیا گیا۔

اے بنی اسرائیل! بے شک تمہارے دل پتھر ہو گئے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور ان سے پانی رسنے لگتا ہے۔

اے بنی اسرائیل! آج تمہاری نسل بالکل اس طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خدا کے کلام تورات کی شکل بدل ڈالی تھی۔ تمہاری رگوں میں جو لہو گردش کر رہا ہے، اس میں اسرائیلی خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دنیا کے گوشے گوشے میں مارے مارے پھر رہے ہو اور تمہاری نسل دوسری قوموں میں خلط ملط ہو کر اب اپنی کوئی امتیازی حقیقت نہیں رکھتی۔ یوں بھی تم نے خدا کے رسولوں کی جگہ اب امریکا اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمہاری موجودہ تورات ''اعلان بالفور'' ہے لیکن یاد رکھو، اس عرب بچی کا سہا ہوا دل اور اس کی غم دیدہ ماں کی ڈوبی ہوئی آہ تمہارے سر پر کوہِ طور سے بھی زیادہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہی ہے۔ اس معصوم بچے کی نگاہوں میں غضبناک، قہرناک اور زہرناک بجلیاں تڑپ رہی ہیں۔ اگرچہ آج کل بندر بنانے کا رواج عام نہیں لیکن خدا اپنے وعدے کا سچا ہے۔ تم امریکا اور انگلستان میں ڈھلے ہوئے سونے چاندی کے بچھڑوں کی جس قدر جی چاہے پوجا کر لو، لیکن عذاب کا جو طوق تمہاری گردن میں پڑا ہوا ہے، اس سے تمہیں نجات نہیں مل سکتی۔

(ماخوذ از شہاب نامہ: ص ۵۹۰، ۵۹۳)

دو قبریں ایک سبق

نبّو چاچا اور طوری ماما دو عجیب و غریب کردار تھے۔ ہم آج تک فیصلہ نہ کر سکے کہ ان کی شخصیتیں زیادہ دلچسپ تھیں یا ان کے معمولات زیادہ انوکھے تھے۔ ان دونوں کرداروں کا اپنا اپنا رنگ، مخصوص حلیہ اور منفرد انداز تھا۔ دونوں کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی اور وہ گہرے دوست تھے۔ یوں تو طوری ماما بھی کم نہ تھا لیکن آج کی مجلس میں ہم صرف نبّو چاچا کی بات کریں گے۔ طوری ماما کی بات آگے چل کر۔ نبّو چاچا ۵۰ کے پیٹے میں تھے لیکن ان کی نظر جتنی عقابی تھی، آواز اس سے زیادہ پاٹ دار تھی۔ جب وہ اپنے مخصوص لہجے میں چھوٹے (دکان میں کام کرنے والا لڑکا) کو بلاتا تو اس کی آواز کی کاٹ اور گونج سننے والی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ چھوٹا زخمی ہو گیا، اس کے ٹانکے لگائے گئے تو طوری ماما نے نبّو چاچا کو مشورہ دیا کہ وہ چھوٹے کو زور سے نہ بلائے ورنہ اس کے زخم کے ٹانکے کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ نبّو چاچا کی گوشت کی دکان تھی اور وہ پیشے کے لحاظ سے قصاب ہونے کے باوجود اخلاقی اعتبار سے ہماری تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھا جس کی بنیاد اخلاقی روایات کی پاسداری، رکھ رکھاؤ اور وضعداری پر تھی اور جو اَب جینز برگر والے کلچر اور انٹینا و انٹرنیٹ کی لائی ہوئی تہذیب تلے دب کر رہ گئی ہے، لیکن ہم یہاں اس کی اور اس کی تربیت یافتہ بلیوں کی ایک مخصوص عادت کا ذکر کریں گے جس میں معرفت کے کئی اسباق پوشیدہ ہیں۔

یوں تو ہر گوشت کی دکان پر آس پاس آوارہ بلیاں مٹر گشت (گوشت گشت کہنا چاہیے) کرتی رہتی ہیں لیکن نبّو چاچا نے جو بلیاں پالی ہوئی تھیں ان کی بات ہی کچھ اور تھی۔ یہ بلیاں

تعداد میں درجن کے قریب اور رنگ، حجم اور وزن میں ہر قسم کی تھیں لیکن ان میں ایک عجیب وغریب صفت پائی جاتی تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ صرف اس چیز کو منہ لگاتی تھیں جو نبو چاچا ان کی طرف پھینکتا تھا اس کے علاوہ کوئی ان کو دل جگر کی صاف بوٹی بھی ڈالے تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ نبو چاچا جب کوئی چیز ان کی طرف پھینکتا تو مجال ہے کہ بیک وقت دو بلیاں اس پر جھپٹیں یا آپس میں الجھ جائیں۔ ہرگز نہیں...... ایک بلی اگر کسی بوٹی یا چھیچھڑے کی طرف پاؤں بڑھا چکی ہے تو دوسری ہرگز اُدھر کو نہ جائے گی بلکہ اپنی باری کا انتظار کرے گی۔ بلیوں کو چھیچھڑے، کبوتروں کو دانہ اور چیلوں کو بوٹیاں کھلانے والے تو بہت دیکھے لیکن نبو چاچا نے ان بلیوں کو استغناء اور ایثار کا جو سبق یاد کرا رکھا تھا وہ ایک منفرد مثال تھی۔ اس دور میں اس کی نظیر تو ایک استاد کے شاگردوں، ایک شیخ کے مریدوں یا ایک جماعت کے کارکنوں میں ملنی بھی مشکل ہے۔ چھیچھڑا خوری کے اس نظم وضبط کے علاوہ ایک اور منظر بھی دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا جب چاچا کام ختم کر کے طوری ماما کے تھلّے پر نشست جماتا تھا۔

نبو چاچا بڑا سیر چشم اور قناعت پسند قسم کا انسان تھا، اس کی دکان میں اتنا صاف ستھرا اور عمدہ گوشت ملتا تھا اور صفائی کا معیار اتنا اچھا تھا کہ اگر وہ چاہتا تو رات گئے تک دکان کا شٹر گرانے کی نوبت نہ آتی اور اس کا کاروبار اتنا چلتا کہ دوسری دکانوں پر دوپہر کو ہی تالے پڑ جاتے مگر وہ گوشت کی ایک مخصوص مقدار میں بک جانے کے بعد دکان سمیٹ لیتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسے منافع خوری کی ہوس نہ تھی، دوسری بات وہ یہ بیان کرتا تھا کہ پاس پڑوس کے ''چھری بند'' بھائیوں کا بھی حق ہے۔ جب مجھے اللہ پاک میری ضرورت کے بقدر بلکہ زیادہ عنایت فرما دیتے ہیں تو مجھے اپنے ان بھائیوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ایسی اجارہ داری نہ بنانی چاہیے کہ دوسرے قصاب اپنے بیوی بچوں کے گزارے کے لیے بھی ترستے رہ جائیں۔ کبھی کبھار نبو چاچا جب دیکھتا کہ سامنے والی دکان پر کافی دیر سے گاہک نہیں آیا تو وہ اپنے گاہک کو بلاوجہ ہی سودا دینے سے انکار کر دیتا اور اسے سامنے والی دکان پر بھیج دیتا جہاں گاہک کے انتظار میں چھریاں تیز کی جا رہی یا مکھیاں ماری جا رہی ہوتی تھیں۔ ذرا خود سوچیے! آج کے اس دور

میں قصابوں میں نہیں، علم وادب سے تعلق رکھنے والوں میں ایسی مروت اور وضع داری ڈھونڈنے سے بھی ملتی ہے؟

خیر تو بات یہ ہو رہی تھی کہ نبّو چاچا کی روانگی کا منظر بڑا عجیب ہوتا تھا، وہ ہر شام کو گوشت کی ایک مخصوص مقدار بکتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دیتا تھا۔ جب تک چھوٹا دکان دھوتا اور صفائی کرتا تب تک چاچا نہا دھو کر پاک صاف کپڑے پہن کر طوری ماما کے تھلّے پر پہنچ جاتا اور ان دونوں کا بقیہ وقت اکٹھے گپ شپ کرنے اور بیٹھک جمانے میں گزرتا تھا۔ جب چاچا تیار ہو کر نکلتا تو اس کی درجن بھر بلیاں اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ کوئی قدموں میں لوٹتی، کوئی دائیں بائیں چلتی، کوئی کندھے پر چڑھی ہوتی، کوئی گود میں اٹھکیلیاں کرتی۔ چاچا کی مخصوص چال اور درجن بھر بلیوں کا جلوس عجب سماں باندھتا تھا۔ بلیاں اس پر فدا ہوتیں اور چاچا بلیوں میں مستغرق ہوتا۔ یہ سلسلہ طوری ماما کے وعلیکم السلام کی آواز تک چلتا اور جیسے ہی چاچا طوری ماما کے تھلّے پر نشست جماتا یہ بلیاں اگلے دن چھیچھڑا خوری کے وقت تک رخصت ہو جاتیں اور چاچا کی نشست میں یا کسی اور کے آرام میں کوئی خلل نہ ڈالتیں۔ اخلاقیات کے زوال کے اس زمانے میں اپنے مربی اور محسن سے ایسی وفاداری اور مزاج شناسی، تربیت یافتہ مریدوں میں بھی خال خال ہی دیکھنے میں آتی ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کو توفیق دے تو ان پڑھ نبّو چاچا اور اس کی بے زبان بلیوں کے اس رویے میں وہ کچھ سیکھنے کو موجود ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسانوں کی صحبت میں بھی ایسے آدابِ زندگی سیکھنے کو نہیں ملتے۔ بعض قارئین کو اس بات سے تعجب ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ نبّو چاچا کی بلیوں میں وہ خاصیتیں پائی جاتی تھیں جن کی تعریف کی جانی چاہیے۔ انسان سیکھنا چاہے تو جانوروں سے بھی سیکھ سکتا ہے اس کی ایک مثال فقہاء کا وہ تبصرہ ہے جو انہوں نے ''فہد'' نامی شکاری جانور پر کیا ہے۔ (اس لفظ کا ترجمہ بعض لوگ چیتے سے کرتے ہیں جو ٹھیک نہیں، چیتا انسانی تربیت قبول نہیں کرتا۔ اس لفظ کا صحیح معنیٰ ''تیندوا'' ہے۔ یہ بلی اور چیتے کے درمیان کی چیز ہے۔ اس جانور کو شکار کے لیے سدھایا جاتا ہے اور یہ درندوں میں اتنا ہی زبردست شکاری ہے جتنا باز پرندوں میں) فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ یہ جانور ایسی اعلیٰ فطری خصوصیات

کا حامل ہے جن کو انسان بھی اپنائے تو ان کے کردار میں بہترین اوصاف پیدا ہو جائیں۔ فقہ حنفی کی شہرہ آفاق کتاب ردالمحتار المعروف بہ ''فتاویٰ شامیہ'' کی کتاب الصید میں سے ایک پیرا گراف کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''شمس الائمہ سرخسی اپنے استاد شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ ''تیندوے'' میں کچھ ایسی خصلتیں ہیں جو عقلمند آدمی کو اپنانی چاہییں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ شکار پر جھپٹنے کے لیے گھات لگا کر چھپ جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ عقلمند آدمی کو چاہیے کہ اگر کوئی اس کا دشمن ہو جائے تو یہ اس کی مخالفت میں اپنی جان ہلکان نہ کرے بلکہ اس کے دفع شر کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں رہے اور اپنے آپ کو تھکائے بغیر دشمن سے نجات حاصل کرے۔ اس جانور کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس کو دورانِ تربیت اگر کسی غلطی پر سزا دی جائے تو یہ سیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کو سکھانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ کُتّا جب ویسی ہی غلطی کرے تو اس کے سامنے اسے سزا دی جاتی ہے تب یہ بھی وہ حرکت چھوڑ دیتا ہے۔ عقلمند لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ دوسروں سے عبرت پکڑتے ہیں۔ جیسا کہ عرب کی مشہور کہاوت ہے: ''**السعید من وعظ بغیرہ**'' (نیک بخت آدمی وہ ہے جس کو کسی دوسرے کے ذریعے نصیحت حاصل ہو اور خود اس پر کوئی مصیبت آنے سے پہلے دوسروں پر آئی آفت سے وہ اپنی اصلاح کر لے) اس جانور کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ یہ گندا گوشت نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک سے اچھے اور صاف گوشت کی توقع رکھتا ہے۔ صاحب عقل شخص کو چاہیے کہ ایسی چیز کو منہ نہ لگائے جس کو اس کے رب نے اس پر حرام قرار دیا ہے۔ ایک عادت اس کی یہ بھی ہے کہ یہ ایک شکار پر زیادہ سے زیادہ تین یا پانچ مرتبہ حملہ کرتا ہے۔ اگر پھر بھی وہ اس کے ہاتھ نہ آئے تو یہ اس کا پیچھا نہیں کرتا اور اپنی جان کو بلاوجہ خطرے میں نہیں ڈالتا۔'' (ردالمحتار، کتاب الصید: ج ۶ ص ۴۶۷)

واقعہ یہ ہے کہ وفا شعاری، غیرت و مروت، ایثار و قربانی اور بلند ہمتی و عالی حوصلگی ایسی صفات ہیں کہ اگر جانوروں میں پائی جائیں تو ان کی حیثیت اور اہمیت کو دو چند کر دیتی ہیں اور

اگر انسان ان سے محروم ہو تو وہ جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مادیت پرستی کے اس دور میں ان اعلیٰ انسانی اوصاف کی قدر نہیں لیکن پھر بھی یہ ایسی آفاقی حقیقتیں ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو وہ بیت المقدس کی مغربی دیوار میں موجود دو قبریں دیکھ لے۔ اسے یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی۔ یہ دونوں قبریں قریب قریب دو حجروں میں واقع ہیں۔ ایک ایسے غریب الدیار شخص کی ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی اور خلافت عثمانیہ کی حمایت کی خاطر بھرپور جدوجہد کی، ہر طرح کی قربانی دی، اپنی خطیبانہ صلاحیتوں کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ یہ شخص دیارِ غیر میں مسافری کی حالت میں فوت ہوا لیکن آج اس کے نام کی طرح اس کی قبر کو بھی جو عزت واحترام حاصل ہے اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ یہ شخص برصغیر کی تحریک آزادی کا مخلص کارکن اور تحریک خلافت کا پرجوش رہنما تھا یعنی مولانا محمد علی جوہر۔

مولانا محمد علی کا انتقال لندن میں اس زمانہ میں ہوا جب وہ پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے گئے تھے۔ جب وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تو ذیابیطس میں مبتلا تھے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں تحریک آزادی کے سلسلے میں یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے سول نافرمانی زوروں پر تھی اور تقریباً ایک لاکھ افراد جیلوں میں محبوس ہو چکے تھے کہ یکا یک ستمبر ۱۹۳۰ء میں وائسرائے ہند نے ۸۶ نمائندوں کو لندن میں ہونے والی انڈین راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (ہندوستانی گول میز کانفرنس) میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ ان میں ۵۷ برطانی ہند، ۱۶ ریاستی ہند اور ۱۳ ہندوستانی سیاسی جماعتوں کے نمائندے تھے جن میں آغا خان، سرتیج بہادر سپرو، سر محمد شفیع، سرسی ستیلواد، نواب چھتاری، مسٹر ایم جیکار، مسٹر سری نواس شاستری، مسٹر سی وائی چنتامنی، ڈاکٹر بے ایل مونجے، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وغیرہ شامل تھے۔ اس گول میز کانفرنس کا آغاز انگریز وزیر اعظم نے قصر سینٹ جان میں ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو کیا۔ یہ گول میز کانفرنس حسب توقع ناکام رہی اور کسی نتیجے پر ختم نہ ہوئی تو وزیر اعظم نے یہ کہہ کر سب نمائندوں کو ٹالنا چاہا کہ آپ ہندوستان واپس جائیں، اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کا تصفیہ کریں اور ایک ایسا حل تلاش کریں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

اس موقع پر مولانا جوہر نے کانفرنس میں وہ معرکۃ الآرا تقریر کی تھی جس میں انہوں نے نہایت صاف گوئی سے اپنے ملک کی سیاسی جماعتوں کو بھی اور حکومت کو بھی کھری کھری باتیں سنائی تھیں اور ان پر آزادانہ نکتہ چینی کی تھی۔ ان کی سب تقریروں میں یہ تقریر ہمیشہ کے لیے یادگار رہے گی جس کے بعد ہندوستان کا یہ غمخوار اور تقریر و تحریر کا شاہسوار ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ اس کے گزر جانے پر نہ صرف انگلستان اور ہندوستان میں اس کے بے شمار مداحوں اور دوستوں کو صدمہ ہوا بلکہ دیگر ممالک میں بھی جہاں جہاں اس کا نام پہنچ چکا تھا اظہار رنج وافسوس ہوا۔ انگلستان میں اس کے جو مسلم و غیر مسلم دوست تھے ان کا اصرار تھا کہ اسے وہیں دفن کیا جائے۔ ہندوستان میں سے اس کے عزیزوں اور دوستوں کے تار گئے کہ اسے وطن مالوف رامپور اور اس کے بزرگوں کے قبرستان میں پیوند خاک کیا جائے، مگر اس کے نصیب میں یہ بات تھی کہ وہ خاکِ پاک بیت المقدس میں آخری نیند سوئے۔ اتفاق یہ ہوا کہ یہ خیال دنیائے اسلام کی ایک ممتاز ہستی اور فلسطین کے مشہور رہنما الحاج مفتی امین الحسینی کے دل میں پیدا ہوا کہ وہ مرحوم کے رشتے داروں کو یہ مشورہ دیں کہ وہ ان کا جنازہ بیت المقدس میں لائیں اور مبارک زمین میں ان کا مزار بنے۔ مفتی صاحب نے اس مضمون کا تار مولانا شوکت علی کو دیا اور انہیں اطلاع دی کہ مسجد اقصیٰ کی چار دیواری کے اندر ایک حجرہ ان کی قبر کے لیے ان کے ایک غائبانہ مداح نے پیش کیا ہے۔ اس اطلاع نے ان سب بحثوں کا خاتمہ کر دیا جو مرحوم کی تدفین کے متعلق ہو رہی تھیں۔ ان کے رشتے دار بھی راضی ہوگئے اور انگلستان والوں کو بھی خاموش ہونا پڑا۔ ان کے جنازہ کو احتیاط کے ساتھ فلسطین پہنچانے کا انتظام ہوگیا اور ان کا جسد خاکی بحری جہاز پر اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ جب ان کا جنازہ پورٹ سعید (مصر) پہنچا تو مصر کے بے شمار مسلمان اس کے استقبال اور اس کے حق میں دعائے خیر کرنے کے لیے موجود تھے اور ان میں سے بہت سے لوگ جنازہ کے ہمراہ بیت المقدس کو روانہ ہوئے۔ جب یہ ساری جماعت القدس پہنچی تو ایک جم غفیر فلسطین کے مسلمانوں کا وہاں شریک جنازہ ہونے کے لیے جمع تھا جس کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر بیان کی جاتی ہے۔

جس حجرے میں مولانا مدفون ہیں وہ ایک مخلص عرب مسلمان کے پاس تھا جس کا تعلق مسجد اقصیٰ سے خادمانہ تھا اور جس کے بزرگوں سے اسے حجرہ ورثہ میں پہنچا تھا۔ اس کے دل میں مولانا محمد علی کی خدماتِ ملّی کی اس درجہ قدر تھی کہ اس نے ان کی وفات کی خبر سن کر مفتی فلسطین الحاج امین الحسینی کی خدمت میں یہ پیشکش کی کہ یہ حجرہ مولانا مرحوم کی آرام گاہ بنایا جائے۔ یہ تجویز جو اس نے اتنی محبت سے کی، فلسطینی مسلمانوں کی اخوتِ اسلامی کی زندہ مثال اور ایثار کی غیر معمولی نشانی ہے کیونکہ ایسی جگہ پر تھوڑی سی زمین بھی بڑے بڑے داموں پر مل نہیں سکتی۔ اس شخص نے کوئی معاوضہ اپنے حجرہ کا نہیں لیا اور اب تک بلا معاوضہ اس کی کلید برداری کا ذمہ دار ہے۔ اس زمانے میں متعدد ہندوستانی زائرین نے بتایا کہ جب اس نے حجرے کا دروازہ کھول کر مزار دکھایا تو زائرین نے چاہا کہ کچھ روپے اس کو بطور نذرانہ پیش کریں مگر اس سیر چشم شخص نے کچھ لینے سے عذر کیا۔

دوسری قبر اس کم نصیب کی ہے جس نے مسلمانوں کو امریکا و برطانیہ کی غلامی میں گرفتار کروایا، خلافتِ عثمانیہ سے غداری کر کے حجاز مقدس کو اس سے جدا کیا اور پھر خود بھی اپنے آقاؤں کی نظر سے گر کر گمنامی کی موت مرا۔ دنیا اسے شریف حسین کے نام سے جانتی ہے اس کی قبر مولانا جوہر کی قبر کے قریب ہے لیکن فلسطینی مسلمان اس کے قریب جانا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں جبکہ مولانا جوہر سے وہ عقیدت و محبت کا سلوک کرتے ہیں حالانکہ شریف حسین ان کا ہم زبان و ہم قوم تھا اور مولانا، ہندوستان کے اجنبی مسافر تھے جن سے ان کا کوئی مادی رشتہ نہیں بنتا لیکن بات وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ انسانی صفات کی ایسی قدر ہے کہ ایسا شخص ظاہراً اپنے مقصد میں کامیاب نہ بھی ہو تو وہ عزت واحترام کا مستحق قرار پاتا ہے اور جو ان سے محروم ہو تو وہ دنیا کے بہت سے کھوٹے سکے جمع کر لینے کے باوجود بے قدر اور بے عزت رہتا ہے۔ شریف حسین نے حکومت کی لالچ میں آ کر صرف عربوں سے ہی نہیں ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی بدترین غداری کی۔ اس نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو جو سلطنت عثمانیہ کی مدد لے کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے، گرفتار کر کے انگریزوں کی قید میں دے

دیا۔ اگر یہ ایسی حرکت نہ کرتا اور حضرت الشیخ افغانستان کے مسلمانوں کو ساتھ لے کر عثمانی اسلحے اور ماہرین کی مدد سے ہندوستان پر حملے میں کامیاب ہو جاتے اور ان کے ساتھی ہندوستان کے اندر سے شورش برپا کرتے تو ہندوستان سے نکالنے کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کو انگریزوں سے محفوظ کیا جا سکتا تھا، لیکن انگریزوں کے ورغلانے میں آکر اس شخص نے گھناؤنا کردار ادا کیا اور پھر جب انگریزوں کی نظر میں آل سعود جچ گئے تو انہوں نے اس کو اردن کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا اور یہ شخص اپنے پیچھے اسرائیل کے پڑوس میں حکمرانوں کی ایک غدار نسل چھوڑ کر مر گیا۔ اس کو انگریز سرکار کی ایما پر بیت المقدس میں دفن کی جگہ دلوائی گئی لیکن انگریز اسے وہ عزت کہاں سے دلواتے جو اہلِ وفا کو نصیب ہوتی ہے۔

بیت المقدس کی مغربی دیوار کے پاس موجود یہ دو قبریں (بندہ کو اس دیوار میں ان قبروں کی صحیح جگہ کا علم کوشش کے باوجود نہ ہو سکا۔(۱) اگر کسی صاحب کو معلوم ہو تو آگاہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے گا) مادہ پرستی کی غلاظت میں لتھڑے انسانوں کو پیغام دیتی ہیں کہ حق کو زوال نہیں اور باطل کو قرار نہیں۔ وفا کو فنا نہیں اور دغا کو بقا نہیں۔ جو لوگ نظریے کی خاطر جیتے ہیں موت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور جو سفلی خواہشات پر مرتے ہیں ان کے نام کو جھوٹی زندگی دینے کے لیے جتنی اونچی یادگاریں بنائی جائیں وہ ان کو عزت نہیں دلا سکتیں۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے امیر المؤمنین مُلّا محمد عمر مجاہد تک اور شریف حسین سے میر جعفر تک پھیلی ہوئی داستانیں انسانوں کو وفا و خلوص کی عظمت اور ضمیر فروشی کی ذلت کا راز بتا رہی ہیں۔ وقتی مفاد کی خاطر نظریے اور غیرت کا سودا کرنے والے انسان ان کو سنتے ہیں لیکن عبرت اس وقت تک نہیں لیتے جب تک وہ خود عبرت نہیں بن جاتے۔

---

(۱)...... اب اتنا معلوم ہوا ہے کہ ان کی قبر بیت المقدس کی مغربی دیوار کے ساتھ باب القطانین کے باہر مدرسہ خاتونیہ کے سامنے ایک حجرے میں ہے۔ اس حجرے میں مشہور مجاہد، شہید معرکہ قسطل، سید عبدالقادر الحسینی کی قبر بھی ہے جو ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء کو قسطل کے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔ دیکھیے: بیت المقدس والمسجد الاقصیٰ، محمد حسن: ص ۴۲۹، دار القلم دمشق)

طوری ماما کا راز

نبو چاچا کا جگری دوست طوری ماما بھی کچھ کم عجیب نہ تھا۔ طوری ماما خالص آفریدی پٹھان تھا۔ گورا چٹا، سرخ و سفید، مضبوط قد کاٹھ اور صحت مند جسامت کا مالک۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اس کے دنیا میں تین ہی شغل تھے: اپنے پالتو بٹیر سے کھیلنا، ریڈیو سننا اور نبو چاچا سے گپ شپ کرنا۔ نبو چاچا اور اس کی گپ شپ بھی عجیب ہوتی تھی۔ دونوں بولتے اتنے نہ تھے مگر چونکہ مزاجوں میں ہم آہنگی اور موافقت تھی اس لیے دونوں خاموش بیٹھے رہ کر بھی مجلس کا لطف اٹھاتے تھے۔ طوری ماما کا تھڑا ان دونوں کے جمع ہونے سے ایسا سج جاتا تھا کہ خالی ہونے کے باوجود بھرا بھرا لگتا تھا، حالانکہ اس میں مٹکے کے گھڑے، جائے نماز اور نسوار تھوکنے کے ریت بھرے ڈبے کے علاوہ کوئی خاص چیز نہ تھی۔ ماما شکل کی طرح مزاج کے اعتبار سے بھی خالص قسم کا خاندانی پٹھان تھا۔ انتہائی اصول پسند، نازک مزاج، مہمان نواز اور غیرتمند۔ یاروں کا یار اور ان کے لیے سب کچھ لٹا کر یہ سمجھنے والا کہ دوستی کا حق ادا نہ ہوا۔ جب وہ اپنے تھڑے پر بنائی ہوئی مخصوص نشست پر کڑک قسم کی جھاگ اڑاتی چائے کی کیتلی بھر کر بیٹھتا تھا تو اس کی سرمہ لگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بھری بھری مونچھیں اور سینے کے چاروں طرف پھیلی ڈاڑھی عجیب منظر دکھاتی تھی۔ ماما کا بڑھاپا جوانوں کے لیے قابل رشک تھا اور اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ جوانی میں کیا چیز رہا ہوگا۔ اس کا چوڑا چکلا اور بھاری بھرکم جسم بڑھاپے کی زد میں آنے کے بعد بھی اتنا ٹھوس اور اس کی گرفت اتنی جاندار تھی کہ اگر وہ کبھی اٹھنے بیٹھنے اور سہارا لینے کے لیے کسی نوجوان کی کلائی پکڑ لیتا تو اسے ہاتھ کی ہڈی چورا ہوتی محسوس ہوتی۔

ماما کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ پہاڑ جیسا بڑھاپا اکیلا کیوں کاٹ رہا تھا؟ اس راز د ن کو خبر نہ تھی، نہ ماما اس بارے میں کبھی لب کھولتا تھا۔ نبّو چاچا کو پتہ ہو تو ہو، لیکن اور کسی کو کچھ علم تھا، نہ ماما سے کچھ پوچھنے کی مجال۔ البتہ نبّو چاچا کا منجھلا لڑکا جو ماما کے لیے کھانا لانے اور برتن اٹھانے پر مامور تھا، بتایا کرتا تھا کہ ماما کا تعلق کسی نہ کسی طرح انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والے مجاہدین سے جڑتا ہے اور اغلب یہ ہے کہ ماما اپنی جوانی کے بالکل ابتدائی دور میں ان سے منسلک رہا ہے اور اس کی یہ جلاوطنی اختیاری اور خود ساختہ نہیں بلکہ یہ اس طویل مشقت اور ریاضت کا حصہ ہے جو انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگیں لڑنے والے مجاہدین کے حصے میں آئیں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ہم نے اس سے پوچھا۔ کہنے لگا: ایک روز جب محلے کی بڑی سڑک کو شامیانوں سے بند کر کے دھواں دار قسم کا جلسہ ہو رہا تھا تو ایک مقرر نے برصغیر کے جہاد آزادی میں حصہ لینے والے علما اور مجاہدین کے خلاف کچھ فقرے کہے۔ اس وقت میں ماما کو کھانا دینے گیا ہوا تھا۔ ماما کو جلسے جلوسوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اس دن جلسے کا لاؤڈ اسپیکر ''جبری سماع'' کے نظریے کے تحت محلے کے ہر گھر تک آواز پہنچانے کی جستجو کر رہا تھا۔ ماما نے جب مجاہدین آزادی کے خلاف یہ تبصرے سنے تو اس دن وہ پہلی مرتبہ کھل گیا اور اس کی تنہائی کا راز ہمیں معلوم ہو گیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ سرحد کے قبائلی علاقے کے خوش حال گھرانے کا فرد تھا۔ اس کا اپنا باغ، اپنی زمین اور اپنا گھر بار تھا۔ اسکے علاقے کے خان لوگوں نے انگریزوں کو مخبری کر کے اپنی جائیدادوں میں اضافہ کیا لیکن ماما کو یہ طرزِ زندگی پسند نہ تھا۔ اس نے اپنے لیے وہی راہ چنی جو بلند ہمت، اصول پسند اور اولوالعزم لوگ منتخب کرتے ہیں، پھر اس راہ میں سب کچھ لٹا دیا، ماں باپ، گھر بار سے دوری اور جلاوطنی قبول کر لی مگر حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔ دراصل وہ ان لوگوں میں سے تھا جو یاروں کے لیے سب کچھ لٹا کر افسوس نہیں، بلکہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ تو جب دنیوی دوستی میں وہ حدوں سے گزر جانے کا قائل تھا تو اللہ والوں کے ساتھ تعلق ہو جانے کے بعد اسے کسی چیز کا خوف یا رنج کیسے ہو سکتا تھا؟ چاچا کے منجھلے لڑکے کا کہنا تھا کہ وہ تو خیر گزری کہ مقرر صاحب جلد دل کی بھڑاس نکال کر رخصت

ہو گئے، ورنہ اس دن کوئی خرابی والی بات ہو جاتی تھی۔

طوری ماما کے کردار کا یہ پہلو معلوم ہو جانے کے بعد ہمارے دل میں اس کی عزت اور بھی بڑھ گئی۔ وہ واقعی ان لوگوں میں سے تھا جو اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ افسوس کہ ہماری قوم نے ان حریت پسندوں کی قدر نہ کی اور طوری ماما جیسے بہت سے لوگ جنہیں قیامِ پاکستان کے بعد اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا جانا چاہیے تھا، گمنامی کی زندگی گزارتے ہوئے کسمپرسی کے عالم میں اس دنیا سے چلے گئے جبکہ بہت سے ٹاؤٹ نسل کے ٹٹ پونجیے جو کسی زمانے میں موچی، تیلی یا ڈوم ہوتے تھے آج وہ عوام کے مستقبل کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان پر حکمرانی کرنے والے ان خاندانوں نے اس انگریز سے وفاداری کی تھی جس نے لاکھوں مسلمانوں کی جان لی، بیسیوں اسلامی ممالک کو تاراج کیا اور جاتے وقت یہاں اپنا تھوکا چاٹنے والے ایسے لوگ چھوڑ گیا جو آج تک اُمّت مسلمہ کے جسم میں ناسور کی طرح سوزش پھیلا رہے ہیں۔ انگریز وہی بدعہد، بدفطرت اور بدخصال قوم ہے جس نے ایشیا میں مغل سلطنت کے خاتمے، ایشیا اور یورپ کے سنگم پر عثمانی سلطنت کے سقوط اور افریقہ کے بہت سے مسلم ممالک کی آزادی سلب کرنے کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں یہودی ریاست کی سرپرستی کر کے عرب ممالک کو نہ ختم ہونے والی بدامنی کا تحفہ دیا۔ اس نے ہر موقع پر یہودیوں کی بیجا حمایت کی اور جب بھی یہودی سلطنت پر برا وقت آیا، یہ اس کے تحفظ کے لیے اس طرح چوکنے ہو گئے جیسے کچرا گھر کا چوکیدار رات کو کھٹکا سن کر کان کھڑے کر لیتا ہے۔

جون ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل کی عرب ممالک سے جنگ ہو رہی تھی دنیا حیران تھی کہ مٹھی بھر یہودیوں میں جان کہاں سے آ گئی کہ وہ اس قدر زور سے لڑ رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ برطانیہ کے دو طیّارہ بردار جہاز فلسطین کے دو سمتوں میں کھڑے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ ایک مالٹا میں تھا اور دوسرا عدن میں اور دونوں ایک منٹ کے نوٹس پر حرکت کے لیے پوری طرح چوکس تھے تا کہ اگر یہودیوں کے غبارے سے ہوا نکلنے لگے تو یہ انہیں سہارا دینے پہنچ جائیں۔ جبکہ یہ وہ دن تھے جب یہودی ریاست کی چوکیداری کا فریضہ برطانیہ سے لے کر

امریکا نے سنبھال لیا تھا اور برطانیہ یہ گندا بوجھ امریکا کے سپرد کر چکا تھا۔ دوسری طرف امریکا کا چھٹا بحری بیڑہ مصر کے ساحل پر پوری طاقت کے ساتھ تیار پوزیشن میں کھڑا تھا تاکہ معاملہ یہودی سورماؤں کے بس سے باہر ہونے لگے تو وہ حق وفاداری نبھا سکیں۔ واضح رہے کہ یہ وہ بحری بیڑہ ہے جس کا تین سال بعد ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان انتظار کرتا رہ گیا مگر وہ آکر نہ دیا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ امریکا و برطانیہ کو یہود نوازی سے حاصل کیا ہوا؟ کیا یہودیوں کی دولت میں اتنی کشش ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک مکھیوں کی طرح اس پر گرتے ہیں یا ان ممالک کی سیاست، معیشت اور ذرائع ابلاغ پر نادیدہ گرفت انہیں یہود کی غیر مشروط حمایت پر آمادہ کرتی ہے؟ اگر انصاف سے جائزہ لیا جائے تو یہ دونوں عناصر اپنی جگہ وزن رکھتے ہیں مگر یہاں ایک بات اور بھی ہے۔

امریکا اور برطانیہ صلیب کے نمایندے ہیں اور صلیب نے کئی صدیوں تک جنگ کے باوجود جب دیکھا کہ وہ ارضِ مقدس پر قابض نہ ہوسکی تو انہوں نے یہود کی حمایت کا فیصلہ کیا تاکہ یہود کے خناس دماغ اور صلیبیوں کا سڑاند بھرا تعصب مل کر مسلمانوں سے انتقام لے سکیں۔ یہ محض اندازہ نہیں، اس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں القدس پر یہودی قبضے کے بعد ''سنڈے ٹائمز'' لندن نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا The Holy War.Jun67 اس میں جنگ کا جواب ہے اس کا عنوان ہے: Bake After 896 Years یعنی: ''۸۹۶ برس کے بعد واپسی'' اب یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے القدس کو صلیبی قبضے سے چھڑایا گیا تھا، یہودی اس وقت اپنے آنسو پونچھنے کے قابل بھی نہ تھے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ امریکا و برطانیہ کی طرف سے یہودیوں کی حمایت میں پس پردہ مسلم دشمنی اور انتقام کا جذبہ کام کر رہا ہے اور وہ اس لڑائی کو صلیبی جنگوں کا حصہ سمجھتے ہیں لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے دماغ میں دور دور تک اس دیرینہ دشمنی کو بھانپنے کی کوئی فکر نہیں۔ وہ تو اس عطار کی دوائی میں شفا سمجھتے ہیں جس کے سبب بیمار ہوتے ہیں۔ وہ آج بھی ان ممالک کو اپنا حلیف، ہمدرد اور مشکل وقت کا ساتھی سمجھ کر ان کے دارالحکومتوں کے پھیرے لگاتے رہتے ہیں۔

ان کے یہاں طوری ماما جیسے لوگ جنہوں نے اپنی جوانی، گھربار زمین و جائیداد سب کچھ آزادی کے غاصبوں کے خلاف جہاد میں لٹا دیا، عزت و تکریم کے مستحق نہیں بلکہ وہ تیلی احترام کے قابل ہیں جن کے پسینے سے آج بھی انگریز کی ٹانگوں پر مالش کیے جانے والے تیل کی بو آتی ہے۔

ہمارے وطن عزیز کے اقتدار کے ایوانوں میں سینکڑوں بل پیش اور پاس ہوئے اور بیسوں بل بغیر پیش کیے پاس ہوئے مگر کسی چیز کے بارے میں اگر حکمرانوں کو کھٹکا ہوتا ہے تو وہ ''شرعی نظام عدل بل'' ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جو ملک جس مقصد، دعوے اور نعرے کو لے کر بنا اس میں آج ۵۸ سال بعد بھی اس کے مقصدِ تشکیل کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے کہ اسے پورا کیا جائے یا نہیں؟ اور جواب ملتا ہے کہ نہ صاحب! اس میں بہت سے خدشات، خطرات اور مشکلات ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص صبح سے شام تک نہر کھودے اور جب اس سے سیراب ہونے کا وقت آئے تو یہ بحث چھڑ جائے کہ اس نہر میں صاف شفاف پانی چھوڑا جائے یا گندے پانی کی نالیاں کھول دی جائیں۔ دنیا میں اس وقت جو مملکتیں کسی نظریے کی بنیاد پر بنی ہیں اس میں اس نظریے کی حکمرانی کے علاوہ کسی اور بات کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ مشرقی تیمور میں کیتھولک کے علاوہ کسی اور مذہب، نظریے یا عقدے کی حکمرانی ہو سکتی ہے؟ بھارت میں ہندوازم اور اسرائیل میں صہیونیت کے علاوہ کوئی بات سنی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں......

مگر ہمارے ہاں یہ بوالعجبی ہے کہ آج تک ہم اس مخمصے میں ہیں کہ اپنے لیے اپنے مذہب کے علاوہ اور کون کون سی چیز پسند اور نافذ کریں۔ اپنا پیارا، جامع مانع اور مکمل نظامِ حیات پر مبنی مذہب ابھی تک ہمارے زیرِ غور ہی نہیں۔ ہمارے یہی عجیب و غریب رویے ہیں جن کی بنا پر قوم کی عزت بیچنے والے اسپورٹس مین اور نوجوانوں کو تباہ کرنے والے بھانڈ، مسخرے اور بہروپیے: ایوارڈ، سرٹیفکیٹ اور نوٹوں میں تولے جاتے ہیں اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے لوگوں کا تماشا بنا کر انہیں ''ریٹائرڈ'' کر دیا جاتا ہے۔ قسما قسم کے دن رنگا رنگ انداز میں منائے جاتے ہیں مگر یوم تکبیر کو یوں گزارا جاتا ہے جیسے اس دن کوئی ناروا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جس قوم کے جینے کا یہ رنگ ڈھنگ ہو اسے فلاح و ترقی کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟

لُدّ کے دروازے پر

تحقیق کی آڑ میں:

برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) عصرِ حاضر کا مشہور مستشرق ہے۔ مغرب میں اسے علومِ اسلامیہ میں سند تسلیم کیا جاتا ہے اور عالمِ اسلام کی نفسیات، احوال اور مستقبلیات کے بارے میں اس کی رائے ”ان“ کے ہاں بہت اہمیت و وقعت رکھتی ہے۔ مستشرق اس عالم کو کہتے ہیں جو مسلمان نہ ہو..... لیکن علوم اسلامی اور مشرقی زبانوں کا مطالعہ اور واقفیت رکھتا ہو۔ یہود نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں موجودگی کے دوران یہ طریقہ اختیار کرلیا تھا کہ مسلمان ہونے کا اعلان کردیتے تھے، مسلمانوں جیسا لباس، ان جیسی شکل، ان جیسا نام رکھ لیتے تھے اور کچھ عرصے بعد یہ کہہ کر دینِ اسلام کو چھوڑ دیتے تھے کہ ہمیں اس میں دینِ برحق کی نشانیاں نہیں ملتیں تاکہ عرب کے ان پڑھ اُمّی ان نام نہاد عالموں کے ”بغور مطالعۂ اسلام“ کے نتائج سن کر شک وشبہے میں پڑ جائیں لیکن ان کی یہ سازش اس واسطے کامیاب نہ ہوسکی کہ سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تھے جن کے دل کی گہرائیوں میں ہدایت کا نور اُتر چکا تھا اور ایسی عیارانہ حیلہ سازیوں اور دجّالی مکروفریب سے خدا کے ان سچے عاشقوں کو ان کے عقیدے اور نظریے سے ذرہ بھر بھی نہ ہٹایا جاسکتا تھا..... لہٰذا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس جماعت جس طرح مشرکین کی طرف سے دی گئی جسمانی تکالیف، جلاوطنی، قتل وغارت اور مال وجان کے ضیاع کے سامنے استقامت کا پہاڑ بن کر ڈٹی رہی، اسی طرح یہود کی ”عالمانہ تحقیق“ (آج کی زبان میں یہود نواز پروفیسروں اور اسکالروں کی سائنٹیفک

اسلامک ریسرچ) بھی ان کی خدا ورسول سے محبت وعقیدت اور دین اسلام سے تمسک واستقامت میں ذرہ بھر اثر نہ ڈال سکی۔

حزب الشیطان کا کردار:

خیر القرون گزرنے کے بعد یہود کے اس طریقہ واردات نے ایک خطرناک شکل اختیار کرلی جس کے لیے ''مستشرقین'' کے گروہ کھڑے کیے گئے۔ انہوں نے دینِ اسلام کے انہدام اور مسلمانوں کا قرآن وسنت سے ربط توڑنے کے لیے ''تلبیس حق وباطل'' کا حربہ آزمایا اور علوم اسلامیہ کا گہرائی سے مطالعہ کرکے ایسی لایعنی بحثوں اور خالی از فائدہ تحقیقات کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جن میں غوطہ زنی کرکے سر کھپانے والا آج تک کچھ لے کر واپس نہیں آیا۔ یہ شیطانی طریقِ کار انہوں نے عیسائیت پر بھی آزمایا تھا اور عیسائیت اس کی تاب نہ لاتے ہوئے گم شدہ بھیڑوں کی طرح آج تک بھٹک رہی ہے لیکن اسلام چونکہ آخری دین اور قرآن پاک آخری کتاب ہے اس لیے یہود کی یہ ابلیسی جدوجہد مسلمانوں میں چند باطنی فرقے پیدا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کرسکی اور اُمت مسلمہ کا سوادِ اعظم ان کی اس فتنہ خیزی سے محفوظ رہا، لیکن جس طرح شیطان بار بار رسوا ہونے کے باوجود اپنے کرتوتوں سے باز نہیں آتا، یہودیت بھی حزب الشیطان کا کردار ادا کرتے ہوئے آج تک یہی حربہ آزماتی جارہی ہے۔ مسلمان معاشروں میں ایسے ڈاکٹروں، اسکالروں اور پروفیسروں کی کمی نہیں جو یورپ وامریکا جاکر ان یہودی مستشرقین سے اسلامی علوم میں کسب کمال کرتے ہیں اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ساتھ حق وباطل کا ایسا ملغوبہ لے کر لوٹتے ہیں جو آج کل کی اصطلاح میں ''ماڈرن اسلام'' کہلاتا ہے جبکہ اس پر ''یہودی اسلام یا اسلامی یہودیت'' کا نام سجتا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ وہ سلوک کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے عیسائیوں کے ساتھ ''عیسائی یہودیت یا یہودی عیسائیت'' ایجاد کرکے کیا۔ سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، غلام احمد قادیانی، غلام احمد پرویز، محمد عبدہ، طہٰ حسین، ضیاء گوک الپ، عبداللہ چکڑالوی، نیاز فتح پوری، گوہر شاہی، بابر چودھری، فرحت ہاشمی اور شیخ محمد انہی کوششوں کا شاہکار ہیں اور اب تو خیر سے اس فوج ظفر موج میں یہودی استادوں کی شاگرد خواتین بھی شامل

ہونا شروع ہوگئی ہیں جو اسلام کی سب سے بڑی خدمت اس کو سمجھتی ہیں کہ کسی طرح پاکستان میں ''خواتین کی پہلی مسجد'' تعمیر کر لی جائے جو اسلام کی تاریخ کا انوکھا حادثہ ہوگا۔

ایک خطرناک مرض:

چونکہ یہودیوں کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے متعلق تمام باتوں حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی بظاہر غیر اہم نظر آنے والی جزئیات سے پوری طرح واقفیت حاصل کرتے ہیں پھر اپنی جملہ قوت کو مجتمع کر کے معرکے میں جھونکتے ہیں اس لیے برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) جیسے اسلامیات اور علوم شرقیہ کے ماہرین کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام اور عالمِ اسلام کا بے حد گہرائی سے مطالعہ کریں اور ضرورت پڑنے پر اپنے منصوبہ سازوں کی بروقت اور درست رہنمائی کریں جیسا کہ انہوں نے اس سے قبل عیسائیوں کے خلاف معرکہ آرائی کے وقت یورپ اور اس کی نفسیات سے متعلق تمام جزئیات سے آگاہی حاصل کر کے اسے تہس نہس کر ڈالا لہٰذا آج کا یورپ دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں کو تو پالتا ہے لیکن خود اپنی معیشت، سیاست اور سماج سے اس نے عیسائیت کو دیس نکالا دے دیا ہے۔ ہمارے ہاں کے مدبر اور دانشور حضرات کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ مغرب کی نفسیات کا بغور مشاہدہ کر کے ان کی جزئیات کو اہل اسلام تک منتقل کرنے سے زیادہ اس بات پر توجہ دیتے ہیں کہ عالم اسلام کی باریک سے باریک بات کو مغربی زبانوں میں منتقل کر کے ان مستشرقین کا کام آسان کر دیں جو میدان میں اترنے سے پہلے اس کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عادت دراصل اس مرض کا حصہ ہے جو مسلمانوں کی اکثریت کو اس وقت لاحق ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنی زندگی بدلیں، دوسروں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ ہم میں کا ہر فرد پورے اخلاص اور خیر خواہی سے دوسرے مسلمانوں کو راہِ راست پر دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسروں کے پڑھنے کے لیے اذکار اور مناجات کے مجموعے چھاپتا ہے، غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی سوچتا ہے، ان تک اسلام کے اچھے پہلو پہنچانا چاہتا ہے جبکہ خود اس بات کا خواہش مند ہے کہ جتنی جوانی، دولت اور فرصت تفریحات میں لگ جائے، غنیمت ہے۔ اپنے اوقات کی حفاظت، اپنے عیوب کو بے جگری سے ٹٹولنا اور دل کڑا کر کے ان کے ازالے پر محنت کرنا اور اگر کوئی عیب کی نشاندہی کرے تو اس کا شکر گزار ہونا ہمارے اسلاف کا وہ وصف تھا جس نے انہیں اوجِ کمال تک پہنچایا تھا۔ ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس بات کا منتظر ہے کہ دوسرے مسلمان صحیح ہو جائیں اور اسلام کو دوبارہ غالب کر دیں اور

خود وہ کان ڈھانپ کر من موجیوں میں غرق رہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے معرکہ کارزار کی گرمی کے وقت آگے بڑھ کر قربانی دینے کی بجائے ہر شخص یہ سوچے کہ ساتھ والے مورچے کے ساتھی کچھ کر دکھائیں گے، ہمارا تو یہاں موجود رہنا ہی کافی ہے..... اس سے کیا نتیجہ نکلے گا.....؟ ویسا ہی جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں اور جس سے چیخ و پکار کی فضا تو قائم رہ سکتی ہے مگر قوموں کی تقدیر بدلی نہیں جاسکتی۔

پانچویں حصے کا خطرہ:

بات برنارڈ لیوس کی ہو رہی تھی۔ اس نے پچھلی صدی کی آخری دہائی میں جو بیسویں صدی کی طوفان خیز دہائی کہلاتی ہے، ۲/مئی ۱۹۹۰ء کو این برگ انسٹیٹیوٹ فلاڈلفیا میں لیکچر دیتے ہوئے مغرب کو آگاہ کیا: ''دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ مغرب اور بطور خاص امریکا اور مغربی نظام کا دشمن ہے۔'' لیکچر میں پیش کیے گئے اعداد و شمار اور دیگر بحثیں اسی ایک جملے کی تشریح تھے۔ پانچویں حصے سے مراد مسلمان تھے اور مغرب کے ساتھ ان کی دشمنی ثابت کرنے سے اس یہودی عالم کا مقصد یہ تھا کہ مغرب کی زندگی کی ضمانت اس بات میں ہے کہ اس پانچویں حصے کو پوری طرح کچل ڈالے اور ان کی قوتوں کے مراکز پر براہِ راست تسلط حاصل کرلے۔ خصوصاً وسائل، ذرائع پیداوار، تجارت، بحری و فضائی گزرگاہوں، ذرائع ابلاغ و ترسیل اور بالخصوص سیاست و معیشت کو پوری طرح اپنے قبضے اور اختیار میں لے لے۔ اس طرح کے زہریلے خیالات کا اظہار اس نے چند ماہ بعد اسٹین فورڈ یونیورسٹی پاؤلو آلٹو میں ایک لیکچر کے دوران دوبارہ کیا۔ اس مشہور یہودی دانشور کی طرف سے مغرب کے سامنے واویلا کرنے اور اس کو ابھارنے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اس وقت ملت اسلامیہ کے علاوہ یہود کا کوئی حریف نہیں۔ وہ ساری دنیا کے عقائد و نظریات اور اخلاقیات و روایات کو روند کر یونی پولر سسٹم (یک قطبی نظام) کو متعارف کروا چکے ہیں، جو دجّال کے دعوائے خدائی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ سوائے مسلمانوں کے دنیا کی آبادی کی اکثریت کو اپنے پیٹ اور شرمگاہوں کے تقاضوں کی تکمیل سے آگے کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جینے کی فکر نہیں۔ یورپ کے عوام کی اکثریت ہفتے کے پانچ دن زیادہ سے زیادہ کمانے اور دو دن اسے بہتر سے بہتر مزے میں اُڑانے سے

آگے کی کوئی بلند سوچ نہیں رکھتی۔ یہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت ہے جو خود کو اور ساری دنیا کو ربانی نظام کی برکتوں سے فیضیاب کرنے اور ابلیس کی پیروکاری اور ہلاکت سے بچانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ دجّال کی عالمی حکومت کے قیام کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے اگر اس کرۂ ارض پر کوئی خطرہ ہے تو وہ اُمّت مسلمہ ہے۔

دو خبریں، سنگین حقائق:

مسلمانوں کے سوا دنیا کی تمام قوتوں کی قسمت میں صہیونی استعمار کی حاشیہ برداری کے سوا کچھ نہیں۔ اس طاغوت سے پنجہ آزمائی کی ہمت اور ضروری شرائط مسلمانوں بالخصوص جوہری طاقت اور دو عشروں سے زیادہ عملی جہاد کا تجربہ رکھنے والی پاکستانی قوم کے علاوہ کسی اور قوم میں نہیں پائی جاتیں۔ اس لیے روئے زمین پر ابلیسی قوتوں کے سب سے بڑے مرکز اسرائیل کو کوئی اور ملک تسلیم کرے یا نہ کرے، اسے مسلمان ملکوں سے خصوصاً پاکستان سے تسلیم کروانا دجّال کے کفریہ طاغوتی نظام کے علمبرداروں کی اشد ضرورت ہے۔ یہود کے ذہین دماغ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ عالمِ اسلام پر سیاسی، عسکری اور اخلاقی حملوں میں پورا زور خرچ کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی اپنے مرکز (اللہ، رسول، قرآن وسنت اور حرم مکی ونبوی) سے وابستگی حسب توقع کمزور نہیں ہو سکی بلکہ ان میں بے چینی اور بہتری کی تلاش وطلب بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے اس لیے وقت یہود کے ہاتھ سے نکلا چلا جا رہا ہے اور یہ خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ اگر نئے عالمی طاغوتی نظام کو جو دراصل دجّالی حکومت کا پیش خیمہ ہے، فوری طور پر پوری قوت سے نافذ نہ کیا گیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ ممکن ہے کہ بعض قارئین کو یہ سب باتیں فرضی یا مبالغہ آمیز معلوم ہوں لیکن اگر وہ درج ذیل دو خبروں پر نظر ڈال لیں تو انہیں حقائق کی سنگینی کا کسی قدر احساس ہو جائے گا۔

(۱) بحیرۂ عرب کے ساحل پر واقع بلوچستان کے علاقے جیوانی میں (جو دنیا کی اہم ترین بحری گزرگاہ کے منہ پر واقع ہے) جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا امریکی بحریہ اور فضائیہ کا اڈا تعمیر کیا جا رہا ہے جس سے علاقے میں جہاز رانی، تیل کی ترسیل اور تجارت کو کنٹرول کیا جائے گا اور پھر وسط ایشیا تک با آسانی رسائی کا ذریعہ بننے والا یہ اہم حصہ عملاً بلوچستان سے الگ کر لیا

جائے گا۔ (خبر میں یہ وضاحت نہیں کہ بلوچستان سے عملاً الگ ہونے کے بعد...... نہر سوئز کے بعد...... دنیا کا یہ اہم ترین جغرافیائی حصہ کس کے ساتھ ہوگا؟)

(۴) وزارت خزانہ اور اسٹیٹ بینک نے مبینہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر امریکی بینکوں میں رکھے جائیں گے۔

آپ خود فرمائیے! اُمت مسلمہ کا اہم ترین رکن، جوہری اسلامی طاقت کا حامل اور جذبۂ جہاد کی لازوال طاقت رکھنے والا ملک جس پر ساری اسلامی دنیا کی نمایندگی، ترجمانی اور سرپرستی کی اہم ذمہ داری ہے، وہ سیاسی اور معاشی طور پر خود کو یوں خدا اور انسانیت کے دشمنوں کے ہاتھ ثمن قلیل کے عوض (بلکہ اب تو ثمن قلیل بھی نہیں رہا) گروی رکھ دے اور جس شیطانی طاقت کے مقابلہ کرنے کا منصب اسے سونپا گیا تھا اسے تسلیم کرنے کی تیاریاں شروع کر دے، غمزدہ مسلمانوں کے آنسو پونچھنے، ان کا حوصلہ بڑھانے اور ان کا انتقام لینے کی بجائے عراق میں دجّالی ریاست کے پھیلاؤ کے لیے برسرپیکار امریکی فوجیوں کو ذلت آمیز شکست سے بچانے کے لیے ان کی مدد کو جانا قبول کر لے، اسے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور مستجاب الدعوات نیک بندوں کی نظر سے گرنے سے کون روک سکتا ہے......؟ پر ایسا لگتا ہے کہ ہم نے تہیہ کر رکھا ہے کہ نہ اپنی کارکردگی پر نظر ثانی کریں گے نہ اپنا احتساب کریں گے، نہ خود کو نجات اور ترقی کی راہ پر لائیں گے بلکہ طرح طرح کے حیلوں سے اپنی بے راہ روی، جمود اور تعطل کو سند جواز فراہم کرتے رہیں گے۔

قیام کے وقت سجدہ:

خلافت عثمانیہ اور مغلیہ سلطنت کے سقوط کے بعد اُمت مسلمہ کی بدقسمتی رہی ہے کہ جب قیام کا وقت آیا وہ سجدے میں گر پڑی۔ قیام پاکستان کے وقت اگر مسلمان ہمت کر کے سری نگر ایئر پورٹ تک پہنچ جاتے تو آج کشمیر جنت نظیر کو بنیئے کی کالی زبان اپنا اٹوٹ انگ کہنے کی جرأت نہ کر سکتی۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء، پھر ۱۹۶۵ء اور پھر ۱۹۹۹ء میں اکھنور اور کارگل میں ایسے مواقع آئے کہ دشمن کی دکھتی رگ انگوٹھے تلے آ گئی تھی مگر عین اس وقت ہمارا انگوٹھا خود دکھنے لگ گیا۔ آج پھر پاکستان کو خدا نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ وہ اُمت مسلمہ کا دل، دماغ اور دست و بازو ہے۔ اگر یہ ایمان وعزم اور ہمت وحوصلہ سے کام لے تو اسے تاریخ عالم میں سنہرا اور ناقابل فراموش مقام مل سکتا ہے لیکن یہ اُمت محمدیہ

کے اس دشمن کے سامنے جس سے ٹکراؤ ناگزیر ہے، سینہ تاننے کی بجائے اسے سینہ سے لگانے کی فکر میں ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت جس ملت دشمن فرقے نے کشمیر گنوا کر مسلمانوں کا راستہ کھوٹا کیا آج وہی اسرائیل کو تسلیم کروانے کے لیے سرگرم ہے۔ کشمیر لینے کے لیے پیش قدمی کرنے والی مجاہدین کی جماعت کو قادیانی فرقے کا ایک شخص جنگلوں میں اس وقت تک بھٹکاتا رہا جب تک بھارت کی چھاتہ بردار فوج سرینگر ایئرپورٹ پر نہیں اتر گئی۔ آج فلسطینی مسلمانوں کے قاتل اور پوری دنیا میں مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور پاکستان کے خلاف تباہ کن سازشوں کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دینے کی کوشش کرنے والے اسرائیل کو نیا قادیانی سربراہ مرزا مسرور احمد تسلیم کروانے کے مشن پر نکلا ہوا ہے۔ یہود کے عالمی قائد دجّال کو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''لُدّ'' شہر کے دروازے (کسی شہر کا ایئرپورٹ اس کا دروازہ ہوتا ہے) پر قتل کریں گے (لُدّ اسرائیلی دارالحکومت کے مضافات میں ہے اور وہاں آج کل اسرائیل کا بین الاقوامی ایئرپورٹ ''بن گوریان انٹرنیشنل ایئرپورٹ'' ہے) حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات کا انکار کرنے اور ہر موقع پر یہود کا ایجنٹ بن کر پاکستان اور اُمّت مسلمہ کے مفاد کو نقصان پہنچانے والے اس مرتد فرقے کا انجام بھی لگتا ہے کہ یہود سے زیادہ بدتر ہوگا کیونکہ یہ ان دو فرقوں میں سے ہے جن کو صہیونی دماغوں نے مخصوص مقاصد کے تحت اسرائیل میں بسنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ چناب نگر میں ریاست کے اندر ریاست قائم کر کے یہودی آقاؤں کی خوشنودی ڈھونڈنے والو! جس کے ساتھ جیو گے حشر بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہود پہلے خود ساری دنیا سے سمٹ کر ارضِ فلسطین میں جمع ہوئے پھر اپنے ساتھ مشہور یہود نواز فرقوں (بہائی اور قادیانی) کو بھی ریاست دجّال کے پایۂ تخت میں مرکز بنا کر دیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کرۂ ارض سے مردود انسانوں کے صفایا کے لیے اُلٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ دیکھیے! ہاتفِ غیبی کس رفتار سے ان ہندسوں کو گن کر پورا کرتا ہے؟

کاسابلانکا سے اسرائیلی پارلیمنٹ تک

محبوب شریکِ کار:

مقصد کی ہم آہنگی کبھی کبھی تاریخی دشمنوں کو بھی یکجا کر دیتی ہے۔ اس کی بڑی مثال آج کی عیسائی دنیا کا اپنے قدیم ترین دشمن یہود کے ساتھ وہ اتفاق و اتحاد ہے جو اسرائیل کے استحکام اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ گزشتہ دو ہزار سال سے عیسائیوں کے ہاں دنیا کی مبغوض ترین قوم یہود تھی مگر اب وہ اسے ''محبوب شریکِ کار'' (Philo Esmitism) کا نام دیتے ہیں۔ یہ نفرت محبت میں اور یہ دشمنی شرکت کار میں کیسے تبدیل ہوئی؟ اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے۔ یہ تبدیلی کسی احساسِ جرم کے تحت نہیں ہے کہ ماضی میں عیسائیوں نے یہود کو میراثی کے ڈھول کی طرح پیٹا اور نہ اس لیے کہ یہود کا مختلف مواقع پر بڑی تباہی اور قتلِ عام (Holocaust) ہوا بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جس کا سمجھنا آج کے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر مغرب کے مسلم کش اقدامات اور اسلام دشمنی پر مبنی نفسیات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

دنیا پرست پیشوائیت:

یہود کے لیے افراد کی قلت ہمیشہ سے مسئلہ رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کے ہاں اولادِ نرینہ کا کم پیدا ہونا ہے۔ (اس وقت دنیا میں نرینہ بچوں کی سب سے کم شرح پیدائش یہود میں اور سب سے زیادہ فلسطینی مسلمانوں میں ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ کی کھلی نشانی ہے) دوسری وجہ یہودیوں پر وقتاً فوقتاً عذاب کا نازل ہوتے رہنا ہے جس میں ان کے اچھے دماغ اور

صحت مند جسم ختم ہو جاتے ہیں اور تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ کسی انسان کا یہودیت میں داخلہ قبول نہیں کرتے۔ یہودیت دنیا کے ان دو مذاہب میں سے ایک ہے جس کا مدار روحانیت اور پاکیزگی پر نہیں بلکہ نسل پرستی اور تعصب پر ہے۔ یہ دو مذاہب اپنی تعلیمات کو انسان کی نجات کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، لیکن ایک مخصوص نسلی گروہ کے علاوہ دوسرے انسانوں کو اس سے فیضیاب نہیں ہونے دیتے کیونکہ وہ بقیہ سب انسانوں کو جانور، اچھوت اور نجات کے لیے ناقابل سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم ان مذاہب کے بانیوں کی نہیں ہوسکتی، یہ تو بعد کے دنیا پرست پیشواؤں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں اور یہ جاہل پیشوائیت یہود اور برہمن دونوں میں وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ تو بات یہ ہو رہی تھی کہ یہود کے لیے قلتِ تعداد بڑا مسئلہ رہا ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے یہ ہمیشہ کسی نہ کسی کندھے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ قرآن کریم نے سورہ حشر میں بزدلی اور عیاری پر مشتمل ان کی اس نفسیات کو انتہائی خوبی اور بلاغت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ اپنی اس عادت کے پیش نظر عیسائیت کے ہاتھوں صدیوں تک مار کھانے اور ذلت سہنے کے بعد انہوں نے اس پر ایسی چوٹ لگانے کا ارادہ کیا جو اس کی جڑوں کو ہلا دے اور اس میں ایسے فرقے پیدا کر دے جو یہود کے ہمنوا ہوں۔ یہ ایسا خطرناک انتقام تھا جس کے سامنے عیسائی پیشوائیت رُل کے رہ گئی اور اب ہم جسے عیسائی دنیا کے نام سے پکارتے ہیں وہ درحقیقت یہود کی روندی ہوئی دنیا ہے۔

احتجاج کا جرثومہ:

یہود نے پہلا کام یہ کیا کہ انہوں نے عیسائیوں کے ایک طبقے میں ''احتجاج'' کا مرض پیدا کر دیا یعنی کسی بھی قائم اور موجود صورت، کیفیت، عقیدہ و نظریہ اور ادارہ، تنظیم و ثقافت کے خلاف قولی و عملی احتجاج اور اس سے علیحدگی .... جب یہ مزاج پختہ ہو جاتا ہے تو بعد میں جب نیا عقیدہ اور نظریہ کی صورت و کیفیت وغیرہ قائم اور موجود ہو جائے تو اس کے خلاف بھی قولی و عملی احتجاج خود بخود وجود میں آ جاتا ہے۔ احتجاج کا یہ جرثومہ کسی منزل پر اپنا کام نہیں چھوڑتا لہٰذا پروٹسٹنٹ نام کے جو عیسائی سولہویں صدی میں احتجاج کرتے ہوئے عیسائیت کے مرکز، رومن کیتھولک چرچ سے علیحدہ ہو گئے تھے، اب تک خود احتجاج در احتجاج کے عمل کے

نتیجے میں درجنوں ذیلی طبقات میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ پروٹسٹنٹ نامی اس فرقے کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اتفاق صرف اس بات پر ہے کہ عقیدہ ہو یا ثقافت، جب کوئی بات موجود اور رائج ہو جائے تو ان کا اس پر اتفاق نہیں رہتا البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو ان کے تمام گروہوں میں مشترک و متفق ہے اور وہ ہے یہودیت، اس کے صحائف اور اس کے عزائم، اس کی رسوم اور مقاصد حتیٰ کہ یہودی جذبات کی حمایت و مدافعت اور ان کی مخالفت کو خدا اور اس کے تکوینی مقاصد کی مخالفت سمجھنا۔ امریکا میں اس فرقے کی اکثریت ہے۔

پوپ صاحب سے ایک سوال:

مذہبی روایات اور رسوم کے خلاف احتجاج کے بعد دوسرا نظریہ پیش کیا گیا کہ کلیسا اور پادری کی ضرورت نہیں ہے، کتابِ مقدس کا خود مطالعہ کرنا چاہیے۔ اللہ اور بندے کے درمیان کسی دوسرے بندے کو واسطہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ہر شخص کو خود تحقیق کر کے قرآن و حدیث............اوہ! معاف کیجیے گا! خداوند کا مقدس کلام سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب یہ نظریہ چل پڑا تو عیسائیوں کے ایک ذہین فرد اسکوفیلڈ کو خرید کر اس سے بائبل کی نئی شرح لکھوا کر اس کی بڑے پیمانے پر اشاعت کروائی گئی۔ یہ تقریباً ایسی ہی صورت حال تھی جیسے کہ کچھ عرصہ قبل قرآن مجید مترجم کے نام سے بغیر عربی متن کے صرف ترجمہ چھاپ کر کثیر تعداد میں پاکستان بھر میں تقسیم کیا گیا تھا تاکہ ”مطالعۂ قرآن تحریک“ فروغ پاسکے۔ وہ تو خدا کا کرم ہوا کہ علمائے کرام کی بروقت گرفت کے سبب یہ فتنہ تھم گیا ورنہ اگر ہر جدت پسند مفسر اپنا مجرد ترجمہ و تفسیر چھاپنا شروع کر دیتا تو نوبت جانے کہاں تک پہنچتی) اس شرح میں جابجا یہودی عقائد داخل کر دیے گئے تھے۔ اب ہوا یوں کہ قدیم متن مشکل اور جدید حاشیہ آسان تھا، لہٰذا مشکل متن کی بجائے آسان حاشیے کا رواج ہوا اور اس نئی بائبل کے ذریعے یہودی عقائد عیسائیوں میں پھیلتے چلے گئے۔ متعصب عیسائی پادریوں کے دلوں میں بھی یہود کی قربت اور ہمدردی پیدا ہوتی گئی، حتیٰ کہ قدیم عیسائیت سے روگردانی، آزاد خیالی اور عیسائی اکابر کی تعلیمات کی تقلید کی بجائے من مانی تشریحات ماننے کے نتیجے میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۵ء کا حادثہ پیش آیا۔ یہ وہ دن تھا جب رومن کیتھولک عیسائیت جو اصل بنیاد پرست عیسائیت تھی، بھی یہودیت کے آگے ڈھیر

ہوگئی اور ویٹی کن ثانی کے ایک حکم نامے Nostra Nation کے تحت عیسائیت کے ایک بنیادی عقیدے اور عبادت کو یکسر ختم کر دیا گیا۔ اس سے پہلے پوری عیسائی دنیا کا متفقہ عقیدہ تھا کہ یہود (نعوذ باللہ) خدا (یعنی حضرت مسیح علیہ السلام) کی قاتل قوم (Diecide Nation) ہے۔ لہٰذا یہودیوں پر لعنت بھیجنا ان کی عبادت کا اہم ترین جز تھا۔ یہ عقیدہ اور عبادت قدیم عیسائیوں یعنی رومن کیتھولک چرچ میں باقی رہ گئی تھی مگر پوپ کے ایک حکم سے یہ بھی موقوف ہوگئی اور جمعہ حزنیہ یا عید فصح (Good Friday) کے نام سے کی جانے والی وہ مخصوص اور اہم ترین عبادت جو انیس صدیوں سے عیسائیت کے لوازمات میں سے تھی اور اس میں یہودیوں پر علانیہ طور پر لعنت بھیجی جاتی تھی، ختم کر دی گئی اور انہیں قتلِ مسیح کے جرم سے بری الذمہ قرار دے دیا گیا۔ اس موقع پر ہم جناب پوپ سے یہ تو نہیں پوچھتے کہ کسی عقیدے یا عبادت کو موقوف کرنے کا حق انہیں یا کسی اور انسان کو حاصل ہے یا نہیں؟ لیکن ان سے یہ سوال کرنے میں پوری دنیا حق بجانب ہے کہ وہ کسی تاریخی حقیقت کو کیسے بدل سکتے ہیں؟ جب یہ بات انسانی تاریخ کی متفقہ اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہود نے سچے مسیح سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناقابلِ بیان اذیتیں دی تھیں، ان کو نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ ولد الحرام کہا، ان کے قتل کا فتویٰ جاری کیا، انہیں کانٹوں کا تاج پہنا کر پھانسی کا جلوس نکالا، راستے میں بے حد و حساب گستاخیاں کیں، مسیحی عقیدے کے مطابق انہیں ہاتھ پاؤں میں سات سات انچ کی لمبی کیلیں ٹھونک کر سولی پر چڑھا دیا۔ حضرت یسوع المسیح علیہ السلام کا یہودیوں کے ہاتھوں صلیب دیا جانا عیسائیوں کا ایسا عقیدہ ہے جو ان کی پہچان اور ایمان و یقین کا ایسا جز و لاینفک ہے کہ صلیب کے بغیر عیسائیت کا تصور کوئی معنیٰ نہیں رکھتا............ حتیٰ کہ چاروں بائبل میں اس کا ذکر ہے............ اس تاریخی حقیقت کو پوپ صاحب یا کوئی دوسرا شخص کیسے بدل سکتا ہے؟

اسرائیلی مولویوں کی کھیپ:

اب تک تو معاملہ بائبل کی تشریح کی حد تک تھا۔ اگلا قدم اس سے بھی خطرناک اٹھایا گیا، مارٹن لوتھر سے پہلے کتابِ مقدس صرف انجیل پر مشتمل ہوتی تھی، اس نے تورات کو بھی اس کا حصہ بنایا۔ اس کی تحریک سے عیسائی تورات کی عصمت و صداقت پر ایمان لائے، اسے دل

سے وحی تسلیم کرکے اس سے براہِ راست رجوع کرنے لگے، اور اسے ''قدیم عہد نامہ'' کے نام سے کتاب مقدس بائبل کا حصہ بنالیا گیا، انجیل کو ''نیا عہد نامہ'' کی خوبصورت اصطلاح دی گئی۔ (ہمارے ہاں بھی عیسائی مشنریوں کو آپ دیکھتے ہوں گے کہ خدا کا مقدس کلام پڑھنے کی دعوت اس عنوان سے دیتی ہیں کہ مطالعہ تو ہر مذہب کا کرنا چاہیے) تورات اور بالخصوص اس کے محرّف اور تبدیل شدہ حصوں کے مطالعوں سے عیسائی دنیا میں نئے مذہبی رجحانات کی لہر چلی اور وہ رفتہ رفتہ اس امر کے قائل ہوتے چلے گئے کہ فلسطین یہودیوں کی سرزمین ہے اور اسرائیل کا قیام بائبل کی پیش گوئیوں کی تکمیل ہے، اسرائیل پر تنقید گویا بائبل کی تکذیب اور خدا پر حرف گیری کے مترادف ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان بائبل سوسائٹی کچھ عرصے سے کتابِ مقدس کا جو نسخہ چھاپ رہی ہے اس کے آخر میں ہیکل سلیمانی کا خیالی ماڈل بھی چھاپا جارہا ہے (اب تو پاکستان میں بھی اسرائیلی مولویوں کی ایک کھیپ پیدا ہوگئی ہے جو یہودی ربّیوں سے انٹرنیٹ پر گفتگو کا شرف حاصل کرنے کے بعد اس موضوع پر یہودی اسکالروں کے لکھے گئے مقالے اپنی طرف منسوب کرکے شائع کررہی ہے کہ ''مسجدِ اقصیٰ پر یہود کا حق ہے'' بلکہ اب تو مسجدِ اقصیٰ کے لفظ کا تکلف بھی ختم کردیا گیا ہے، اب تو وہ صاف صاف ہینک رہے ہیں کہ ''احاطہ ہیکل'' کی تولیت یہود کو ملنی چاہیے) یہ نظریہ رفتہ رفتہ اتنا پختہ ہوگیا کہ عیسائی خصوصاً امریکا و برطانیہ کے عیسائیوں میں یہود کے لیے ''محبت'' بلکہ ممنونیت اور تشکر کے جذبات پیدا ہوتے گئے کیونکہ ان کے خیال میں یہود دنیا بھر سے اسرائیل میں جمع ہوکر وہ کچھ کرتے جارہے ہیں جو خود عیسائیوں سے نہ ہوسکا یعنی اس جگہ سے مسلمانوں کا انخلاء ایک غیر مسلم ریاست کا قیام جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ ظہور ہوگا۔ چنانچہ یہ عیسائی اگرچہ یہود اور یہودیت کے لیے حقارت آمیز خیالات رکھتے ہیں لیکن یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ ''خدا امریکا پر محض اس لیے مہربان ہے کہ امریکا یہودیوں پر مہربان ہے۔'' اس نظریے کی بنیاد تورات کا یہ عہد ہے جس کی تعلیم بائبل کے ہر طالب علم کو دی جاتی ہے: ''اور (اے اسرائیل!) جو تجھے برکت دے میں اسے برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت بھیجے میں اس پر لعنت بھیجوں گا۔'' امریکا میں صہیونیوں کا سب سے بڑا عیسائی وکیل جیری فال ویل اپنے وعظوں میں کہتا پھرتا ہے: ''دینی لحاظ سے ہر عیسائی کو چاہیے کہ

اسرائیل کی حمایت کرے، اگر ہم اسرائیل کو تحفظ دینے میں ناکام رہے تو ہم خدا کے آگے اپنی اہمیت کھودیں گے۔'' ان کے خیال میں سارے عرب ''مسیح دشمن'' (AntichRist) ہیں اس لیے ان کو نہ صرف یروشلم (بیت المقدس) بلکہ مشرق وسطیٰ کے بیشتر خطوں سے نیست و نابود کردینا چاہیے کیونکہ خدا نے یہودیوں سے جو وعدے کیے ہیں، یہ ان کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ''بیشتر خطوں'' کے لفظ پر شاید قارئین نے غور نہ کیا ہوگا۔ اس سے مراد عراق، اُردن، شام، لبنان اور سعودی عرب کا مدینہ منورہ تک کا حصہ ہے جیسا کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کی اندر کی دیوار پر ثبت نقشہ میں دکھایا گیا ہے۔

خون آشام چمگادڑیں:

دیکھا آپ نے یہودیت کا دجّالی کمال! ''مسیح دشمن'' وہ خود تھے لیکن عیسائیوں کی اکثریت کو انہوں نے یہ باور کروادیا ہے کہ ''مسیح دشمن'' مسلمان ہیں لہٰذا اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنی تاریخی دشمنی بھُلا کر ایک بات پر اتفاق کرلیا ہے کہ مسلمانوں کو کسی طرح ختم کرو یا محکوم بناؤ، آپس کے جھگڑے ہم مسیح کی آمد کے بعد نمٹالیں گے۔ انہوں نے اگر عیسائیت کو برحق کہا تو فبہا اور اگر یہودیت کو دنیا پر غالب کیا تو بھی سرِ تسلیم خم۔ آج کل امریکی اور برطانوی عیسائیوں کی اکثریت اس ذہنیت کی حامل ہے اور یہ خطرناک جراثیم اس کے طبقۂ بالا میں بھی پوری شدت سے سرایت کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ امریکی صدر جارج واشنگٹن نے یہود کو خون آشام چمگادڑیں (Vampires) قرار دیا تھا لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ امریکی صدر بھی تحریف شدہ تشریحات کے شدت سے قائل ہوگئے۔ رونالڈ ریگن جیسے صدر کی بیشتر پالیسیاں ''اسکوفیلڈ بائبل'' کی پیش گوئیوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ اس کو یقین تھا کہ آرمیگاڈون کا معرکہ عظیم اس کے پہلے دورِ صدارت میں نہیں تو دوسرے میں ضرور پیش آئے گا۔ اس کے بعض مشیر تو بنیاد پرستی میں اس حد تک آگے چلے گئے تھے کہ ماحولیات کے تحفظ، خاندانی منصوبہ بندی اور خود اختیاری موت جیسے مسائل پر بحث کو وقت اور سرمائے کا ضیاع سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے داخلی پروگراموں میں تخفیف کرکے سرمائے کو آزاد کردینا چاہیے تاکہ آرمیگاڈون کی جنگ لڑنے کے کام آئے۔ ریگن کے نائب

جارج بش سینئر تھے، یہ اس معاملے میں ان سے بھی زیادہ پیش گوئی پرست تھے۔ آزاد چلن اور مشکوک کردار کے حامل بل کلنٹن نے تو برملا اعلان کیا تھا کہ اسرائیل کے تحفظ کے لیے کسی مورچے میں ڈیوٹی دینے کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ جارج بش جونیئر تو اپنے والد سے بھی زیادہ گورے نکلے ہیں۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ وہ یہود کی گود میں پلنے والے عیسائی فرقے پروٹسٹنٹ کی کٹر صہیونیت نواز شاخ ''ایونجلسٹ'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک فضائی سفر میں ان کو کوئی پادری نہ ملا تو محترمہ کونڈو صاحبہ سے دعائیہ سروس کروالی تھی۔ افغانستان کے خلاف حملوں کے وقت وہ اسے صلیبی جنگ (The Last Crusade) کہہ کر دل کی بات زبان پر لے آئے تھے لیکن پھر بوجوہ اسے گول کر گئے۔

سستے سودے اور مہنگے قرضے:

الغرض اب ایسا نازک دور آ گیا ہے کہ یہود عیسائیوں سے زیادہ اور عیسائی یہودیوں سے بڑھ کر مسلم دشمن بن چکے ہیں۔ یہ دونوں مل کر مسلمانوں پر وہ ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں جو کبھی ایک دوسرے پر استعمال کیے تھے یعنی مرد و زن کے آزادانہ میل ملاپ کا رواج، حکمرانوں کو خریدنے کے لیے سستے سودے کرنا اور ملکوں کو قابو کرنے کے لیے مہنگے قرضوں کے جال میں جکڑنا، میڈیا پر گرفت اور فحاشی و عریانی کا فروغ، سود، جوئے اور رشوت کا لقمہ ہر منہ میں پہنچانا تاکہ کسی کی دعاء و مناجات قبولیت کے قابل نہ رہے، نصاب میں تبدیلی خصوصاً یہود کی غداریوں اور ان کے خلاف غزوات کے تذکرہ کو حذف کرنا (پاکستان کے نئے نصاب میں چھٹی جماعت کی اسلامیات میں غزوۂ احزاب کی تفصیلات بدلنے کے علاوہ ''غزوۂ خیبر'' کی جگہ ''صلح خیبر'' کا عنوان رکھا گیا ہے۔ آغا خانیوں، بہائیوں اور قادیانیوں جیسے فرقوں کی پرورش اور سرپرستی کرنا، (اسرائیل میں صرف ان تین ''مسلمان'' فرقوں کو کام کرنے کی اجازت ہے) یہودی علماء سوء کے نام نہاد مسلمان شاگردوں کی کھیپ تیار کر کے مسلمان ملکوں میں انجیکٹ کرنا اور مسلم عوام کو علما و مشائخ سے فیضاب ہونے کی بجائے ان فارمی ڈاکٹروں، پروفیسروں اور اسکالروں سے استفادے کی اہمیت جتانا، مذہب میں نت نئی بحثیں اٹھا کر اہلِ علم کو ان میں مشغول کرنا اور فروعی مسائل کو دین و ایمان کا مسئلہ بنانا، بین

الاقوامی کاروبار پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے کنٹرول حتیٰ کہ دیہات میں بھی لوگ مٹکے کی جگہ فریج استعمال کرنے لگے ہیں، کچی لسّی اور ٹھنڈائی کی جگہ پیپسی اور کوک پینے لگے ہیں، گرمی میں ٹھنڈک دینے والی مہندی کی جگہ کیمیاوی مادوں سے بنا ہوا ہیئر کلر استعمال کرتے ہیں۔

اندر کا دشمن:

ان دونوں قوموں کے پاس جتنے وسائل تھے اور انہوں نے جس طرح بے دریغ انہیں استعمال کیا اس حساب سے تو مسلمانوں کو اب تک ٹھکانے لگ جانا چاہیے تھا مگر اسلام چونکہ عیسائیت کی طرح چند رسوم اور دعاؤں کا مجموعہ نہیں کہ یہودیت کے آگے جلد ڈھیر ہو جائے...... یہ ایک متحرک، زندہ اور عملی مذہب ہے، مسلم عوام کا اپنے علمائے کرام، مساجد اور قرآن پاک سے تعلق ہے، ان کو دینی مدرسے اور خانقاہیں دینی غذا فراہم کرتے رہتے ہیں اور ان کے علمائے کرام بیدار مغزی سے کام لیتے ہوئے باطل فتنوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور شیخ محمد، بابر چوہدری، جاوید غامدی اور فرحت ہاشمی جیسے لوگوں پر نظر رکھتے ہیں، اس لیے مسلمان انتہائی سخت جان ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی زبردست مزاحمت نے دشمن کو بوکھلا دیا ہے۔ پھر قربان جائیے جہاد اور مجاہدین سے جن کے لہو نے اسلام کے چراغ کو نہ صرف بجھنے سے محفوظ رکھا ہے بلکہ اس کی روشنی کو تیز تر کرنے کی جدوجہد جاری رکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ یہودیت نئے یروشلم کے کاسا بلانکا (کاسا بلانکا کے معنی قصرِ ابیض کے ہیں جو یہودی مذہبی داستانوں کے مطابق ان کی نئی مقدس آبادی کا صدر مقام ہے۔ امریکا کی صدارتی رہائش گاہ وہائٹ ہاؤس کے معنی قصرِ ابیض ہیں) سے ہیکل کی طرز پر قائم اسرائیلی پارلیمنٹ تک کا سفر کر چکی ہے مگر وہاں سے القدس کی چٹان تک کے راستے میں ہر ہر قدم پر اسے زبردست مزاحمت کا سامنا ہے۔ اس مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے اسرائیل کو مسلم ممالک سے تسلیم کروانے اور قضیۂ فلسطین کو پوری دنیا کے مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ کی بجائے عربوں کا سیاسی مسئلہ باور کرانے کی کوشش جاری ہے۔ دجّال کے پیروکار اپنے پیشوا کے مخصوص دجل سے کام لیتے ہوئے حالات کو اپنے ڈھب پر لانے میں مصروف ہیں۔ اب یہ مسلمانوں کے امتحان کا وقت ہے کہ وہ سود، جوئے، فحاشی اور دروغ گوئی

و بددیانتی کے اس طوفان میں بہہ جاتے ہیں یا کتاب وسنت سے اپنا تعلق مضبوطی سے قائم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو حرام کھانے اور حرام پہناوے سے بچائے رکھتے ہیں؟

اے مسلمانو! یادرکھو جو آج حرام میں ملوث ہوگا، کل اس کے قدم باطل کے مقابلے میں نہ جم سکیں گے۔ ایک حدیث کے مطابق دجّال کے خلاف جنگ میں صفِ آرا مسلمانوں کی افواج کا ایک تہائی حصہ بھاگ کھڑا ہوگا جسے اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جو سامنے کے دشمن پر غلبہ تو چاہتے ہیں لیکن اندر کے دشمن پر غلبہ نہیں پا سکتے۔

گش ایمونیم

اسٹینلے گولڈ فلیٹ جنوبی افریقہ کے ایک متوسط یہودی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس کا خاندان کٹر مذہبی تو تھا لیکن کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا۔ گولڈ فلیٹ کو بھی واجبی سی تعلیم کے بعد کاروبار کے ’’یہودی گُر‘‘ سیکھنے کے لیے تجارتی پنڈتوں کے حوالے کر دیا گیا۔ گولڈ فلیٹ نے جب یہودی بڑوں کے پاس آنا جانا شروع کیا تو ان زمانہ شناس اور گھاگ کاروباریوں نے اس کے والد کو رپورٹ دی کہ تعلیم کی طرح اس کا ذہن کاروبار میں بھی نہیں چلتا، یہ تو کُند ذہن اور کاہل سانڈ کی طرح غبی اور از کار رفتہ ہے۔ گولڈ فلیٹ کے لالچی اور بخیل والد کو اس سے بڑی تشویش ہوئی، وہ آخری عمر میں اپنے اردگرد بہت سی دولت اور اسبابِ تعیش دیکھنے کا خواہش مند تھا اور اس کی چاہت تھی کہ جو اس کی ناآسودہ تمنائیں پوری نہ ہوئیں ان کو اس کا بیٹا اس کے لیے پورا کر دکھائے گا۔ اس نے بڑی کوشش کی مگر گولڈ فلیٹ کے وحشی مغز میں وہ جراثیم ہی نہ تھے جو علم و ہُنر سیکھنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ گولڈ فلیٹ نے آوارہ گردی شروع کر دی، اس کا اُٹھنا بیٹھنا اوباش یہودی لڑکوں کے ساتھ ہو گیا جو دنیا کی ہر بُرائی اس یقین کے ساتھ کرتے تھے کہ وہ خدا کی محبوب قوم کے بیٹے ہیں۔ اس کے والدین کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کی شامیں اور راتیں کہاں گزرتی ہیں؟ رفتہ رفتہ اس کا گھر آنا جانا کم ہو گیا یہاں تک کہ ایک دن اس کے والد نے سنا کہ وہ گش ایمونیم (Gush Emunim) والوں کے ہتھے چڑھ کر ’’وفاداروں کے دستے‘‘ (Block of the Faithful) میں شامل ہو گیا ہے اور جنوبی افریقہ سے نقل مکانی کر کے ’’میراث کی سرزمین‘‘ جا پہنچا ہے جہاں وہ اب یہودی نوآبادیوں میں رہتا ہے جن کے

باشندے سب سے پہلے ''مسیحا'' کا استقبال کرنے کا اعزاز حاصل کریں گے۔

''وفاداروں کا دستہ'' کیا چیز ہے؟ یہ ان متشدد اور جنوبی صہیونیوں پر مشتمل گروہ ہے جن کی زندگی کا واحد مقصد مسجدِ اقصیٰ کے صحن میں موجود مقدس چٹان پر قائم گنبد کو شہید کرنا ہے تا کہ اس چٹان پر تیز سرخ رنگ اور بے داغ کھال والے کم عمر و بے عیب سانڈ کی قربانی دی جا سکے۔ یہود بھی عجیب قوم ہے۔ جب سیدنا حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام ان کو گائے کی قربانی کا حکم سناتے تھے تو طرح طرح حیلے بہانے ان کی جان نہ چھوڑتے تھے۔ انہوں نے بے جا باتیں پوچھ کر اپنے مقدس نبی کو دق کر چھوڑا اور اب ہزاروں سال بعد انہیں قربانی کی رسم پوری کرنے کا سودا آ چڑھا ہے۔ ان کے ربّیوں کے مطابق یہ قربانی اس قربانی کی یادگار ہوگی جو (یہودی عقائد کے مطابق) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں اپنے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی بے مثال قربانی سے قائم ہوئی تھی (یہودیوں کے مطابق ذبیح اللہ، سیدنا حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں جنہیں اس پتھر پر راہِ خدا میں قربان کیا گیا تھا جبکہ مذہبی حقائق سے ہٹ کر تاریخی شواہد کے اعتبار سے بھی یہ بات کسی طرح درست ہو ہی نہیں سکتی) اس گروہ کے ارکان یہودی بھی ہیں اور عیسائی بھی۔ انہوں نے ''یروشلم ٹیمپل فاؤنڈیشن'' جیسے ملتے جلتے ناموں سے ایسی تنظیمیں بنا رکھی ہیں جو ٹیمپل ماؤنٹ (Temple Mount) کو ہیکل کی تعمیر کی غرض سے صاف کرنے کے لیے دنیا بھر کے یہودیوں سے لاکھوں ڈالر چندہ اکٹھا کرتی ہیں۔ ان تنظیموں کے ارکان زیادہ تر دریائے اُردن کے مغربی کنارہ (West Bank) میں ان زمینوں میں رہتے ہیں جو فلسطینی مسلمانوں کو قتل و غارت کے ذریعے جلاوطنی پر مجبور کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ اسرائیلی حکومت ان آبادیوں کے گرد اونچی اونچی ناقابلِ عبور دیواروں کے ذریعے حفاظتی حصار قائم کر رہی ہے۔ ان تنظیموں کی شدت پسندی اور دیوانگی کی حد تک پہنچے ہوئے دماغی سرسام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک رسوائے زمانہ تنظیم اسٹرن گینگ (Stern Gang) نے مہاجر کیمپوں میں مقیم مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے خون سے (نہتے لوگوں کو سامنے دیکھ کر یہود غراتا بھیڑیا بن جاتے ہیں) اس بے دردی کے

ساتھ ہاتھ رنگے کہ اس کی خبریں مغربی پریس میں پہنچنے سے مغربی دنیا پر بھی لرزہ طاری ہوگیا تھا اور ڈیوڈ بن گوریان جیسے یہودی نے بھی اس کو لاقانونیت کا مجرم ٹھہرا کر اس پر پابندی لگادی تھی حالانکہ اسرائیل کا یہ حکمران اپنی مسلم کش پالیسی اور شقاوتِ قلبی میں خود بھی بدنامی کی حد تک مشہور تھا۔ مسلمان تو چھوڑیے! اپنے محسن برطانیہ کے ساتھ ان سنپولیوں کا رویہ یہ تھا کہ اس تنظیم کے ایک جنونی ممبر نے القدس شہر کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں جہاں برطانوی فوجی اور سفارتکار ٹھہرے ہوئے تھے...... ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو محض اس وجہ سے بم رکھ دیا تھا کہ انگریز جلد از جلد فلسطین سے نکل جائیں اور یہود کو اپنی مشفقانہ سرپرستی سے آزاد کردیں۔ اس بم دھماکے میں برٹش سیکرٹریٹ اور عارضی فوجی ہیڈ کوارٹر تباہ ہوگیا تھا اور ۱۰۰ سے زائد انگریز اپنے پالے ہوئے سانپوں کے ہاتھوں اس انجام کو پہنچے تھے جو یہود کے ساتھ مہربانیاں کرنے والوں کا مقدر ہے۔ برطانوی حکومت کے سیکریٹریٹ میں بم رکھنے والا یہ ممبر جنوبی افریقہ کا تارک الوطن آوارہ دہشت گرد گولڈ فلیٹ تھا جو اپنے جیسے دیگر جنونیوں کے ساتھ مل کر اس مقصد کے لیے چندہ اکٹھا کرتا تھا کہ ارضِ موعود سے مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو ختم کردیا جائے تاکہ اس کے نتیجے میں ایسی خونی تباہی پھیلے کہ مسیحا کا ظہور قریب سے قریب تر آجائے۔

قارئین کو یہ بات حیرت انگیز لگی ہوگی کہ ان تنظیموں میں یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کا کیا کام؟ اس کا کچھ جواب ہم پہلے دے چکے ہیں اور کچھ کا آیندہ کے شماروں میں دیں گے۔ اسی طرح اکثر قارئین شاید سمجھ نہ سکے ہوں کہ ٹیمپل ماؤنٹ کی صفائی سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب ایک پہاڑی کے تعارف سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق یہودیوں کا کہنا ہے کہ جس کا قبضہ اس پر ہو، وہی القدس کا حکمران ہے۔ اس پہاڑی کا ذکر ان کے اس مشہور مقولے میں بھی آتا ہے: ''اسرائیل بغیر یروشلم کے بے کار ہے اور یروشلم بغیر ہیکل کے کسی کام کا نہیں۔'' وہ ہیکل اسی پہاڑی کے اوپر بنے گا اور اس پہاڑی پر چونکہ دنیا کے مشہور ترین اور خوبصورت ترین آثارِ قدیمہ میں شامل ایک مقدس اسلامی عبادت گاہ ہے اس لیے یہود کے مطابق اس کے ملبے تک کو صاف کرنا ضروری ہے۔ یہ پہاڑی قدیم القدس شہر میں واقع ہے اور اس کا نام صہیون

(Zion) ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام نے اس پہاڑی پر ایک عبادت خانہ تعمیر کیا جہاں وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے ایک اہم پیغمبر تھے لہٰذا اس پہاڑی کو مقدس سمجھا جانے لگا۔ یہودیوں نے اسے اپنے عالمی قومی مقاصد کے لیے ایک علامت بنالیا۔ اسی سے لفظ صہیونیت (Zionism) بنا ہے۔ یہ عالمی مقاصد پانچ ہیں اور جو لوگ اسرائیل کو تسلیم کرنے کی باتیں کرتے ہیں ان میں اگر ایمان کی ذرا بھی رمق باقی ہے تو انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کروا کر ان پانچوں ناپاک مقاصد میں معاون و مددگار رہوں گے اور یہ لوگ جو یہودی کی خاکروبی کر کے ان کے لیے میدان صاف کر رہے ہیں، یہ شوق ایک دن انہیں اس انجام تک لے جائے گا کہ وہ حسرت کریں گے کہ کاش! ہم یہ دن دیکھنے سے پہلے مر گئے ہوتے۔ صہیونیت کے پانچ مشہور عزائم یہ ہیں:

☆ فلسطین کی سرزمین پر تمام دنیا کے یہود کے لیے ایک قومی وطن بنانا۔ یہ مقصد ۱۹۴۸ء میں برطانیہ کی سرپرستی میں حاصل کر لیا گیا۔

☆ یروشلم (القدس شہر) کو صہیونی سلطنت کا دارالخلافہ بنانا۔ یہ مقصد ۱۹۶۷ء میں امریکا کی نگرانی میں پورا کر لیا گیا۔

☆ تمام مسلم ممالک کو نسلی، لسانی، گروہی تصادم کے نتیجے میں توڑ کر مسلم اور غیر مسلم باشندوں کو اکٹھا کر کے منی (چھوٹی) ریاستیں یا کینٹونز (Cantons) قائم کرنا جن کے حکمران امریکا اور اقوامِ متحدہ کے انتخاب کے تحت مقرر کیے جائیں گے اور جن کے تمام قدرتی، صنعتی، آبی، معدنی اور دیگر وسائل نیز بجلی، پانی، گیس اور فون وغیرہ بنیادی ضروریات کے ادارے پرائیوٹائزیشن کے ذریعے بین الاقوامی یہودی کمپنیوں (Multinational Companies) کے ہاتھ میں ہوں گے۔ مشرق وسطیٰ کو ۱۲ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے وہاں ایسے حکمران مسلط کروا دیے گئے ہیں کہ جن کو خبر ہی نہیں کہ ہمارے تیل کی دھار کسی اور کے پاس ہے۔ ان باتوں کو کوئی افسانہ سمجھے گا اور کچھ لوگوں کو ان میں اپنے وطن کے حالات کی تصویر نظر آئے گی۔ یہ تصویر کئی مغربی مفکرین (Think Tanks) کھینچ چکے ہیں

اور اب تو ایک مسلم اور سابقہ پاکستانی دانشور ڈاکٹر ابوالمعالی نے بھی اپنی کتاب The Twin Eras of Pakistan میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ (خاکم بدہن) نئے ہزاریے کی پہلی دہائی کے اختتام تک پاکستان کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہوگا۔ پہلا ٹکڑا جو اس علاقے کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ، خوشحال اور معدنی و صنعتی طاقت ہوگا، ری پبلک آف بلوچستان ہے۔ دوسرا کراچی اور حیدر آباد (شہری سندھ) کو ملا کر لیاقت پور یا جناح پور، تیسرا دیہاتی سندھ پر مشتمل سندھو دیش، چوتھا شمالی علاقہ جات اور آزاد و مقبوضہ کشمیر کو ملا کر متحدہ کشمیر کی شکل میں ہوگا۔ یہ کتاب وینٹیج پریس مین ہٹن نیویارک سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہو کر ۱۹۹۳ء میں پاکستان آ چکی ہے، عام دستیاب ہے اور پڑھنے والے ہم وطنوں کے حوصلوں کی بلندی کا کام دے رہی ہے۔

☆ چوتھا صیہونی عزم نہایت سنگین ہے یعنی مسجدِ اقصیٰ کو شہید کر کے ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا۔ اس کے لیے ہر سطح پر کام ہو رہا ہے۔ ایک طرف گولڈ فلیٹ جیسے دہشت گرد اور اسٹرن گینگ جیسی بدنام زمانہ تنظیمیں اپنے منصوبوں کی نوک پلک درست کر رہی ہیں، دوسری طرف صیہونی میڈیا یہ کوشش کر رہا ہے کہ فلسطین پر قبضے کی حقیقت کے ادراک سے مسلمانوں کو بہکا دے۔ چنانچہ کبھی اس کو ''آزادیٔ وطن'' اور ''قومی غیرت'' کا عنوان دے دیا جاتا ہے، کبھی اسے ''چھنی ہوئی زمین اور لٹے ہوئے مال'' کا مسئلہ بتایا جاتا ہے۔ کبھی اسے ''خانماں برباد فلسطینیوں'' کے ساتھ ''سپر طاقتوں کا کھیل'' کہہ کر معاملے کی نزاکت کو دبا دیا جاتا ہے۔ یعنی غضب یہ ہے کہ اس مسئلے سے دین اور مذہب کے عنصر کو خارج کر دیا گیا ہے اور اب کسی کو شعور ہی نہیں کہ یہ اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان زمین کا تنازع نہیں جو مذاکرات سے حل ہو جائے گا، بلکہ یہ حق و باطل کا معرکہ ہے جس میں ہر صاحبِ ایمان کی آزمائش ہے۔ یہ رحمانی اور شیطانی قوتوں کی جنگ ہے جس میں ہر ایک کلمہ گو اپنی حیثیت کے بقدر جوابدہ ہے۔ تیسری طرف مسلم معاشروں میں نوخیز اسرائیلی مولویوں کی کھیپ تیار کی جا رہی ہے جو مسجدِ اقصیٰ اور ارضِ فلسطین کو مظلوم یہودیوں کی میراث قرار دیتی ہے جسے اگر ان کے حوالے نہ کیا گیا تو امتِ مسلمہ تکذیبِ آیات اللہ کی مرتکب ہوگی۔ چوتھی طرف دجل اور فریب کی شعبدہ بازیاں ہیں۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے بہانے مسجدِ اقصیٰ کے نیچے گہری

سُرنگیں کھود کر وہاں عارضی طور پر یہودی عبادت جاری کی جا چکی ہے اور یہودی ربی اپنے عوام کو یہ باور کروا رہے ہیں: ”فی الحال زیرِ زمین اور مستقبل قریب میں برسرِ زمین۔“ اس زیرِ زمین منصوبے کو زمین کے اوپر لانے کی وہ کوشش جس کے ذریعے آخری مرحلے کا آغاز ہوگا، یہودیوں کی اصطلاح میں ”گش ایمونیم“ کہلاتی ہے اور جو اس خوفناک اور خطرناک عمل کے متجانب اثرات (Collateral Effects) کے مطالعے کی تکمیل کے بعد بس ظہور میں آیا ہی چاہتی ہے۔

☆ صہیونیت کا پانچواں عزم گریٹر اسرائیل کا قیام ہے یعنی فلسطین کے بعد شام، لبنان، اُردن، کویت اور عراق مکمل جبکہ سعودی عرب، مصر اور ترکی کے کچھ علاقوں پر مشتمل عظیم تر صہیونی ریاست کی تشکیل جو مسیحائے منتظر و موعود (دجّالِ اکبر، جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے خدا ناشناس دنیا کو اپنے چنگل میں کرنے والا، نئے عالمی نظام کا سربراہِ اعظم) کے شایانِ شان ہوگی اور پورے کرۂ ارض کے لیے وضع کیے گئے ”نئے عالمی نظام“ (New World Order) کو نافذ کرے گی۔ واقفانِ حال مسلم زعماء بار ہا اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ اسرائیل کا سانپ ان تمام مسلم ممالک کو ہڑپ کر جائے گا مگر دور پار کے ممالک فلسطین کی پھر بھی کچھ فکر رکھتے ہیں، لیکن تمام عرب ممالک خادم الحرمین الشریفین کی پیروی میں کالے دھندے والے گورے لُٹیروں کی اس جوڑی (بش وبلیئر) کا سایۂ عاطفت تلاش کرتے رہتے ہیں جن کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے۔ صہیونیت کا پروردہ عالمی استعمار اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان حکمرانوں سے دومنہ والے کڑیالے سانپ کی طرح (جو ایک منہ سے پچکارتا ہے اور دوسرے سے ڈستا ہے) سلوک کر رہا ہے۔ عالمی طاغوتی نظام اعلان کر چکا ہے: ”ہم آخری اور فیصلہ کن جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم ساری دنیا کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔“ (صدر بش: خطاب فروری ۱۹۹۱ء) شر کی طاقتیں ہمہ جہتی طریقہ (Many Front Approach) استعمال کر رہی ہیں جبکہ خیر کو پھیلانے کے ذمہ دار تا حال بدی کی قوتوں کے ہتھکنڈوں سے واقف ہی نہیں۔ انہیں کون سمجھائے ذرا اپنے اردگرد کی خبر لو! انہیں کون بتائے پہاڑی کے پیچھے سے فوج چڑھی آ رہی

ہے۔ آج اس یلغار کو امت کا ہر فرد اپنے اپنے دائرہ کار میں ذمہ دارانہ اور مخلصانہ کردار کے ذریعے روک سکتا ہے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر کل آنے والے ہولناک عذاب کو روکنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

زرد گنبد کی شبیہہ

ڈاکٹر لیمبرٹ ڈولفن ایک ممتاز امریکی سائنس دان ہے۔ یہ کیلی فورنیا میں واقع اسٹین فورڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے وابستہ ہے۔ اس نے تعمیراتی مقاصد کی غرض سے زمین کا جائزہ لینے کے لیے ایکسرے کی طرح کا ایک راڈار ایجاد کیا ہے۔ یہ راڈار زمینی تحقیق کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس حوالے سے خاصا قابلِ اعتماد ہے۔ اس کے ایجاد کردہ طریقِ کار میں کسی علاقے کی ارضیاتی تحقیق کے لیے پہلے ایک فضائی فوٹوگرافی ہوتی ہے پھر زمین کے اندر کی ساخت اور دیگر معلومات کے لیے جدید سائنسی طریقہ THERMAL INFRARED IMAGINARY استعمال کرتے ہوئے زمین کے اندر راڈار داخل کر دیا جاتا ہے جو زمین کے اندر کی آوازیں بھی جانچ لیتا ہے۔ اس جغرافیائی اور ارضی تحقیق کی روشنی میں انجینئر صاحبان اپنے منصوبے کا آغاز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈولفن کٹر قسم کا شدت پسند (DISPENSATIONALIST) ہے۔ اس کی شہرت سن کر مسجدِ اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مہم چلانے والے مشہور اداروں میں سے ایک ادارے یروشلم ٹمپل فاؤنڈیشن نے اس کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ فاؤنڈیشن یہ چاہتی تھی کہ ڈاکٹر موصوف اور اس کی ٹیم ہیکل کی تعمیر کے لیے مسجدِ اقصیٰ کی زمین کا سروے کرے۔ بظاہر اس کا مقصد ارضیاتی جائزہ تھا لیکن درحقیقت وہ یہ چاہتے تھے کہ مسجدِ اقصیٰ کی چار دیواری کے اندر موجود تعمیرات کی بنیادوں کا جائزہ لیا جائے کہ یہ کس حد تک مضبوط ہیں اور ان کے نیچے سرنگوں کی کس زاویے سے کھدائی اور ان میں ارتعاش پیدا کرنے والے آلات کی تنصیب سے انہیں

ایسا نقصان پہنچ سکتا ہے کہ وہ (خدانخواستہ) کچھ عرصے بعد بوسیدہ ہوکر خود ہی گر جائیں اور اسلامی دنیا اس کو یہودی کارستانی کی بجائے قدرتی حادثہ سمجھے۔ ڈاکٹر ڈولفن سے اس کی ٹیم کی آمدورفت، قیام اور منصوبے کی تکمیل کے لیے اخراجات کا تخمینہ پوچھا گیا تو اگرچہ وہ خود عیسائی تھا اور یہود کے اس پروپیگنڈے کا قائل تھا کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ زمین پر بھیجنے سے قبل ہیکل کی تعمیر ہوجانی چاہیے...... لیکن یہودی تنظیم کے پاس موجود فنڈز کے پیش نظر اس نے انہیں ساڑھے دس لاکھ ڈالرز کا خرچ بتایا۔ اس تنظیم کو کیولری چیپل نامی سرمایہ دار یہودی نے اس ''عظیم کارِ خیر'' کے لیے رقم تن تنہا فراہم کردی اور ڈاکٹر ڈولفن اپنا سائنسی ساز وسامان اور عملے کے ساتھ القدس شہر پہنچ گیا۔ یہ ۱۹۹۹ء کی گرمیوں کی بات ہے۔

ڈاکٹر ڈولفن نے ''زمینی تحقیق سے متعلق راڈار'' اور دیگر ساز وسامان کے ساتھ کئی ہفتے اس مقدس شہر میں گزارے۔ اس دوران وہ القدس کی تاریخی اسلامی عبادت گاہوں کے قریب کھدائیاں اور ایکسرے کرتا اور مٹی کے نمونے اور مسلمانوں کے ردعمل کا جائزہ لیتا رہا۔ جب منصوبے کے اصل حصے یعنی مسجدِ اقصیٰ کے قریب اس نے کھدائی شروع کی اور زمین کے اندر آوازوں کی جانچ کرنے والا ایکسرے کرنا چاہا تو فلسطینی مسلمانوں میں زبردست اشتعال پھیل گیا۔ پورے شہر کی فضا خراب ہوگئی، خطرہ محسوس ہونے لگا کہ ڈاکٹر اور اس کی ٹیم پر فلسطینی جانباز فدائی حملہ نہ کردیں۔ اسرائیلی حکومت نے یہ حالات دیکھے تو فاؤنڈیشن کو دیا گیا اجازت نامہ منسوخ کردیا اور امریکی ڈاکٹر کو حکم ہوا کہ جلد از جلد اپنا ساز وسامان لپیٹے اور عملہ کو ساتھ لے کر رخصت ہوجائے۔ ڈاکٹر ڈولفن تو کیلی فورنیا واپس رخصت ہوگیا لیکن کیا یہ مہم رُک گئی؟ نہیں ہرگز نہیں! بیت المقدس کی جگہ ہیکل کی تعمیر یہودیوں کے لیے سرسام بن چکی ہے۔ ان کے خیال میں جب تک ہیکل تعمیر نہیں ہوگا، ان کا نجات دہندہ دجالِ اعظم ان کی مدد کو ظاہر نہیں ہوگا اور جب تک وہ ظاہر نہیں ہوگا ان کو حسبِ منشا غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا نہ ان کے مصائب ختم ہوسکتے ہیں لہٰذا اس وقت درجنوں تنظیمیں اس غرض کے لیے کام کررہی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مقدس مسجد کو شہید کرکے اس کی جگہ یہودی عبادت گاہ تعمیر کردی جائے۔ اس غرض کے لیے

لاکھوں ڈالر چندہ اکٹھا ہوتا ہے اور ان تنظیموں کی ویب سائٹ پر ناظرین کو کام کی رفتار اور ترقی سے مطلع کیا جاتا ہے۔ یہ کوشش ہمہ جہتی ہے اس میں ہر یہودی چاہے...... سیاست دان ہو یا دہشت گرد غنڈہ، سرمایہ دار ہو یا جوئے کے کسی مرکز کا کیشئر...... اپنی اپنی حیثیت اور وسعت کے بقدر حصہ لے رہا ہے۔

جون ۱۹۶۷ء سے اب تک ۱۰۰ سے زائد مرتبہ جوشیلے یہودی مسلمانوں کی اس انتہائی مقدس عبادت گاہ پر حملے کر چکے ہیں۔ ان حملوں کے لیے اس تاریخ کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ صفر ۱۳۸۷ھ کے موافق ہے۔ یہ وہی مہینہ تھا جب تقریباً ۱۳۸۰ سال قبل مسلمانوں کو خیبر کے غدار یہودیوں پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ ان حملوں میں مسلح یہودی ربی سب سے پیش پیش رہتے ہیں۔ ایک مشہور یہودی ربی شومن گورین کو جب اسرائیل کا ربی اعظم بنایا گیا تو اس کا انتخاب کرنے والوں کے پیش نظر اس کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر حملہ کرنے والے ۵۰ مسلح غنڈوں میں سب سے آگے تھا اور ان کی قیادت کر رہا تھا۔ ان حملوں میں اسرائیلی حکومت پوری طرح ملوث ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ اسرائیلی فوج کے ذریعے کام کروائے اور پھر دنیا بھر کے خوابیدہ مسلمانوں کو جگا کر مصیبت مول لے۔ اس کی خواہش ہے کہ یہ کام یہودی انتہا پسند اپنے طور پر کریں اور وہ بڑی بڑی ناقابلِ عبور دیواریں تعمیر کر کے انہیں تحفظ فراہم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۷ء سے آج تک اسرائیل کے سرکردہ ربیّوں (مذہبی رہنماؤں) نے ان تنظیموں کی کارروائیوں کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ یہودی دہشت گردوں کی طرف سے مسجد پر ہونے والے متعدد حملوں کی ایک بار بھی اسرائیلی حکومت کے کسی اہلکار یا کسی سیاسی پارٹی کے عہدیدار نے...... چاہے وہ حکومت میں ہو یا اپوزیشن میں...... مذمت نہیں کی، بلکہ یہ لوگ اگر اپنی حماقت کی وجہ سے ایسے کسی منصوبے پر عمل کے دوران گرفتار ہو جائیں تو ان سے عظیم قومی ہیرو جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی دہشت گرد کو لمبے عرصے قید کی سزا نہیں دی جاتی بلکہ اسرائیلی صدر نے ان کی سزاؤں میں خصوصی اختیارات کے تحت تخفیف ہی کی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعلیٰ سطح پر حکومت

ان کارروائیوں کو نہ صرف پسند کرتی ہے بلکہ اس میں وہ درپردہ مکمل طور پر شریک ہے۔

حرم قدسی پر ہونے والے شدید مسلح حملوں میں وہ بڑے بڑے تمام ربی شامل رہے ہیں جو سرکاری ملازم ہیں اور اسرائیلی سرکار سے بھاری تنخواہ و مراعات پاتے ہیں۔ یہ یہودی رہنما پریس کے سامنے اسرائیلی عوام کو تو امن کی تلقین کرتے اور عربوں سے تعلقات بہتر بنانے پر زور دیتے ہیں (مسلمانوں کی جگہ وہ عربوں کی اصطلاح عالمی میڈیا جان بوجھ کر استعمال کرتا ہے تاکہ مسئلہ فلسطین کو عرب یہود کا سیاسی تنازع باور کرا سکے) لیکن یہودیوں کے سامنے کیے جانے والے خطابات میں مسلسل اشتعال انگیزی کرتے اور جنونی یہودی غنڈوں کی سرپرستی اور قیادت کرتے ہیں۔ ان کے خطابات کا بنیادی موضوع یہ ہوتا ہے: ''ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تمام جلاوطنوں کو اکٹھا کرنے اور اپنی ریاست بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ مقدس عبادت گاہ اور قربان گاہ تعمیر کی جائے۔'' امریکا خصوصاً نیویارک (جو جیویارک بھی کہلاتا ہے) سے اسرائیل گئے ہوئے یہودی اس حوالے سے سب سے زیادہ متشدد ہیں۔ آئیے ان میں سے چند ایک کے خیالات ملاحظہ کرتے ہیں:

☆ ...... بوبی براؤن بروک لین کا رہنے والا ہے، اس نے ''مسیحا کے استقبال'' کا شرف حاصل کرنے کے لیے نیویارک کی پُرآسائش زندگی کو چھوڑ کر مقبوضہ فلسطین کی ایک یہودی بستی میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ٹکویا (TEKOA) نامی یہ بستی بیت اللحم میں ہے۔ اس نے صحافیوں کے ایک گروپ سے بات چیت کرتے ہوئے کہا: ''ماؤنٹ موریا پر مسجدِ اقصیٰ کی موجودگی اس زمین پر بڑا بوجھ ہے۔ یروشلم کی کسی بھی تصویر پر نظر ڈالو، مسجدِ اقصیٰ نظر آ جائے گی۔ [بیت المقدس کے زرد گنبد سے یہودیوں کے بغض وعناد کا اس ایک جملے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے] اسے تو جانا ہی ہوگا۔ ایک دن ہم اپنی تیسری عبادت گاہ وہاں تعمیر کر ہی لیں گے، یہ کام لازمی طور پر کریں گے تاکہ عرب اور ساری دنیا دیکھ لے کہ ہم یہودیوں کا قبضہ سارے یروشلم پر ہے، اسرائیل کی تمام زمین پر ہے۔''

☆ ...... رابرٹ فرائیڈ بھی امریکا سے گیا ہوا ایک یہودی آباد کار ہے۔ اس سے جب

پوچھا گیا کہ مسجدِ اقصیٰ کو تباہ کر دینے سے ایک ہولناک جنگ شروع ہو سکتی ہے کیا آپ کو اس کا اندازہ نہیں؟ تو اس نے کہا: ''ٹھیک! بالکل یہی بات ہے۔ لیکن ایسی ہی جنگ تو ہم چاہتے ہیں کیونکہ ہم اس میں جیتیں گے، پھر ہم تمام عربوں یعنی فلسطینی مسلمانوں کو، بقیہ عرب مسلمانوں کو اپنی دولت شمار کرنے اور اس کا مصرف ڈھونڈنے سے ہی فرصت نہیں] اسرائیل کی سرزمین سے نکال دیں گے اور تب ہم اپنی عبادت گاہوں کو از سرِ نو تعمیر کریں گے۔''

☆...... روزن ہوور نامی ایک یہودی تنظیم کا اعلیٰ عہدیدار یہودی دہشت گردوں کے لیے دنیا بھر کے یہود سے چندہ اکٹھا کرتا ہے۔ اس نے غیر ملکی صحافیوں سے برملا کہا: ''یہودی عبادت گاہ کی تعمیر کے لیے مسجدِ اقصیٰ کو تباہ کرنے سے اگر تیسری جنگِ عظیم شروع ہو جاتی ہے تو بیشک ہو جائے۔ خدا کی مرضی یہی ہے۔''

☆...... ۱۹۸۵ء میں یہودہ ایٹزون (YEHUDA ETZION) نامی ایک دہشت گرد گرفتار ہوا۔ اس نے میناخم لونی نامی اسرائیلی فوج کے ایک ریٹائرڈ انجینئر کے ساتھ مل کر مسجد کے انہدام کا خفیہ منصوبہ بنایا تھا۔ انہوں نے فضائی فوج کے ایک پائلٹ کو ساتھ ملایا جس نے جہاز کو مسجد کے اوپر لا کر فضائی حملہ کرنا تھا۔ تب یہودیوں کے بم بردار دستے دیواریں پھاند کر مسجد کے صحن میں داخل ہو جاتے، تاہم منصوبے پر عمل سے پہلے وہ گرفتار ہو گئے۔ مقدمے کے دوران یہودہ ایٹزون نے عدالت میں بیان دیا: ''اسرائیلی حکومت چونکہ مسلمانوں سے سرزمین کو خود پاک نہیں کرے گی تو لازم آتا ہے کہ یہ کام میں خود انجام دوں۔'' وہ اپنے فعل پر نادم نہیں تھا۔ اس نے عدالت سے کہا: ''میں سو فیصد معصوم ہوں کیونکہ اس عمارت (مسجدِ اقصیٰ اور گنبدِ معراج) کو ضرور ہٹانا ہے۔''

تو برادرانِ اسلام یہ ہیں وہ حالات جن کی رو سے ایک اندھا بھی سمجھ سکتا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ سخت خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ اس پر سازشوں کے گہرے بادل منڈلا رہے ہیں۔ نہتے فلسطینی مسلمانوں نے اپنے زخمی جسموں سے اس کے گرد حفاظتی دیوار کھڑی کر رکھی ہے لیکن وہ کب تک تنہا اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ یہ ان کا نہیں پوری امتِ مسلمہ کا، روئے زمین

پر بسنے والے ہر کلمہ گو کی غیرتِ ایمان کا مسئلہ ہے لیکن حالت یہ ہے کہ فلسطین کے غم میں شریک ہونے پر کوئی تیار نہیں، اقصیٰ کے آنسو پونچھنے پر کوئی آمادہ نہیں۔ مسلمانوں پر جو مصائب نازل ہورہے ہیں اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقدس مقامات کو بھی بھلا رکھا ہے اور اپنے مظلوم بھائیوں کے بارے میں ایسی سنگ دلانہ بے حسی کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ اس کے انجام کو سوچ کر روح کانپ اٹھتی ہے۔

ربیع الاول کے مہینہ میں ہمارے ہاں خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی کی شبیہیں بنائی جاتی ہیں۔ ان مقامات سے محبت مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے اپنے ذہن کے مطابق اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس مظلوم مسجد کا کیا ہوگا جو یہود کے قبضے میں ہے اور کوئی اس کو یاد نہیں کرتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دو نہیں، تین مقدس مقام ہیں: بیت اللہ، مسجدِ نبوی اور بیت المقدس۔ پہلے دو مقام پر تو مسلمان حاضری بھی دیتے ہیں اور ان کی خوبصورت تصاویر بھی ہر گھر میں آویزاں ہیں۔ بہت سی مساجد میں روضۂ مطہرہ جیسے خوبصورت گنبد بھی بنے ہوئے ہیں۔ فیصل آباد میں ایک فیکٹری کے ساتھ بنی مسجد میں ایک گنبد کے اندر اتنا خوبصورت اور نفیس کام ہوا ہے کہ انسان حُسنِ ذوق کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ مسلمانوں کے عشق ومحبت کے جذبات ہیں لیکن غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے تیسرے مقدس مقام کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ ہمیں اس مسئلہ کو زندہ رکھنا ہوگا کیونکہ مستقبل قریب میں ہمارا سب سے بڑا امتحان اس مسجد کے حوالے سے ہوگا۔ مسلمانوں کے گھر، دفاتر اور بیٹھکیں اس مقدس مقام کی تصاویر سے آراستہ رہنی چاہییں۔ اس کے علاوہ بھی ایک صورت ہوسکتی ہے: مساجد کے مرکزی ہال کے وسط میں جو گنبد بنایا جاتا ہے اس کی ساخت بیت المقدس کے مشہور زمانہ زرد گنبد کے طرز پر بنائی جائے تو یہ ایک جدت بھی ہوگی اور مسلم امہ کے عظیم ورثے سے نسبت کا اظہار بھی۔ ایسی نسبت جسے ہمارے دشمن فراموش کروا دینا چاہتے ہیں۔ قیامِ اسرائیل کو پچاس سال ہوچکے ہیں اور نصف صدی میں کرۂ ارض کے مسلمانوں کی وہ نسل دنیا سے گزر چکی ہے جس نے اپنی آنکھوں سے بیت المقدس کی زیارت کی ہو۔ اب تو اسپین کی مسجد قرطبہ کی طرح نئی نسل جانتی

بھی نہیں کہ بیت المقدس نامی وہ چیز کیا ہے جو ہم سے چھین لی گئی۔ حیرت ہے کہ آپ کو نجف اور کربلا کی اسلامی تعمیرات کا نمونہ تو اپنے ملک میں مل جائے گا لیکن بیت المقدس کو ہی ایسا یتیم سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کی یادگار یا شبیہہ بھی کوئی نہیں بناتا۔ مسلمانوں کے ملکوں میں بہت سی نئی مساجد بنتی رہتی ہیں اور اب تو جدت طرازی کے خوشگوار نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر نئی بننے والی مساجد میں سے چند ایک کے مرکزی ہال کے وسط میں زرد گنبد بن جائے تو یہ شاندار یادگار ہوگی جو نئی نسل کو اس کا فرض یاد دلاتی رہے گی اور اگر یہ ہال گنبدِ صخرہ کی دیواروں کی طرح آٹھ کونوں والا ہو تو کیا کہنے، سبحان اللہ! لطف ہی آ جائے گا۔ ضربِ مؤمن میں مسجدِ اقصیٰ اور گنبدِ صخرہ کے ماڈل اتنے زاویوں اور اتنے رُخ سے چھپ چکے ہیں کہ متوسط صلاحیت والا انجینئر بھی انہیں دیکھ کر مطلوبہ ماڈل بآسانی ڈیزائن کر سکتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو گنبدِ صخرہ کی تصاویر پر مشتمل سی ڈی بھی مل سکتی ہے۔ اگر یہ گنبد مسجد کے ہال کے بیچ میں بنایا جائے تو اس پر کوئی اتنا زیادہ اضافی خرچ بھی نہیں اُٹھے گا۔

جو قوم اپنی روایات اور ورثے کی حفاظت کرتی ہے وہ قدرت کی طرف سے اپنی بقا کے فیصلے کروا لیتی ہے اور جو انہیں فراموش کر دے تو اللہ اور اس کا دین کسی کا محتاج نہیں، وہ کسی اور کو اس کی حفاظت کے لیے کھڑا کر دیتا ہے۔

تورات کیا کہتی ہے؟

‘‘مولانا صاحب! السلام علیکم’’

‘‘وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ’’

‘‘بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اسرائیل یہودی ریاست نہیں، یہودیوں کی ریاست ہے؟’’

‘‘اس لفظوں کے کھیل سے ان کا مطلب کیا ہے؟’’

‘‘اسرائیل کی نفرت کم کرنے کے علاوہ اور کیا مطلب ہوسکتا ہے؟’’

‘‘جب تورات کے مطابق اسرائیل کی بداعمالیوں کے سبب خود اس کا خدا اس سے نفرت کرتا ہے تو ان کو کیا پڑی کہ وہ اس مردود قوم کی نفرت کم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ بھی اس لعنت میں سے حصہ پانا چاہتے ہیں جو ایک عہد شکن، گستاخِ انبیا اور غدار و بدعمل قوم کے لیے مقرر ہے؟’’

‘‘اچھا آپ کچھ رہنمائی تو فرمائیں؟’’

‘‘پہلے یہ بتایئے یہ لوگ شکل صورت سے مولوی تھے یا عام آدمی؟’’

‘‘مولوی تھے تبھی تو ہمیں پریشانی ہے’’۔

‘‘تو پھر یہ اسرائیلی مولوی ہوں گے’’۔

‘‘اسرائیلی مولوی؟’’

‘‘جی ہاں! آج کل علمائے سوء کی ایک نئی قسم نکلی ہے جو نجاست اور نحوست میں اس کی پہلی تین قسموں (شکم پرست ملا، درباری ملا اور کٹ ملا) سے بھی نمبر لے گئی ہے’’۔

‘‘اچھا آپ اب اس موضوع پر کچھ بولیے’’۔

''آپ ان سے پوچھتے: اسرائیل کے بانی کون ہیں؟ (بندہ کا مضمون ''دو ڈاکٹروں کی کہانی'' دیکھیے) وہ لوگ تو اسے نہ صرف یہودی اور صہیونی ریاست کہتے ہیں بلکہ اسے ''ارض موعود'' اور ''میراث کی سرزمین'' کہتے ہیں اور دنیا بھر میں پمفلٹ تقسیم کرتے ہیں کہ ''مسیحا کے استقبال کے لیے ایک اینٹ یا ایک درخت اسرائیل میں لگایئے''۔ یہ ان کا مذہبی عقیدہ ہے کہ صرف فلسطین نہیں بلکہ ''نیل سے فرات تک'' ارض موعود کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں شریک نہ ہونے والا یہودی لامذہب اور بددین ہے۔ بن گوریان نے کہا تھا: ''ہر وہ یہودی جو ارض موعود کی طرف واپس نہیں آئے گا، اسرائیل کے خدا کی رحمت سے محروم ہو جائے گا۔'' موشے دایان نے ٦ جون ۱۹٦۷ء جنگ کے خاتمے پر اعلان کیا: ''ہم نے یروشلم پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب ہم یثرب اور بابل کی طرف بڑھنے والے ہیں۔'' ان شکم پرست ملاؤں سے آپ پوچھیں: یہودی یثرب کس شہر کو کہتے ہیں؟ اسرائیلی پارلیمنٹ کی دیوار پر ''عظیم تر اسرائیل'' کا جو نقشہ بنا ہے اس کی تصویر ہم شائع کر چکے ہیں۔ یہ نقشہ ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اسرائیل یہودی ریاست ہے یا یہودیوں کی ریاست؟''

''ان حضرات کا کہنا تھا اسرائیل کی پارلیمنٹ میں مسلمان بھی ہوتے ہیں؟''

''آپ ایک دو کا نام بتایئے''۔

''گہری خاموشی......''

''اچھا سنیے! اسرائیل کی حکمراں اگودت لیبر پارٹی کے دستور میں لکھا ہے: ''اسرائیل دوسری ریاستوں جیسی ایک ریاست نہیں ہے۔ تورات کی ہمیشہ رہنے والی شریعت اسرائیلی قوم اور اسرائیلی ریاست کا قدرتی دستور ہے''۔

''اس کا حوالہ آپ دے سکتے ہیں''۔

''حوالہ؟ آپ نیٹ پر جائیں اور وہاں سے خود لے لیں لیکن پھر مجھے یہ ضرور بتایئے گا کہ ''قدرتی دستور'' کا کیا مطلب ہے؟''

''وہ حضرات یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ارضِ فلسطین کی وراثت اور مسجد اقصیٰ کی تولیت

کا حق یہود کو ہے''۔

''ارضِ فلسطین کی وراثت کا لفظ اندر کا کھوٹ بتلا رہا ہے کہ وہ اسے ابدی یہودی ریاست سمجھتے ہیں۔ اس سے ان کی پہلی بات کی خود بخود نفی ہو گئی''۔

''اس بات پر میں ان کو پکڑوں گا لیکن مولانا صاحب! مسجد اقصیٰ کی تولیت تو یہود کو ملنی چاہیے کیونکہ یہاں ان کی مذہبی عبادت گاہ ''ہیکل سلیمانی'' تھی''۔

''پہلی بات پوری ہونے دیجیے! ارضِ فلسطین کی وراثت سے ان یہودی ملاؤں کی مراد کیا ہے؟ مادی وراثت تو ہو نہیں سکتی کہ قوم یہود باہر سے یہاں آکر آباد ہوئی تھی۔ خود تورات میں لکھا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ہمارے اور ان کے جد امجد ہیں عراق سے یہاں تشریف لائے تھے۔ جب وہ فلسطینی الاصل نہ تھے تو یہود کیسے یہاں کے وارث ہو سکتے ہیں؟ اگر روحانی وراثت کا دعویٰ ہے تو خود تورات کے مطابق یہود کی بداعمالیوں کے سبب ان سے یہاں کی وراثت چھین لی گئی ہے ورنہ وہ یہیں رہتے ان کو یہاں سے لونڈی غلام بنا کر کیوں نکالا گیا؟''

''آپ نے تورات پڑھی ہے''۔

''کئی مرتبہ۔ اور وقتاً فوقتاً پڑھتا رہتا ہوں۔ ہر عالم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں تک تاریخی مذہبی عبادت گاہ پر ان کا حق تسلیم کرنے کی بات ہے تو اس کلیے کی رو سے بھی یہود کا حق نہیں بنتا کیونکہ ''ہیکل سلیمانی'' یہود نے یہاں خالی جگہ پر تعمیر نہ کیا تھا نہ اس جگہ ہیکل کی تعمیر پہلی تعمیر تھی۔ اس جگہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے عبادت گاہ چلی آ رہی ہے۔ خانہ کعبہ کی ابتدائی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی اور بیت المقدس، خانہ کعبہ کے چالیس برس بعد تعمیر ہوا ہے۔ اس وقت سے...... یعنی یہود کی یہاں آمد کے ہزاروں سال پہلے سے...... اس بابرکت جگہ جو عبادت گاہ بنتی رہی اس کی تولیت اہل حق کو ملتی رہی، بیچ میں یہودیوں کا دور آیا تو حضرت داود و حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہم الصلاۃ والسلام کو ملی۔ ان کے بعد جب یہودیوں نے ان مقدس انبیائے کرام کی نافرمانی کی تو انہی انبیاء کرام نے ان پر لعنت اور بددعا کی اور یہودی دھتکار کر یہاں سے نکال دیے گئے اور قیامت تک اہل حق کو اس جگہ کی تولیت دے دی

گئی۔ خلاصہ یہ کہ یہ جگہ یہودیوں نے تعمیر نہیں کی ان سے پہلے کی تعمیر تھی اور ان کے بعد اہل توحید کے سجدوں سے آباد ہے۔ یہود صرف اس عبادت گاہ پر دعویٰ کر سکتے ہیں جو پہلی مرتبہ انہوں نےخود تعمیر کی ہو، مسجد اقصیٰ پر ہرگز نہیں کر سکتے کہ یہ تو ابتدا سے یہودی عبادت گاہ نہ تھی۔ یہودیوں سے ہزاروں سال پہلے سے چلی آ رہی ہے اور ان کے بعد بھی ''قیامت تک سجدہ گاہ اہل اسلام رہے گی''۔

''وہ یہ اصول بیان کر رہے تھے کہ ہر فرقے کی مرکزی عبادت گاہ اسی کو ملنے چاہیے''۔

''یہود اور اصول؟! اس اصول کا جواب دے چکا ہوں۔ یہود کو یہ جگہ لینی ہی تھی تو اس وقت لے لیتے جب سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو ترغیب دے دے کر اُبھار رہے تھے کہ میرے ساتھ چلو اور یہ عبادت گاہ چھڑالو لیکن گستاخ یہودی کہہ رہے تھے: ''تم اور تمہارا رب جا کر لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' اس وقت فلسطین کی وراثت اور ہیکل کی تولیت ان کو کیوں یاد نہ آتی تھی''۔

''اب انہوں نے آدھے سے زیادہ فلسطین پر قبضہ کر ہی لیا تو یہ واپس تو جائیں گے نہیں۔ انہیں تسلیم تو کر لینا چاہیے''۔

''یہ قبضہ انہوں نے نہیں کیا۔ تورات کہتی ہے کہ قدرت انہیں یہاں ہانک کر لائی ہے تاکہ سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھوں ان کو آخری سزا دلوائے۔ اب جو کوئی اس ناجائز قبضے کو تسلیم کرتا ہے وہ بھی اس سزا کا مستحق ہوگا جو ان کے لیے مقرر ہے۔''

''مولانا صاحب! آپ فلسطین کی بات یہاں بیٹھ کر کیوں کرتے رہتے ہیں؟''

''یہی بات میں ان ایمان فروشوں سے پوچھتا ہوں۔ وہ اسرائیل کی بات یہاں بیٹھ کر کیوں کرتے ہیں؟

اب اصل جواب سنیے: دنیا میں اس وقت جو بھی حالات ہیں یہ سب فلسطین میں ہونے والی ''آخری جنگ عظیم'' کا پیش خیمہ ہیں جس کو ہرمجدون یا آرمیگاڈون بھی کہتے ہیں اور اس میں پاکستان و افغانستان کے مجاہدین کا عظیم حصہ ہوگا۔ زرقاوی عراق سے یہودی انخلا کی خاطر شہید نہیں ہوا بلکہ اس نے مسجد اقصیٰ کے تحفظ کے لیے جان دی ہے۔ زرقا سے یعقوبہ تک کی

داستان حیات آپ غور سے پڑھیے! ہر موڑ اقصیٰ اور القدس سے ہو کر گزرتا نظر آئے گا۔ افغانستان کی جنگ قدرتی ذخائر سے بھرپور پہاڑوں کے لیے نہیں، صہیون کی پہاڑی کو خدا کی مغضوب قوم سے بچانے کے لیے ہے۔ بابری مسجد کی شہادت، مسجد اقصیٰ کی شہادت کی ریہرسل ہے۔ یہود و ہنود ایک ہیں۔ کاش عرب و عجم بھی ایک ہو جائیں''۔

''مولانا صاحب! آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں''۔

''جو سمجھ کر بھی نہ سمجھے اسے کون سمجھا سکتا ہے؟ میں بھی نہیں چاہتا کہ ساری باتیں فی الفور کھول کر سمجھا دی جائیں۔ اس سلسلے کو آہستہ آہستہ چلانا چاہیے۔ ورنہ لوگ جہاد اور تقویٰ چھوڑ کر حضرت مہدی کے انتظار میں آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر بیٹھے رہ جائیں گے اور جب حضرت مہدی کے لشکر کی آواز لگے گی تو گناہوں اور ترک جہاد نے انہیں یا ان کی نسل کو اس قابل نہ چھوڑا ہو گا کہ وہ اس مبارک جماعت میں شامل ہو سکیں''۔

بہترین دوست بدترین دشمن

امریکا آنے جانے والوں سے لوگ بلا وجہ ہی دلچسپی رکھتے ہیں اور وہاں کی طلسماتی دنیا کے بارے میں ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ ان کی دلچسپی کی اپنی اپنی وجوہ ہوتی ہیں۔ بندہ کو ان میں سے کوئی پڑھا لکھا معقول شخص مل جائے تو کوشش ہوتی ہے کہ اس سے تین سوالوں کا جواب معلوم کیا جائے۔ ان تین سوالات کے مختلف جوابات سامنے آتے ہیں جن کو جمع کرنا اور موازنہ کرنے سے دلچسپ صورتحال سامنے آتی ہے۔ ان تین سوالوں کا ذکر پھر کبھی، آج آپ کو میں اس حوالے سے ایک نوجوان کی کہی ہوئی بات سنانا چاہوں گا۔ یہ ذہین نوجوان اسکالرشپ پر امریکا گیا تھا اور اس نے سات ہزار طلبہ میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے خود کو اس وظیفے کا حقدار ٹھہرایا تھا۔ بندہ نے اس سے پوچھا: ''کبھی کسی یہودی سے ملاقات رہی؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں! میرا ایک کلاس فیلو یہودی میرا اچھا خاصا دوست بن گیا تھا۔ اس کا خیال تھا مجھے اس پر تعجب ہوگا اور میں بے ساختہ پوچھوں گا: یہودی اور دوست؟ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں یہودیوں کی نفسیات کو جانتا تھا کہ نجی زندگی میں یہ بہترین کاروباری، اور بہترین معاملہ کار ہوتے ہیں نیز یہ مزاجاً اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ اندر سے ''بوائل'' ہو رہے ہوں پھر بھی چہرے پر ''سمائل'' سجائے رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے مہمان نے خود ہی کہا: ایک مرتبہ میں نے اپنے یہودی کلاس فیلو سے تعجب کا اظہار کیا کہ ایک مسلمان وہ بھی پاکستانی، اس سے دوستی چہ معنی دارد؟ اس پر یہودی زور سے ہنسا۔ اس کی ہنسی اس طرح کی تھی جیسے مزے لے رہا ہو۔ پھر اس نے کہا: تم میں اور ہم میں تو فرق ہے۔ تم

مسلمان انفرادی طور پر ہمارے سخت دشمن ہو لیکن اجتماعی طور پر ہماری وفاداری کا دم بھرنے میں تم سے آگے کوئی نہیں۔ ہم یہودی اجتماعی طور پر تمہارے بدترین دشمن ہیں لیکن انفرادی طور پر تم ہمیں بہترین دوست پاؤ گے''۔

قارئین محترم! اس ایک جملے میں یہودی صاحب نے اپنی نفسیات اور طریق کار سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہودی دنیا میں کہیں بھی ہو، نجی طور پر وہ کیسا ہی ہو، لیکن ایک لمحے کے لیے اجتماعی ذمہ داری سے غافل نہیں رہتا۔ نہ اسے یہ بھولنا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کا فرد ہے جس نے چار ہزار سالہ ذلت آمیز اخراج کے بعد ''وعدے کی سرزمین'' (یعنی فلسطین جسے یہودی ''میراث کا ملک'' بھی کہتے ہیں) میں واپسی کی ٹھانی ہے اور وہاں کے باشندوں کو وہاں سے بالجبر نکال کر اپنی بستیاں بسا رہی ہے لہٰذا اس ظلم پر پردہ ڈالنے میں اسے بھی حصہ ادا کرنا چاہیے۔ اس اجتماعی ظلم عظیم میں جس نے لاکھوں فلسطینی مسلمانوں کو بے گھر کر دیا ہے، ہر یہودی اپنی شرکت لازمی سمجھتا ہے لیکن آس پڑوس کے مسلمانوں سے اس کا سلوک مثالی ہوگا۔ جبکہ اس کے برعکس فلسطین کے حالات سے باخبر اکثر مسلمان یہودیوں کے حوالے سے غم و غصے کے جذبات رکھتے ہیں لیکن اجتماعی طور پر یہودیوں کا دست بازو بننے والوں میں آپ کو پیش پیش مسلمان ہی نظر آئیں گے۔

فلسطین سے زیادہ اس کی واضح مثال اور کون سی ہوگی؟ ''اسرائیل مردہ باد'' اور ''القدس کی آزادی تک جنگ رہے گی'' جیسے نعرے لگانے والے بہت ہیں لیکن اس وقت جبکہ حماس کو اس کی اسلامیت پسندی کی سزا دی جا رہی ہے اور فلسطینی مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے، پوری دنیا میں کون ہے جو اہل فلسطین کو اس جاں کنی کے عالم سے نکلنے میں مدد دینے کے لیے آگے آیا ہو؟ ایسی المناک صورتحال میں مسلمان عوام کی طرف سے انفرادی طور پر اپنے فلسطینی بھائیوں کے ساتھ امداد کے بہترین جذبات میں کمی نہیں پائی جاتی، مسلم عوام کا کمال یہ ہے کہ وہ انفرادی کوتاہیوں کے باوجود باطل سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں۔ مشکل ان حکمرانوں کی وجہ سے پیش آتی ہے جن کے ہاتھ میں اس وقت عالم اسلام کی لگام ہے اور وہ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی بجائے مغرب کے وفادار اور اطاعت گزار ہیں۔ مغربی دنیا گزشتہ صدی

سے اس بات کے لیے کوشاں رہی ہے کہ اسے عالم اسلام میں ایسے حکمران میسر آ جائیں جو عوامی سطح پر مسلمانوں میں مقبول ہوں لیکن حب الوطنی اور ملّی وفاداری سے عاری ہوں۔ بظاہر ملک وملت کے خیر خواہ ہوں لیکن کریں وہ کچھ جو مغرب کے حق میں جاتا ہو۔ حماس کی شاندار کامیابی کے بعد اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے جانبدارانہ اور وحشیانہ سلوک پر پورے عالم اسلام کی خاموشی کی آپ اور کیا توجیہ کریں گے؟

یہاں پہنچ کر میں امت کے اہل علم ودانش سے عاجزانہ درخواست کروں گا کہ خدارا مغربی افکار ونظریات سے مغربی تہذیب وتمدن کو گہرائی سے سمجھیں۔ سرسری مطالعہ کر کے اس کے گرویدہ نہ ہو جائیں بلکہ اس کی حقیقت تک رسائی کی کوشش کریں۔ الجزائر کے بعد فلسطین دوسری مثال ہے جہاں مغرب کی نام نہاد روایات کا دوغلا پن اور اخلاقی اصولوں کا کھوکھلا پن ہمارے سامنے آ رہا ہے لیکن ہم اس کی اخلاقیات اور اصول پسندی کے گن گائے نہیں تھکتے۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کا عذر امریکا کی یہودی وزیر خارجہ میڈیمین البرائٹ (گولڈا میئر کے بعد یہ دوسری خاتون ہے جس کی یہودی کے لیے خدمات کا جائزہ لیا جائے تو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا) نے یہ بیان دیا تھا کہ ”امریکا ایسی حکومت کو تسلیم نہیں کر سکتا جو جمہوری اصولوں کے بغیر قائم ہوئی ہو۔“ یار لوگوں نے اس کو جمہوریت پسندی پر محمول کیا تھا۔ لیکن اب حماس کے اسی اصول پر حکومت حاصل کرنے کے بعد جمہوریت پسندی کیوں پامال ہو رہی ہے؟ اس کا جواب اب یہ خاتون یا ان کا کوئی جانشین نہ دے سکے گا۔ اس کے لیے ہمیں مغرب کے طریق کار پر غور کرنا ہوگا۔ مضمون طویل ہو رہا لیکن چند ایک باتیں خدارا غور سے سنیے!

عالم اسلام کی امنگوں کو سرد کرنے اور اسے کنٹرول کرنے کے لیے مغرب نے مختلف طرح کے حربے اپنا رکھے ہیں، مغربی ایشیا، مصر، الجزائر، تیونس، مراکش، انڈونیشیا کے حکمرانوں کی تدبیریں اس کی مثالیں ہیں، تاہم اسلام کو محدود کرنے کی ایک اہم کوشش وہ ہے جو وسطی ایشیا کے نو آزاد مسلم ملکوں ازبکستان، ترکمانستان، قازقستان، تاجکستان، کرغیزستان اور آزربائجان میں یہودیوں اور سابق کمیونسٹوں کی مدد سے کی گئی تھی۔

عالم اسلام میں اسلامی قوتوں کو دبانے کی کوششیں عموماً تین طرح کی ہوتی ہیں (۱) Neutralisation یعنی انہیں بے اثر بنانا (۲) Containment یعنی ان کی قوت واثر کو محدود اور کمزور کرنا اور (۳) Marginalisation یعنی انہیں دھکیل کر کنارے کر دینا۔ ان تینوں طریقوں پر تفصیلی گفتگو ایک مستقل موضوع کا تقاضا کرتی ہے، اس لیے یہ پھر کبھی صحیح، سرِ دست ہم ان عمومی طریقوں میں سے تیسرے طریقے پر بحث کریں گے۔

Marginalisation کا مطلب ہے کسی کا کلی مقاطعہ کر کے اس کا ناطقہ بند کر دیا جائے۔ جب کوئی قوم یا ملک یا گروہ باوجود دباؤ اور دھمکیوں کے نفاذِ اسلامی سے باز نہ آئے اور باضابطہ اور عملاً اس سمت پیش قدمی کرنا شروع کر دے تو مغرب اس کا مقاطعہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ مقاطعہ بالواسطہ، بلاواسطہ، علانیہ اور خفیہ ہر قسم کا ہوسکتا ہے۔ وہ تمام انسانی اور بین الاقوامی حقوق جن کا وہ حقدار ہوتا ہے اور وہ تمام مراعات جن کا وہ مستحق ہوتا ہے اس کے لیے ممنوع قرار دے دیے جاتے ہیں۔ کبھی یہ مقاطعہ مغربی ممالک فرداً فرداً کرتے ہیں، کبھی بعض بڑے ممالک یا خود سب کا سربراہ امریکا کر دیتا ہے اور کبھی یہی کام سلامتی کونسل سے کروایا جاتا ہے۔ کوشش دراصل اس بات کی ہوتی ہے کہ اس قوم کی زندگی دوبھر کر دی جائے اسے عملاً اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے۔ کسے علم نہیں کہ افغانستان کے وہ مجاہدین جو حقیقی اسلامی روح سے سرشار تھے اور جن میں آیندہ کے افغانستان کو صحیح اسلامی خطوط پر لے جانے کی صلاحیت موجود تھی۔ مغرب کی اسی ضرب کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب تک نجیب اللہ کی حکومت رہی مغرب اسے بچانے کے درپے رہا۔ جب وہ باقی نہ رہی تو مغربی اقوام اس بات کی کوشش میں رہے کہ مجاہدین میں مقاطعہ ہو وہ لوگ اقتدار میں آجائیں جو سیاسی سوجھ بوجھ کے حامل ہیں اور بیدار مغز ہیں۔ پھر جب طالبان اقتدار میں آگئے تو ان کا کیسا مقاطعہ ہوا؟ جو کچھ افغانستان میں ہو رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب اس کی جی توڑ کوشش کر رہا ہے کہ خواہ کوئی برسرِ اقتدار آجائے مگر طالبان کو زمام کار نہ ملے۔

یہی کچھ سلوک سوڈان کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اسلامی انقلاب کے آنے سے قبل سوڈان کو

مختلف قسم کی مدد دی جاتی تھی۔ ملک میں کئی رفاہی ادارے جو بین الاقوامی رفاہی اور امدادی اداروں کی شاخیں تھیں کام کرتے تھے۔ بعض مغربی ادارے اپنے طور پر بھی مدد دیا کرتے تھے۔ لیکن انقلاب کے آتے ہی تمام ملکوں اور اداروں نے ہاتھ کھینچ لیے۔ ساری امداد بند کر دی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض عالمی اداروں اور ملکوں نے سوڈان پر پابندیاں لگانی شروع کر دیے۔ عالمی بینک World Bank نے شرح سود میں اضافہ کر دیا۔ عالمی مالی فنڈ IMF نے سوڈان کی رکنیت معطل کر دی۔ حد تو یہ ہے کہ مغربی ملکوں نے بعض امیر مسلم ملکوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ سوڈان کی مدد سے دست کش ہو جائیں۔ چنانچہ نہایت نازک دنوں میں ایک نہایت امیر مسلم ملک نے سوڈان اور افغان مجاہدین کی امداد بند کر دی۔

مذکورہ تینوں طریقوں سے ہٹ کر ایک صورت Aggressive Neutralisation کہلاتی ہے۔ یعنی غیر معمولی طریقے سے باضابطہ حملہ آور ہو کر اسلامی نظام یا اسلامی ملکوں کی اس قوت کو ختم کر دینا جو مستقبل قریب یا بعید میں بالواسطہ یا بلاواسطہ نفاذ اسلام کی راہ میں اور باطل سے مقابلہ آرائی میں سرگرم ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

ایسی ہی ایک کوشش ۱۹۹۲ء میں لائے گئے تاجکستان کے انقلاب کے خلاف کی گئی، تاجکستان میں حزب النہضۃ نے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے کمیونسٹ حکمرانوں کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کیا مگر یہودیوں اور سابق کمیونسٹوں نے نہ صرف یہ کہ کے جی بی K.G.B کی مدد سے اسلامی قوتوں کا تختہ پلٹ دیا بلکہ پورے ملک میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ہزاروں افراد شہید ہوئے اور کئی لاکھ کو افغانستان میں پناہ لینی پڑی۔

عالم اسلام کے پاس دنیا کے بہترین وسائل اور امکانات موجود ہیں۔ Geo Politics کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ کو وہ تمام نعمتیں دے دی ہیں کہ جن سے کوئی قوم سرخرو ہو سکتی ہے۔ شاید اُمت محمدیہ مستجابہ کو جو چنا ہوا قرار دیا گیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔ آخرت میں جو انعامات ان شاء اللہ ملیں گے وہ اس سے الگ ہیں۔ Geo Politics کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کئی امور اہم نظر آتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اور اس کے حرم کو اس حصے میں آباد کیا جو معتدل ترین شمار ہوتا ہے۔ یہی علاقہ گرم پانی کا منطقہ یعنی Warm Water Belt بھی کہلاتا ہے:

(۲) دنیا کی تمام آبی گزرگاہیں بھی اسی علاقے میں ہیں۔

(۳) یہ علاقہ انسانی وسائل سے بھی مالا مال ہے۔

(۴) یہی خطہ خام مال اور توانائی کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔

شاید یہی سبب ہے کہ اس علاقے میں بے شمار جلیل القدر انبیاء آئے اور یہاں کی تاریخ معرکۂ خیر و شر سے کبھی خالی نہیں رہی۔

بات دوسری طرف نکل رہی ہے۔ ہم پھر اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں وہ یہ کہ مغرب اسلام سے ایک ایسی جنگ لڑ رہا ہے جسے موت وحیات کی جنگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہمارے مادی وسائل اور قدرتی گزرگاہوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے لیکن ہم اللہ کی ذات اور اس کی رحمت سے اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اہل ایمان کو فتح وکامیابی سے سرخرو فرمائے گا۔ اسلام اور مغرب کی کشمکش کا نتیجہ ان شاء اللہ باطل کی شکست کی صورت میں نکلے گا۔

مغرب کی پشت پناہی سے فائدہ اُٹھا کر یہود جتنا بھی ظلم ڈھالیں اور مسلمان اس پر خاموش رہ کر ارض مقدس سے بے وفائی کا عذاب جتنا بھی سمیٹ لیں، یہ بات طے شدہ ہے کہ یہود کو اس دجّال نوازی کا حساب یہیں دینا ہوگا۔ آخری عدالت سے پہلے ایک عدالت سرزمین القدس پر لگے گی اور یہود نامی ہر چیز کو پتھروں اور درختوں کے پیچھے سے نکال نکال کر پٹخ مارے گی۔ یہ بات پتھر پر لکھی حقیقت سے زیادہ پکی اور سچی ہے۔ فلسطینی مسلمانوں اور دنیا بھر سے یہودیوں کے معرکے کا انجام یہی ہونا ہے۔ لمحۂ فکریہ تو ان اہل اسلام کے لیے ہے جو حق و باطل کے اس عظیم معرکے میں دور کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کو القدس پر قربان ہوتے دیکھ کر بھی وہ یہ سمجھنے پر تیار نہیں کہ یہ قربانیاں درحقیقت تمام مسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ ہیں اور جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی اس سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے مگر اس نے اپنی اس شقاوت قلبی سے توبہ نہ کی تو یہودیوں اور یہود نوازوں پر برسنے والا کوڑا اس کی پیٹھ پر بھی برس کر رہے گا۔

قیامت کے سائے

اور بالآخر اس قیامت نے اپنے سائے پھیلانے شروع کر دیے ہیں جو سرزمین شام پر ۱۹۴۷ء سے منڈلا رہی تھی۔ (شام کسی زمانے میں ان چار علاقوں کا نام ہوا کرتا تھا: شام، اُردن، لبنان اور فلسطین۔ احادیث مبارکہ میں جب اس علاقے کے متعلق کوئی پیش گوئی وارد ہو یا تاریخ کی کتابوں میں شام کا لفظ آئے تو اس سے ان چار ملکوں پر مشتمل پورا علاقہ مراد ہوتا ہے جو کسی وقت چار صوبے ہوا کرتے تھے۔ اسرائیل کے جنونی صہیونی حکمران بھی اس پورے علاقے کو اپنا وراثتی ملک سمجھتے ہیں اور شام و اُردن کے عیش پسند اور غیرت و حمیت سے محروم حکمران اپنی ذمہ داریوں سے جتنا بھی نظریں چرائیں اور چند دنوں تک جان بچے رہنے کے لیے جتنی بھی خوشامد کریں، یاد رکھیں کہ یہودی بیویاں گھر میں رکھ کر نیم عیسائی نیم یہودی نسل زیادہ دنوں تک نہ جنم دے سکیں گے، عنقریب صہیونیت کی خون آشام یلغار کا رُخ ان کی طرف ہونے والا ہے) اس قیامت کا آغاز درحقیقت آج سے ۹۰ سال قبل ۱۹۲۳ء میں اس وقت ہو گیا تھا جب ترکی میں Treaty of Versaille کے تحت خلافتِ عثمانیہ ختم کر کے جمہوریت قائم کر دی گئی تھی (جمہوریت کے ایجادِ باطل ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ خلافت کے مقابلے میں وضع کی گئی ہے) اور خلافت کے زیرِ انتظام علاقوں پر لیگ آف نیشنز کے ''انتداب'' کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۰ء تک اُمت مسلمہ پر تین قیامتیں ٹوٹیں۔ ان میں سے ہر ایک قیامت دوسری کا راستہ ہموار کرتی رہی لیکن چونکہ اُمت کے مقتدر طبقے نے اس کا نوٹس نہ لیا بلکہ ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تو ایک حادثۂ عظمیٰ کے بعد

دوسری قیامت عظمیٰ ٹوٹ ٹوٹ کر برستی رہی۔

☆ پہلی قیامت کی نقشہ کشی یوں ہوئی کہ صہیونی منصوبہ سازوں کو خلافت کی اہمیت کا علم تھا کہ درحقیقت وہ روئے زمین پر اللہ کی بادشاہی کے قیام کی ضامن ہوتی ہے جبکہ وہ ابلیس کی مدد سے دجّال کی بادشاہی کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے برطانیہ اور فرانس کے توسط سے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی کہ کوئی آزاد یا نیم آزاد مسلم ممالک عثمانی خلیفہ کو اپنے ہاں پناہ دے نہ ہی اپنے یہاں آنے اور نظام خلافت کو زندہ کرنے کی کوئی صورت بننے دے۔ عثمانی خلیفہ نے یہ کوشش کی کہ اگر کوئی مسلم ملک انہیں اپنے پاس پناہ دینے اور نظمِ خلافت کے احیا کی اجازت نہیں دیتا تو کم از کم یہ صورت پیدا ہو جائے کہ وہ سرزمین حجاز جا کر حرمین شریفین میں پناہ گزین ہو جائیں لیکن پہلے برطانیہ کے بدنام ترین ایجنٹ شریف مکہ نے (جو اُردن کے موجودہ حکمران کا پردادا تھا) اور پھر اس کے بعد ان کی جگہ لینے والے شاہ عبدالعزیز بن آل سعود نے انہیں اس کی بھی اجازت نہ دی کیونکہ اس سے اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی تھی جو خلافتِ عثمانیہ کو حرمین کی خدمت کے اعزاز سے محروم کرنے اور نجد و حجاز کو آل سعود کے سپرد کرنے کے حوالہ سے برطانیہ اور آل سعود کے درمیان ہوا تھا۔

خلافتِ عثمانیہ کا احیا جب ممکن نہ ہوا اور اس کا سقوط زمینی حقیقت سمجھا جانے لگا (آخری عثمانی خلیفہ کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ہوا جبکہ سقوط خلافت کا سانحۂ عظمیٰ ۱۹۲۳ء میں ہوا تھا۔ بیچ کے پندرہ سال فری میسن تحریک اور احیائے خلافت کی تحریک کے درمیان زبردست کشمکش رہی) تو اُمت مسلمہ کے صالح طبقے نے کوشش کی کہ کم از کم کوئی دوسری خلافت قائم ہو جائے لیکن International Zionist Plam (عالمی صہیونی منصوبہ) ترتیب دینے والوں نے خلافت اسلامیہ کو زندہ نہ ہونے دیا اور اس کے لیے کی جانے والی ہر کوشش پر گہری نظر رکھ کر اس کو ناکام بنانے کی بھرپور جدوجہد کی۔ یہ سلسلہ آج تک...... طالبان کی امارت اسلامیہ کے سقوط تک...... جاری ہے۔ انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں عرب وعجم کے علما ومشائخ اور مجاہدین سرتوڑ کوشش کررہے تھے کہ کسی طرح خلافت قائم ہو جائے اور اس کے

جھنڈے تلے مسلمانوں کو سایۂ عافیت نصیب ہو جائے لیکن تین شخصیتوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ ان میں سے دو کا کردار مثبت نما تھا اور ایک کا منفی نما۔ شریف مکہ اور آغا خان سوم مثبت قسم کی منفی کوششیں کر رہے تھے یعنی یہ کہ خلافت قائم ہو جائے لیکن خلیفہ وہ خود ہوں اور شاہ عبدالعزیز کی کوشش تھی کہ خلافت سرے سے قائم ہی نہ ہو۔ ان کے مطابق اس کی کوئی ضرورت ہی نہ کل تھی اور نہ آج۔ عالمی فری میسن کی پشت پناہی میں کی جانے والی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی بازیافت کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور اس ناکامی میں جن جن کا حصہ تھا ان میں سے شریف مکہ کی اولاد ’’المملکۃ الأردنیۃ الإسلامیۃ الہاشمیۃ‘‘ کی سربراہ ہے اور شاہ عبدالعزیز کے وارث ’’جلالۃ الملک وخادم الحرمین الشریفین‘‘ ہیں۔ رہے آغا خان تو وہ ماشاء اللہ کل ’’حاضر امام زمان‘‘ تھے اور آج تو وہ ’’خدا کا اوتار‘‘ ہیں۔

☆ اُمت مسلمہ پر دوسری قیامت اس وقت ٹوٹی جب ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو روئے ارض کے خطۂ فلسطین میں ’’اسرائیل‘‘ کا قیام عمل میں آیا۔ ’’اسرائیل‘‘ کا روئے ارض اور وہ بھی ارض فلسطین میں قیام دراصل روئے ارض پر ’’ابلیس اور دجّال کے ملک اور اتھارٹی‘‘ کی عبوری نہیں بلکہ حقیقی اقامت تھا۔ یہ کسی خطے میں کسی قوم کا بسایا جانا نہ تھا، یہ ارض فلسطین میں بنی اسرائیل کی واپسی کا نقشہ بھی نہیں تھا، بلکہ روئے ارض پر ’’خلافتِ اسلامیہ‘‘ اور ’’ملک اللہ‘‘ کے باضابطہ خاتمے کے بعد ابلیس اور دجّال کے ملک کا باضابطہ قیام تھا۔

۱۹۴۸ء میں روئے ارض ’’اسرائیل‘‘ نام کی ’’ابلیس اور دجال کی اتھارٹی‘‘ کے باضابطہ قیام سے لے کر آج تک پوری دنیا میں عام طور پر چار طرح کے مسلم ممالک پائے جاتے ہیں۔

(۱) ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی کے قیام میں مدد کرنے والے ممالک۔

(۲) ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی کے قیام کے بعد اسے تسلیم کر لینے والے ممالک۔

(۳) ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی کے قیام کے بعد اسے خفیہ طور پر تسلیم کر لینے والے ممالک۔

(۴) ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی کو خفیہ اور علانیہ ہر دو صورت میں تسلیم نہ کرنے والے یا تسلیم کر لینے کے بعد دوبارہ انکار کر دینے والے ممالک۔ یہ چوتھی قسم بہت کم ہے اور یہی وہ قسم

جو خدا اور رسول کی علانیہ بغاوت سے تا حال بچی ہوئی ہے۔

اس ابلیسی اور دجّالی ''اتھارٹی'' نے اپنے قیام کے بعد اپنی قوت کو توسیع دیتے ہوئے ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر بھی قبضہ کر لیا اور مسجدِ اقصیٰ اور گنبدِ صخرہ پر عملاً ان کا اقتدار قائم ہو گیا۔ یہ دوسری قیامت کا نکتہ عروج تھا لیکن افسوس کہ مسلم اُمہ کی اکثریت اس معاملے کی سنگینی سے بے خبر رہی۔

☆ اُمت مسلمہ پر تیسری قیامت اس وقت ٹوٹی جب چار اگست ۱۹۹۰ء کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سرزمین کے ایک حصے پر ''بالفعل'' دجّالی طاقت کا قبضہ ہو گیا اور امریکی، برطانوی، فرانسیسی، آسٹریلوی فوجیں ''جزیرۃ العرب'' میں ہزاروں کی تعداد میں آ کر جاگزیں ہو گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سانحہ کے بعد یہ وہ سب سے بڑا سانحہ ہے جو اُمت کو پیش آیا۔ یہود و نصاریٰ کو یہاں آنے کی اجازت دے کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس میثاق کی تکمیل کی تھی اور جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مزید آگے بڑھایا اور استحکام بخشا تھا اور جس میثاق کو پورا کرنے اور قائم رکھنے کی قیامت تک اُمت مسلمہ محمدیہ ذمہ دار ہے، اس میثاق کو توڑ دیا گیا اور جب تک یہ ٹوٹا رہے گا ہماری حیثیت غداروں اور عہد شکنوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس میثاق کی ایک شق تھی: ''اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب'' (یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دو) ۱۹۹۰ء میں اس میثاق کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے دجّالی قوتوں کو جزیرۃ العرب میں داخل ہونے دیا گیا اور اب جبکہ لبنان اور فلسطین میں دجّال کے ہرکاروں نے قہر برپا کیا ہوا ہے، سعودی عرب ..... جس پر اس قضیے میں مظلوم مسلمانوں کی مدد کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے ..... نے اپنے نصاب میں تبدیلی کا اعلان کر کے اس المناک وقت میں دین کا ایک اور ستون گرا دیا ہے۔ اس اعلان کے مطابق وہ تمام آیات اور احادیث سعودیہ کے نصاب سے خارج کر دی جائیں گی جن میں اوپر ذکر کی گئی حدیث شریف کا مفہوم یا یہود و نصاریٰ کے خلاف کسی طرح کا مواد پایا جاتا ہو۔

جب کویت پر قبضہ کے بہانے یہودی، صہیونی اور دجّالی فوجیں جزیرۃ العرب میں بالفعل

داخل ہوکر قابض ہوگئیں تو اپنی بے بسی اور مجبوریوں کے تحت سعودی حکمران اس آمد اور قبضہ کو اپنی جانب سے ''طلب کردہ مدد'' قرار دے رہے تھے لیکن اس سے بھی زیادہ عبرت ناک صورتِ حال یہ تھی کہ اس وقت کچھ علمائے سوء ایسے بھی تھے اور آج بھی ہیں جو قرآن واحادیث مبارکہ، اجماع امت اور تعامل اُمت سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جزیرۃ العرب میں یہود ونصاریٰ کے لانے کے حق میں دلائل فراہم کررہے تھے۔ غالبًا ایسا کرکے وہ اپنے خیال میں ''حرمین'' کی حفاظت کو یقینی بنارہے تھے۔

ہماری جہالت وحماقت ہے کہ اسرائیل جب کسی فریق سے لڑتا ہے تو ہم اسے زمین کے ایک خطہ کی لڑائی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ زمین کی لڑائی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو ایمان وعقیدہ اور نظریہ کی جنگ ہے۔ یہ معرکۂ دجّال ہے۔ یہ ''جنگ عظیم سوم'' (آرمیگاڈون، ہرمجدون) کا نقطۂ انفجار ہے۔ یہ ابلیس اور اس کے ہمنواؤں کا ''دجّال اکبر'' کے خروج کی شدید خواہش کا اظہار ہے۔ یہ سارے مل کر ابلیسی منصوبہ کو پورا کرنا چاہتے ہیں جبکہ اُمت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ربانی منصوبہ کو پورا کرے۔ یہ ہمارا اللہ سے کیا گیا وہ عہد ہے جس کے صلے میں ہمیں ''اُمت مجتبیٰ'' (منتخب اُمت) قرار دیا گیا تھا۔ اس میثاق کا مطلب ہے کہ روئے ارض پر ''ملک اللہ'' (اللہ رب العالمین کی بادشاہی) قائم کی جائے۔ جب تک اُمت اس جدوجہد میں لگی رہے گی وہ ''اجتبائیت'' کے مقام پر فائز رہے گی اور جب وہ اس جدوجہد سے دستبردار ہوجاتی ہے تو اس مقام اور اعزاز سے محروم کردی جاتی ہے اور پھر وہ ذلت وخواری اس کا مقدر ہوجاتی ہے جس کی دائمی اور ابدی مہر یہود پر لگ چکی ہے۔ عرب کے مالدار حکمران ہوں یا خوف سے تھرتھراتے عجم کے صاحبانِ اقتدار، اگر اسرائیل کے مقابلے میں مظلوم مسلمانوں کے حق میں زبان نہیں کھولتے تو انہیں چوتھی قیامت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ فیصلہ کن ہوگی اور دنیا کے وہ حقیر مزے جن کی خاطر انہوں نے زبان بند رکھی، ان سے چھین کر انہیں ابدی عذاب میں جکڑ لے گی۔ اس سے فقط وہی بچے گا جو آج فلسطین ولبنان کے مسلمانوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف، ان کے غم کو اپنا غم اور ان کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے۔ دنیا مانے یا نہ مانے! فتح بالآخر انہی نہتے اور

لاچار مسلمانوں کی ہونی ہے جو دجّالی ٹینک کے مقابلے میں داؤدی پتھر لیے میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ بس یہ ایمان والوں کا امتحان ہے کہ کون اپنے جذبات اور عمل کا رُخ کس طرف موڑے رکھتا ہے؟؟؟

اس خبر میں ''عدمِ رواداری'' سے مراد وہ آیات، احادیث اور واقعات ہیں جن میں یہود کی اہلِ اسلام سے غداری اور جزیرۃ العرب سے ان کی بے دخلی کا تذکرہ ہے۔ اس طرح کی ''اصلاحات'' آہستہ آہستہ سعودی عرب کو غیر ملکی افواج کے مقابلے میں مفلوج و بے بس کر چھوڑیں گی۔

ستم گروں کو کون سمجھائے؟

اسکول سے واپسی کے بعد دنیا میں اس کا ایک ہی شوق تھا۔ وہ بستہ رکھ کر کھانا کھاتا، آرام کرتا اور پھر کھرپی اور قینچی اُٹھا کر مکان کے پچھواڑے چل دیتا جہاں دنیا کا واحد شوق اس کا منتظر ہوتا۔

اس نے چھوٹے سے باغیچے میں کئی طرح کی کیاریاں بنا رکھی تھیں اور بساط بھر کوشش کی تھی کہ مقامی طور پر دستیاب تمام پودے اس کی ''نرسری'' میں موجود ہوں۔ وہ بھی جو اس نے دوستوں سے تبادلے میں جمع کیے اور وہ بھی جو اس نے پھولوں کی نمائش سے خریدے......

اگرچہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے کئی دن والدین کو منانے میں لگ گئے تھے۔

اس کی کُل کائنات یہ باغیچہ تھا۔ جنوبی لبنان کے سرحدی قصبے کی زرخیز زمین میں قائم یہ باغیچہ قسما قسم پھولوں اور پودوں سے اَٹا ہوا تھا۔ حسنِ ذوق اور حسنِ ترتیب کی اعلیٰ کوششوں پر مشتمل اس نمونہ کو جو بھی دیکھتا، ہشام العدوی نامی اس بچے کی محنت کی داد دیے بغیر نہ رہتا۔

اس کے والدین اور اساتذہ بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اس صحت مند سرگرمی کی راہ میں آڑے نہ آتے تھے..... اور پھر وہ خونیں دن آ گیا جب اس معصوم بچے نے کھرپی رکھ کر بندوق اُٹھا لی اور پھولوں کی کیاریاں سینچنے کی بجائے آگ اور شعلوں سے کھیلنے کا مشغلہ اپنا لیا۔

ہوا یوں کہ ہشام ایک دن بیمار تھا، وہ اسکول نہ جا سکا۔ اگلے دن اس کو بخار نے ایسا نڈھال کیا کہ وہ بستر سے لگ کر رہ گیا۔ اس نے کوشش کی کہ باغیچے سے ایک مرتبہ ہو آئے لیکن اس کا اَنگ اَنگ دُکھ رہا تھا۔ باوجود کوشش کے اس سے اُٹھا نہ گیا۔

اس کو غم تھا کہ پودے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پھول اس سے سرگوشیاں کرنے کو

بیتاب ہوں گے۔ ننھی کونپلیں اس کے قدموں کی آہٹ نہ سن کر پریشان ہوں گی۔

اس کے والد سے اس کی بے چینی دیکھی نہ گئی۔

اس نے ہشام کی کھرپی اُٹھائی اور اس کو اطمینان دلایا کہ تمہاری جگہ میں تمہارے ''دوستوں'' سے مل آتا ہوں۔

ہشام نے اپنی کھرپی والد کے ہاتھ میں دیکھی تو اس کو سکون آ گیا۔ اس نے تکیہ پر سر کو ڈھیلا چھوڑا اور آنکھیں موند لیں لیکن اس کو خبر نہ تھی کہ یہ اطمینان کی آخری نیند ہے۔

آج کے بعد اس کو نیند بھی آئے گی تو وہ شعلوں میں لپٹی ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو کی بجائے بارود کی بو اور خون کی خنک اس کا شوق ہوگی۔ وہ سونے کی بجائے سونے والوں کو جھنجھوڑے گا اور انہیں ایک مقصد دے گا۔ وہ پھلواریاں اُگانے کی بجائے مذہب و وطن کے دفاع کے لیے صبح و شام برسرِ پیکار ہوگا۔

ہشام کی بیماری سے پہلے سرحد کے حالات خراب ہو گئے تھے۔ اکا دکا جھڑپوں کی اطلاعات تھیں۔ کبھی کبھار گولوں کے دھماکے بھی سنائی دیتے تھے۔ ہشام کی بیماری تک حالات مزید دگرگوں ہو گئے تھے اور اسرائیلی فوج کے حملوں کی افواہیں قصبے کے ہر باشندے کی زبان پر تھیں۔

جب اس کے والد کھرپی اُٹھا کر باہر نکلے تو اس کی اماں جان باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھیں۔ ابھی انہیں گئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی اور پھر پے در پے گولے برسنے شروع ہو گئے۔

پہلا دھماکا تو ایسا لگتا تھا کہ ان کا گھر اُڑا چھوڑے گا۔ ہشام اُچھل کر بستر سے گرا اور پھر اُٹھتے ہی باغیچے کی طرف بھاگا۔

اس کے والد خون میں لت پت ایک کیاری کے قریب پڑے ہوئے تھے۔ کھرپی ان کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور اسرائیلی گولے نے ان کو اتنا شدید زخمی کر دیا تھا کہ وہ دم پر تھے۔

ہشام کی ماں نے ان کا سر اُٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ ہشام ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ بارود بھرے گولے نے اس کا خوبصورت باغیچہ ہی تباہ نہ کیا تھا، اس کے

والد کی جان بھی لے لی تھی۔

وہ دردناک حالت میں جان دے رہے تھے اور ان کی یہ تکلیف دہ اور المناک کیفیت ہشام کے دماغ میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ جب انہوں نے آخری ہچکی لی تو ان کی آنکھیں ہشام کی کھرپی پر جمی ہوئی تھیں گویا کہہ رہی ہوں: ''بیٹا! میں نے تمہارا شوق پورا کرنے میں کوتاہی نہیں کی، تم میرا انتقام لینے میں کمزوری نہ دکھانا۔''

ہشام کی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں...... وہ معصوم سا لڑکا تھا...... لیکن اس دن وہ یکا یک اپنی عمر سے کئی سال آگے پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا خون اُترا کہ وہ انتقام کے علاوہ ہر چیز کو بھول گیا۔ اس کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے اور دماغ کے ہر خلیے ایک ہی صدا آ رہی تھی:

''انتقام، انتقام، انتقام......''

ہر اس پھول کا انتقام جسے عین بہار میں نوچا گیا۔

ہر اس کلی کا انتقام جسے بلاوجہ مسل ڈالا گیا۔

ان محترم بوڑھوں کا انتقام، موت کے وقت جن کی بے بس آنکھوں میں صرف انتقام کی تمنا تھی۔

ہر اس ماں بیٹی، بہن کا انتقام جسے بے عزت کیا گیا۔

ان بچوں، ضعیف العمر بزرگوں اور عورتوں کا انتقام جو بغیر کسی قصور کے صہیونی درندگی کا شکار ہوئے۔

ان بوڑھے ہاتھوں کا انتقام جنہوں نے مرتے دم بھی اپنے معصوم بچوں کی خواہش کے احترام میں کھرپی تھام رکھی تھی۔

اس دن سے ہشام سراپا انتقام بن گیا۔

اس نے سوچا: اگر میرے وطن کے نوجوانوں نے دفاع کی خاطر خون دینے اور لینے کا عہد نہ کیا تو:

خوب صورت پھلواریاں اسی طرح ویران ہوتی رہیں گی۔

قابلِ احترام بزرگیاں اسی طرح سسک سسک کر دم توڑیں گی۔

گھر اُجڑتے اور قبرستان آباد ہوتے رہیں گے۔

آزادی پامال اور عزتیں خراب کی جاتی رہیں گی۔

صہیونی دہشت گرد درندگی کا پیکر بن کر حملہ آور ہوں گے اور......

کوئی بش صاحب ان کے لیے بموں اور میزائلوں کی کھیپ بھجوائیں گے۔

کوئی کونڈو صاحبہ آ کر ہمیں غیر مسلح کرنے کا مطالبہ کریں گی۔

عالمی برادری اسرائیل کو حملوں کی اجازت اور ہمیں ''دہشت گرد'' کا لقب دے گی۔

جب یہی ہونا ہے تو پھر......

کیوں نہ ہم سراپا آتش بن جائیں۔

وہ آگ جو انتقام کے بغیر ٹھنڈی نہیں ہوتی۔

وہ انتقام جو پورا ہوئے بغیر نہیں رُکتا۔

سو، اس دن سے اسرائیل کے دشمنوں میں ایک شعلہ صفت مجاہد کا اضافہ ہو گیا اور مجھے یقین ہے جب بھی اسرائیل کا گولہ کسی فلسطینی یا لبنانی مسلمان کے آنگن میں گرتا ہے تو ایک اور ہشام العدوی پیدا ہو جاتا ہے۔

معصوم بچے کھرپیاں رکھ کر کلاشن اُٹھا لیتے ہیں۔

پھولوں کی کیاریاں سینچنے کی بجائے آگ اور خون میں غوطہ زن تیراک بن جاتے ہیں۔

بے فکری کے مزے چھوڑ کر خود کش بمبار بن جاتے ہیں۔

عالمی برادری کو کون سمجھائے ''دہشت گرد'' کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

یہ ''دہشت گرد'' ان گولوں سے پیدا ہوتے ہیں جو کسی کا آنگن اُجاڑتے ہیں۔

یہ ان بموں اور میزائلوں سے جنم لیتے ہیں جو کسی معصوم شوق کا خون کرتے ہیں۔

اگر تمہیں امن چاہیے تو ستم گروں کو سمجھاؤ!

کسی کے ارمانوں کا خون نہ کریں .....

کسی کی آزادی پامال نہ کریں، عفت و عصمت سے نہ کھیلیں۔

محترم شخصیات اور مقدس مقامات کی توہین نہ کریں۔

ورنہ......

تم دہشت گردی، دہشت گردی پکارتے رہ جاؤ گے اور.....

ایک کے بعد ایک نامور دہشت گرد پیدا ہوتا رہے گا۔

زرقاوی، شامل، داداللہ اور عدوی جنم لیتے رہیں گے۔

اور غیرت و وفا کی تاریخ رقم کر کے امر ہوتے جائیں گے۔

آخری واپسی

محترم مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ آپ کی اور ''ضربِ مومن'' کی پوری ٹیم کی خیر وعافیت چاہتا ہے اور اللہ سے دُعا کرتا ہے کہ اللہ آپ کی عمر میں برکت کرے۔

بندہ ''بولتے نقشے'' نہایت غور سے پڑھتا ہے ''اقصیٰ کے آنسو'' از ''فلسطین کا ایک عاشق'' کے سلسلہ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ جب یہ سلسلہ درمیان میں کافی عرصے تک منقطع ہو جاتا ہے تو یہ عرصہ بندہ کے لیے سوہانِ روح بنا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ارضِ فلسطین پر جو مضامین لکھ چکے اور لکھے جا رہے ہیں ان کو کتابی شکل دی جائے گی کہ نہیں؟

علاوہ ازیں چند سوالات جو بندہ کے ذہن میں ہر وقت گردش کرتے ہیں، انہی سوالات نے مجھے قلم اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔

۱...... یہودیوں کو کس طرح پتہ چلا کہ وہ اس ارضِ قدسی کے وارث ہیں؟

۲...... یہودی تو تورات پر یقین رکھتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی لیکن وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح بادشاہت چاہتے ہیں، آخر کیوں؟ ایسی عالمگیر بادشاہت کی چاہت ان میں کیونکر راسخ ہوگئی؟

۳...... یہودی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا گیا، عیسائی دنیا کا اس بارے میں کون سے عقیدے پر اعتقاد ہے؟ جبکہ ہم مسلمان تو آپ علیہ السلام کے

باحیات ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

۴...... دجال کون ہے؟ پہلے پہل کون سے خطے پر نمودار ہوگا؟

۵...... ایک اور بات یہ ہے کہ فزکس کے استاذ نے جب ہمیں آئن اسٹائن (جو کہ مذہبی لحاظ سے یہودی تھا) کے Special Theory of Relativity کے بارے میں بتایا کہ اس کا منبع شبِ معراج کا واقعہ ہے اور مزید استاذ نے بتایا کہ آئن اسٹائن نے کہا کوئی بھی مادی چیز Velocity of light (روشنی کی رفتار) سے تیز حرکت نہیں کرسکتی اور بقول استاذ ہمارے علمائے کرام یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روشنی کی رفتار سے بھی تیز اُٹھ کر چلے گئے تھے تو یہ کیا معمہ ہے؟ اس سلسلے میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔

والسلام

فخرالاسلام ورانوی خٹک

جواب:

۱...... یوں کہیے کہ ان پر یہ وہم اور فاسد خیال کس طرح مسلط ہوا کہ اتنا دھتکارے جانے کے باوجود خود کو القدس جیسی مقدس سرزمین کا وارث سمجھتے ہیں؟ ہوا یوں کہ ان کے بڑوں کو اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں بسایا مگر انہوں نے اسے گناہوں سے بھر دیا۔ اس کی سزا میں ان پر ایک عراقی بادشاہ بخت نصر کو مسلط کیا گیا۔ اس نے ان کو بُری طرح پامال کیا اور لونڈی غلام بنا کر ساتھ عراق لے گیا۔ کافی عرصہ رونے دھونے اور توبہ تلافی کے بعد جب اس کی غلامی سے نکل کر واپس پہنچے تو کچھ عرصہ بعد پھر پرانی عادتیں لوٹ کر آ گئیں اور سود، زنا، شراب، چوری، موسیقی جیسی حرکتوں میں گردن گردن دھنس گئے۔ ان کے انبیا ان کو سمجھاتے رہے مگر یہ مست سانڈ کی طرح گناہوں کی لذت میں ڈوب کر ان کی بے ادبی اور نافرمانی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو ان کم بختوں نے ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کو محض گناہوں پر ٹوکنے کی بنا پر پھانسی دینے کا منصوبہ بنایا اور اپنے تئیں دے بھی ڈالی، پھر اس سنگین حرکت پر نادم ہونے کی بجائے جشن بھی مناتے رہے۔ لہٰذا جب پیمانہ لبریز ہوگیا تو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے ستر سال بعد عذاب کا کوڑا پوری شدت سے برسا۔ ان پر رومی بادشاہ ٹائٹس مسلط ہوا جس نے ان کو بری طرح تباہ و برباد کیا۔ ہیکل سلیمانی ڈھادیا اور ان کو قتل و غارت کر کے یہاں سے نکال باہر کیا۔ یہ دنیا بھر میں تتر بتر ہو گئے۔ ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلت اور رسوائی کا ٹھپہ لگادیا گیا۔ یہ لوگ دنیا میں یہاں وہاں ذلیل ہو کر وقت گزارنے لگے۔ ان کے جانے کے بعد عیسائیوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے ان سے چھڑا کر بیت المقدس فتح کر لیا۔ اس وقت سے فلسطین کی وراثت اور مسجدِ اقصیٰ کی تولیت مسلمانوں کے پاس ہے لیکن یہود کے دماغ سے خناس نکلا نہیں۔ یہ اپنے گناہوں سے توبہ کی بجائے اپنے بچوں کو یاد دلاتے رہے: ’’اگلے سال یروشلم میں‘‘ اس سے پہلے وہ دو مرتبہ یہاں سے دھتکارے جانے کے بعد واپس آئے تھے اور معافی تلافی کر کے آئے تھے اس لیے انہیں مہلت دے دی گئی لیکن اب کی مرتبہ تو وہ بدمعاشی اور غنڈہ گردی کرتے ہوئے آئے ہیں، اس لیے یہ ان کی آخری واپسی ہے۔ اس مرتبہ انہیں مہلت نہیں ملے گی۔ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے وقت انہوں نے انگریزوں کو رشوت دے کر یہ سرزمین لے لی اور فلسطینی مسلمانوں پر طاقت اور دولت کے بل بوتے پر ظلم و ستم ڈھا کر انہیں یہاں سے جلاوطن کر کے ان کی جگہ دنیا بھر سے یہودیوں کو لا لا کر بساتے رہے۔ ظلم و ستم کی یہ خونچکاں روداد ۱۹۱۷ء سے آج تک جاری ہے۔ اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک دنیا بھر کے خصوصاً پاکستان و افغانستان کے مسلمان فلسطینی بھائیوں کا ویسا ہی ساتھ نہیں دیتے جیسا دنیا بھر کے یہودی اسرائیلی یہودیوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔

ہم اس دور میں جی رہے ہیں جو اس اعتبار سے تاریخی عہد ہے کہ اس میں یہود کئی ہزار سال بعد بغیر توبہ کیے یہاں واپس آئے ہیں لہٰذا اب کہیں نہ جا سکیں گے، یہیں ختم ہوں گے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان یہ لوگ یہاں کی زمینیں مہنگے داموں خریدتے رہے۔ علمائے کرام منع فرماتے رہے کہ ان کو زمین کسی قیمت پر نہ بیچی جائے حتیٰ کہ ہندوستان میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے بھی فتویٰ منگوایا گیا جو امداد الفتاویٰ جلد سوم صفحہ ۵۹ پر درج

ہے لیکن دنیا پرستوں نے ان کی بات نہ سنی جیسا کہ آج کل سعودی عرب میں تبوک سے خیبر تک کے زمینی مالکان نہیں سن رہے اور جیسا کہ شمالی علاقہ جات میں مقامی لوگ آغا خان کو زمینیں بیچنے سے باز نہیں آ رہے (اور اب باز آئیں بھی تو کیا؟) آخر کار ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ نے فلسطین کو مسلمانوں اور یہودیوں میں تقسیم کرنے کا نادر شاہی فیصلہ صادر کر دیا۔ اس فیصلے کے حق میں صرف تین ووٹ آئے تھے۔ شرط پورا کرنے کے لیے مزید تین ووٹ درکار تھے جو ہیٹی، فلپائن اور لائبیریا جیسے قلاش ملکوں پر دباؤ ڈال کر حاصل کیے گئے۔ اس جانبدارانہ تقسیم کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فی صد رقبہ صرف ۳۳ فی صد یہودیوں کو اور بقیہ ۴۵ فی صد رقبہ ۶۷ فی صد مسلمانوں کو دیا گیا حالانکہ اس وقت فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فی صد حصہ یہودیوں کے قبضے میں تھا اور ان کا حقیقی تناسب ۳۳ فی صد بھی ہرگز نہ تھا۔ یہ تھا اقوامِ متحدہ کا انصاف!!! اور یہ تھا یہودیوں کا ''قومی وطن سے قومی ریاست تک'' کا سفر۔ اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ یہود کی طرح ان لوگوں کا انجام بھی انتہائی عبرت ناک ہوگا جو اس ظلم و ستم پر بھی یہود کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ جب یہودی یہاں توبہ کر کے آئے تو بداعمالیوں پر نہ بخشے گئے، اب تو وہ دھوکا اور ظلم کے بل بوتے پر آئے ہیں اور ہر وقت یہاں اندھیر مچائے رکھتے ہیں تو کس طرح بخشے جا سکتے ہیں؟؟؟

جب ان کی حیثیت مستحکم ہوگئی اور انہوں نے فلسطین کی قابل ذکر زمین پر قبضہ کر لیا تو ۱۹۴۸ء میں اپنے مستقل ملک اسرائیل کا اعلان کر دیا۔ یہ ملک روئے زمین پر دجّالی سلطنت قائم کیے جانے کی پہلی اینٹ تھا لیکن دنیا بھر کے مسلمانوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اسے فلسطینیوں اور عربوں کا مسئلہ سمجھتے رہے۔ یہود کی خفیہ سازشیں اور علانیہ پیش قدمی جاری رہی۔ یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھیلتے فلسطین کے دارالحکومت القدس تک جا پہنچے۔ جہاں مسجد اقصیٰ ہے اور جہاں اس مسجد کے صحن کے بیچ میں وہ مقدس چٹان ہے جس کی بے ادبی پر ان کو دھتکارا گیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق اس چٹان کے نیچے تورات کی تختیاں اور تابوت سکینہ دفن ہے جس میں انبیائے بنی اسرائیل کے نوادرات ہیں۔ اگر یہ نوادرات وہاں ہوں بھی تو ان کے وارث مسلمان ہیں اس لیے کہ وہ ان انبیاء پر...... اگرچہ وہ ہم سے پہلے کے

ہیں...... پورا پورا ایمان لاتے اور ان کا ادب کرتے ہیں۔ یہودیوں نے تو ان مقدس ہستیوں کی جو ان کی قوم سے تھیں، دکھ دے دے کر ستایا، گستاخی اور نافرمانی کی حتیٰ کہ ان کو شہید کیا۔ ان پر انہوں نے ان کے لیے بددعا کی۔ یہ کس منہ سے ان کے تبرکات کے قریب جانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

نومبر ۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷،۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۶۷ء میں القدس پر قبضے کے بعد سے مسجد اقصیٰ کو...... معاذ اللہ ثم معاذ اللہ...... ڈھانے کی کوششیں مسلسل جاری ہیں۔ نہتے فلسطینی مسلمان اپنے جسموں کی باڑ قائم کر کے اس مقدس مسجد کی حفاظت کر رہے ہیں اور پورا عالمِ اسلام ان کی قربانیوں سے بے خبر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔ اگر کسی کو زیادہ ہی درد اُٹھے تو یہ بحث چھیڑ لیتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کا مصداق وہ ہال ہے جو نماز کے لیے بنایا گیا یا وہ گنبد جو چٹان پر قائم کیا گیا؟ اب تو اسرائیلی ملاؤں اور صہیونیت زدہ اسکالروں نے مسجد اقصیٰ کو ڈھانے کے لیے جمع کیے جانے والے ڈالروں میں سے اپنے حصے کا راتب لینے کے بعد یہودی ربّیوں کی سکھائی ہوئی یہ بحث شروع کر دی ہے کہ فلسطین کی وراثت مسلمانوں کا حق ہے یا ان یہودیوں کا جن کو خود اللہ نے تین مرتبہ مہلت دینے کے بعد یہاں سے ہمیشہ کے لیے نکالا تھا۔ کبھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ بیت المقدس کی جگہ یہودیوں کی عبادت گاہ ہیکل سلیمانی تھی، لہٰذا وہ اقصیٰ جسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے ہزاروں شہادتیں نچھاور کر کے حاصل کیا تھا، وہ ہدیہ کی پلیٹ میں رکھ کر یہودیوں کو دے دینی چاہیے تاکہ عملاً اس بات کا اظہار ہو جائے کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ......... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے لے کر آج تک فاتحین اسلام نے اپنی پاکیزہ روحیں اور مقدس جانیں دے کر اس کی جو حفاظت کی تھی، وہ بے جا تھی اور برحق بات وہ ہے جو اسرائیل کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں یہودی فتنہ گروں کی مہمانی کا لطف اُٹھاتے ہوئے ان ایمان فروشوں نے اپنے یہودی آقاؤں سے سیکھی ہے۔

آپ کو یہ دکھڑا کہاں تک سنائیں؟ مسجد اقصیٰ کو ڈھانے کی جو جو کوشش ہو سکتی تھی،

یہودیوں نے کرلی ہے۔ جنونی یہودیوں کے جتھوں نے گھس کر اس مقدس عبادت گاہ کو جلا دیا۔ اس کے نیچے ہر جانب سے بیسیوں فٹ طویل سرنگیں کھودیں۔ اس پر فضائی بمباری کا منصوبہ بنایا۔ بارود سے اُڑانے کی پلاننگ کی۔ مسلمانوں کے یہاں آنے کو محدود کر کے گردوپیش کی ساری عمارتیں اور زمینیں خرید کر محلے کے محلے متعصب یہودیوں سے بھر دیے۔ ان عمارتوں سے سرنگیں کھود کر مسجد کے نیچے لے گئے اور وہاں مشینوں کے ذریعے ارتعاش پیدا کر کے مصنوعی زلزلہ برپا کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک سوچا گیا کہ اس گنبد کو کس طریقے سے اُڑایا جائے کہ نیچے موجود چٹان کو...... جو مسلمانوں کا قبلۂ اول تھی...... نقصان نہ پہنچے۔ یہ بھی حساب لگایا گیا کہ اگر سفاک یہودی دہشت گردوں کی ٹیم مختلف مقامات سے حملہ کر کے اس کو گرائے تو ملبہ کتنے دور جائے گا؟ اور اسے سمیٹ کر یہاں سے غائب کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟ یہ باتیں افسانہ نہیں۔ ممتاز امریکی مصنفہ Grace Hal Sell جو صدر بش کی تقریر نویس بھی ہے اس نے اسرائیل کا دورہ کرنے کے بعد یہ تمام چشم دید حقائق لکھے ہیں۔ ان کی کتاب ''Forcing God's Hand'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے آنکھوں دیکھا حال لکھتے ہوئے کہا کہ یہودیوں نے خالص ریشم سے بنے گئے وہ لباس بھی تیار کر رکھے ہیں جو مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی اور گنبد صخرہ کی جگہ دجال کا قصر صدارت قائم ہونے کے بعد وہاں پہلی حاضری دینے والے یہودی رِبّی پہنیں گے۔ وہ جماعت بھی اپنے مخصوص لباس کے ساتھ تیار ہے جو تخت داؤدی کو ملکہ برطانیہ کی کرسی سے نکال کر یہاں لا کر نصب کرے گی تا کہ اس پر داؤدی نسل سے آنے والا دنیا کا آخری بادشاہ ملک السلام المسیح الدجّال، کنگ آف دی ورلڈ بیٹھ کر نیو ورلڈ آرڈر کے تحت دنیا بھر پر حکمرانی کرے گا۔ ان کی عقل کو داد دینی چاہیے کہ یہ دجّال کو سیدنا حضرت داود علی نبینا وعلیہ السلام کی اولاد سے سمجھتے ہیں جبکہ وہ شیطانی قوتوں کا مالک حیوان نما انسانی جانور ہے۔ اسے حضرت داود علیہ السلام جیسی مبارک شخصیت سے کیا نسبت؟

کہاں تک لکھیں اور کہاں تک روئیں؟ پوری دنیا یہودیوں کی پشت پر اور پورے کے پورے یہودی اسرائیلی یہودیوں کی پشت پر ہے جبکہ دوسری طرف ایک بھی قابل ذکر مسلم

حمایت فلسطینیوں کے ساتھ نہیں۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ حماس دہشت گرد جماعت ہے، وہ فلسطینیوں کی نمایندہ نہیں۔ اس نے انتخابات جیت کر اپنی حیثیت منوالی تو اس کا ناطقہ بند کیا جا رہا ہے۔ اسے پائی پائی کا محتاج بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان پر زمین تنگ کی جا رہی ہے۔ ان کے وزرا اور ارکانِ پارلیمنٹ کو ایک یہودی کے بدلے گرفتار کیا جا رہا ہے جس کے متعلق پتا ہی نہیں کہ کس نے اسے اغوا کیا؟ کھلا ظلم ہے۔ اندھیر ہی اندھیر ہے۔ اندھے شیطان کی سی سفاکیت کے ساتھ دنیا بھر کے دیکھتے ہوئے، کروڑ روشن خیال انسانوں کے سامنے فلسطینی مسلمانوں سے زندہ رہنے کا حق چھینا جا رہا ہے...... مگر ایک آنکھ ایسی نہیں جو القدس کے لیے روئے، ایک دل ایسا نہیں جو فلسطینیوں کے درد کو اپنا درد سمجھے۔ ایک ہاتھ ایسا نہیں جو ان کی مدد کو بڑھے۔ الٹا ان کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے اس اسرائیل کو تسلیم کرنے کی باتیں ہوتی ہیں جو اللہ احکم الحاکمین، اس کے فرشتوں کو اور تکوینی امور پر مامور اس کے بندوں کو تسلیم نہیں۔ رہی سہی کسر ان شکم پرست دانش وروں نے نکال دی ہے جو اسرائیل کے حقِ تولیت پر مقالے لکھ رہے ہیں اور ان مقالوں کو یہودی رِبّیوں سے منظور کروا کر اپنے ایمان کی قیمت لگا رہے ہیں۔

ویسے ایک بات ہے۔ یہود کی ذلت کا اس سے بڑا عبرتناک منظر اور کیا ہوگا کہ انہیں اور کچھ نہ ملا تو فٹ بال ورلڈ کپ کے دوران گھانا جیسے غریب ملک کا ایک کھلاڑی خرید لیا۔ اس کالے کلُھسو کا کام یہ تھا کہ تل ابیب میں یہودی حسیناؤں کی ایک جھلک کے عوض ورلڈ کپ کے میچ میں اسرائیل کا جھنڈا لہرائے۔ واہ میرے مولا واہ! دنیا بھر کی مالدار ترین کمیونٹی، سازشی ترین دماغ اور برتی ذلت کا یہ عالم کہ ایک کالے بکاؤ غلام کے علاوہ جھنڈا اُٹھانے والا کوئی ہاتھ نہیں آتا۔ ان تمام لوگوں کو مرتے وقت اس ذلت کا انتظار کرنا چاہیے جو مردود قوم کا ساتھ دینے والوں کے لیے مقدر ہے، چاہے وہ ایمان فروش ملا ہوں، ضمیر فروش دانش ور ہوں یا دنیا پرست اسکالر یا شہوت پرست غنڈے اور علمائے کرام کے قاتل ایجنٹ اور آخرت کا عذاب تو اس سے سوا ہے۔ اس کی تاب کون لا سکتا ہے؟

۲...... یہ ان کے دماغ کا فتور ہے کہ وہ دنیا میں صرف خود کو حکمرانی کے قابل سمجھتے ہیں کہ

ان کے نزدیک وہ اللہ کے بیٹے اور کچھ کیے کرائے بغیر اللہ رب العزت کے پسندیدہ لوگ ہیں جبکہ بقیہ مخلوق جانور (جنٹائل) ان کی غلامی اور خدمت کے لیے پیدا ہوتی ہے اور ان کے دنیا پرست رہنماؤں نے ان کے اس نسلی تفاخر کو ہوا دے کر جنون کی حد تک پہنچا دیا ہے اور بالآخر یہی حیوانی جنون ان کو لے ڈوبے گا۔

۳......افسوس کہ عیسائی دنیا کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے اور مذاق اُڑانے کے بعد انہیں پھانسی دینے میں کامیاب ہوگئے پھر جناب مسیح علیہ السلام تین دن ایک قبر میں مدفون رہے۔ بعدازاں ان کا جسم وہاں سے آسمانوں پر اُٹھا لیا گیا۔ اس عقیدے میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بے ادبی اور خود عیسائیوں کی بزدلی ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے زندہ ہوتے ہوئے ان کے پیغمبر کے دشمن ان تک پہنچ گئے (جبکہ مسلمانوں نے جب تک ایک آنکھ زندہ تھی سخت سے سخت دشمن کو پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نہیں پھٹکنے دیا) لیکن عیسائی وہ قابلِ رحم لوگ ہیں کہ اس اعلیٰ وارفع عقیدے کو نہیں سمجھ سکے جو اسلام نے انسانیت کو سکھایا ہے۔

قرآن مجید کی سچی اطلاع کے مطابق سیدنا حضرت عیسیٰ سچے مسیح علیہ السلام آسمانوں پر بحفاظت اُٹھا لیے گئے۔ یہود ان کا بال بیکا نہیں کر سکے۔ البتہ عیسائیوں نے چونکہ ان کی حفاظت کا فریضہ انجام نہ دیا جبکہ مسلمانوں نے اپنی کمزور جانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا کر کے غزوۂ احد کے دن ان کے گرد انسانی جسموں کی دیوار کھڑی کر دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحفاظت دشمن کے نرغے سے نکال لے گئے۔ اس لیے اس کے انعام واکرام میں یہود کی سرکوبی کا کام بھی اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے لے گا۔ چنانچہ قیامت کے قریب (اور قیامت تو دور ہی کتنی ہے؟) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے۔ مسلمان ان کے ساتھ مل کر ان کے دشمن یہودیوں سے جہاد کریں گے اور جیسا کہ مسلمانوں کے بڑوں کی روایت ہے ویسا جہاد کریں گے جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے دائیں لڑیں گے، بائیں لڑیں گے۔ ان کے آگے آگے لڑیں گے، پشت سے پشت ملا کر عقب سے دفاع کریں گے۔ اوپر سے آنے

والے تیر سے بھی حفاظت کریں گے اور نیچے ان کے قدموں میں اپنے زخمی جسم بچھا کر ان کا تحفظ اپنے گرم گرم خون سے ویسے کریں گے جیسا کہ محمدیوں کی روایت ہے۔ وہ روایت جو بدر واحد میں پیارے صحابہ نے قائم کی اور آج تک خوش نصیب اہل ایمان نے اسے زندہ رکھا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان یہودیوں کو جو آپ کے دوبارہ آجانے کے بعد بھی آپ کو نہ مانیں گے اور الٹا پھر آپ کے قتل کے درپے ہوں گے، ان کے قائد، شیطان اکبر، دجّال اعور (عربی میں ''اعور'' کانے کو کہتے ہیں) سمیت قتل کر ڈالیں گے اور آج فلسطینی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے سنگدل یہود اس دن تل ابیب اور حیفا کی سڑکوں پر ایسے پڑے ہوں گے جیسے سمندر مردار مچھلیوں کو باہر پھینک دیتا ہے اور پھر پتا نہیں چلتا کہ ان میں سے کون سی پہلے مری اور کون سی بعد میں سڑی۔

۴......اس پر ہلکا پھلکا تمہیدی قسم کا مضمون لکھا جا چکا ہے اور تہلکہ خیز مضمون کا ارادہ ہے۔

۵......آئن اسٹائن ہی نہیں، اور بھی کئی مشہور سائنس دان یہودی تھے۔ یہودیوں نے سائنس پر خصوصاً جینیٹک سائنس پر بہت کام کیا ہے۔ اس وقت ۵۷ یہودی سائنس دان نوبل انعام لے چکے ہیں جبکہ مسلمانوں کو کرکٹ کا ریکارڈ گننے اور بھارتی فلموں کے گانوں پر سر دھننے سے فرصت نہیں۔ باقی یہ معمہ نہیں، معجزہ ہے۔ معجزہ کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو اللہ کے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو اور تکوینی قانون میں جکڑی اس دنیا میں کوئی اور ایسا نہ کر سکے۔ جب اور کوئی معجزہ انجام نہیں دے سکتا تو ہمیں معجزوں کا انتظار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ مسلسل محنت ہی معجزہ ہے۔ وفا اور غیرت ہی معجزوں کو جنم دیتی ہے۔ ایمان اور عمل ہی اصل معجزہ ہے۔ اگر ہم محض اتنی سی بات سمجھ لیں تو آج بھی نہایت قلیل عرصے میں بہت لمبا فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔ اتنا لمبا کہ آئن اسٹائن کی تھیوری دور کھڑی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔

مغربی ممالک پورے فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ چاہتے ہیں

گفتگو: شیخ محمد عصام، خطیب جامع مسجد اقصیٰ
انٹرویو: مفتی ابولبابہ شاہ منصور

ضربِ مؤمن: پاکستانی قوم مسجدِ اقصیٰ کے خطیب و امام شیخ عصام کو اپنے درمیان خوش آمدید کہتی ہے اور مسجدِ اقصیٰ اور فلسطینی بھائیوں کے حالات جاننے کے لیے بے چین ہے۔ پاکستانی قوم مسئلہ فلسطین کو تمام پہلوؤں سے بغور دیکھنا چاہتی ہے، اپنے فلسطینی بھائیوں سے اظہارِ یکجہتی کر رہی ہے اور یہ بتانا چاہتی ہے کہ پاکستانیوں کے دل اور ان کی جانیں اپنے فلسطینی بھائیوں کے دلوں اور جانوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ حقیقتاً ہمارے مہمان کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن چونکہ ہم ان کا تعارف پاکستانی قوم سے کرا رہے ہیں اس لیے کیا آپ اپنا تعارف کرائیں گے؟

شیخ عصام: میں فلسطینی مہاجر ہوں، میرا نام محمد عصام ہے، مسئلہ فلسطین اور مسجد اقصیٰ کو اجاگر کرانے اور مسلمانوں کے سامنے بیان کرنے کے لیے ان دنوں میں دنیا کے مختلف ملکوں کے دورے پر ہوں۔

ضربِ مؤمن: پاکستان میں زیادہ تر اخبارات نے یہ خبر شائع کی ہے کہ ہمارے معزز مہمان مسجدِ اقصیٰ کے امام ہیں اور جامعۃ الاقصیٰ کے نائب رئیس بھی، کیا آپ اس حوالے سے اپنے تعارف میں کوئی اضافہ کریں گے؟

شیخ عصام: جی ہاں! میں مسجدِ اقصیٰ کا امام ہوں، جامعۃ الاقصیٰ کا مسئول اور قائم مقام

رئیس کا عہدہ بھی میں نے سنبھالا ہوا ہے، اس وجہ سے کہ وہاں کوئی رئیس نہیں تھا، کیونکہ جامعۃ الاقصیٰ کے رئیس کو یہودیوں نے ملک بدر کر دیا تھا اور یہ ان کی عادت ہے کہ جو بھی ان کی مخالفت کرتا ہے یا ان کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اسے ملک بدر کیا جاتا ہے، اسی کالے قانون اور صیہونی پروٹوکول کے تحت ہمارے جامعۃ کے مدیر کو بھی کئی سال سے ملک سے بے دخل کر دیا گیا، نتیجتاً مجھے ان کے نائب کی حیثیت سے ان کی تمام ذمہ داریاں اٹھانی پڑیں۔

ضربِ مؤمن: اسلامی دنیا کے کالم اور تجزیہ نگاروں نے مسئلہ فلسطین، اس کے بدلتے حالات اور اس پر گزرے ہوئے ادوار کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ کیا آپ فلسطینی قوم پر گزرے ہوئے تاریخی مراحل کے بارے میں مختصراً کچھ بتائیں گے؟

شیخ عصام: فلسطین زمین کے ایک مقدس ٹکڑے کا نام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مبارک سرزمین کے بارے میں بہت سے انبیاء پر وحی نازل فرمائی ہے۔ یہ زمین حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کا گھر ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی بنیاد ڈالنے کا حکم فرمایا، اسی طرح ان کو مسجدِ اقصیٰ کے علاقے کی طرف رہنمائی بھی کی، پس انہوں نے وہاں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دو اہم جگہوں پر عبادت کی، ایک بیت اللہ اور دوسرا مسجدِ اقصیٰ کا علاقہ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے بعد دن گزرتے گئے، حالات بدلتے گئے اور فلسطین ان حالات کے مدوجزر میں جھولے کھاتا رہا، کبھی فارس کا قبضہ تو کبھی روم کا قبضہ، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ''اسراء'' کے واقعہ میں مسجدِ اقصیٰ کی سیر کرائی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مسجدِ اقصیٰ کا ذکر فرمایا کہ اس کے اردگرد ہم نے برکت ڈالی ہے، مطلب یہ ہوا کہ یہ پورا علاقہ (ارضِ فلسطین) مبارک ہے۔ مسجدِ اقصیٰ مسلمانوں کا پہلا قبلہ بھی رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے تقریباً ۱۷ ماہ تک اس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ معراج کے واقعہ میں بھی ایک ممتاز اور منفرد مرکز واقع ہوا، خصوصاً اس حیثیت سے کہ معراج کے واقعہ میں نماز فرض ہوئی ہے۔ اس

کے بعد ۱۵ ہجری میں اللہ جل شانہٗ نے چاہا کہ یہ سارا علاقہ اسلام کے پرچم تلے آجائے اور مسلمان مسجدِ اقصیٰ کو فتح کرلیں۔

مسجدِ اقصیٰ کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فلسطین کے نصاریٰ کو جان کی امان دی، اس زمانہ میں کوئی بھی یہودی اس علاقہ میں نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین قسم کے لوگوں کے لیے مسجدِ اقصیٰ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں داخلے پر پابندی لگادی:

۱۔ رومی، جو کہ مسجدِ اقصیٰ پر قبضہ کرنے والے تھے، ان کے لیے اس مقدس سرزمین پر کوئی جگہ نہیں ہے، ان کو چاہیے کہ اپنے ملک کی طرف کوچ کرجائیں۔

۲۔ چور اور لٹیرے، کیونکہ یہ علاقہ مقدس ہے۔

۳۔ یہود، یہودیوں کا داخلہ قطعاً ممنوع ہے۔

اور اصلاً بھی کوئی یہودی القدس کے علاقہ میں موجود نہ تھا۔ اس کے بعد کئی ادوار تک مسلمان اس علاقے کے تقدس کی حفاظت کرتے رہے۔

تقریباً ستر سال گزرنے کے بعد خلفاء بنوامیہ نے مسجدِ اقصیٰ کی تعمیرِ نو کی اور وہاں پر قبۃ الصخرہ کی بھی تعمیر کی جو کہ آپ کے سامنے ہے کیونکہ یہاں پر مستطیل شکل کی ایک مقدس چٹان ہے جو کہ زمین سے ڈیڑھ میٹر اوپر ہے اور ۶x۱۰ میٹر اس کا حجم ہے، انبیاء علیہم السلام کے زمانوں میں یہاں پر قربانیوں کا ذبح ہونا اور لوگوں کا یہاں پر عبادت کے لیے آنا ثابت ہے، اس پر مسلمانوں نے ایک گنبد تعمیر کیا جسے ہم آپ کے لیے ہوئے ''ضربِ مؤمن'' کے صفحہ پر دیکھ رہے ہیں۔

پھر مسلمان کمزور پڑ گئے تو صلیبیوں نے علاقہ پر قبضہ کرلیا اور مسجدِ اقصیٰ کے اندر مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک ہوا کہ اس میں ۷۵ ہزار مسلمان ذبح کیے گئے جنہوں نے صلیبیوں کے ظلم اور استبداد سے بچنے کے لیے وہاں پر پناہ لی تھی۔

پھر زمانے نے پلٹا کھایا اور مسلمانوں نے صلیبیوں کو وہاں سے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں مار بھگایا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے بڑی مدت تک القدس کی تقدیس کی حفاظت کی۔ یہاں تک

کہ مبغوض برطانوی سامراج ۱۹۱۷ء میں آیا اور اس دن سے مسجدِ اقصیٰ پر قبضے کا تیسرا دور شروع ہوا جس کے ذمہ دار صہیونی یہودی اور ان کے پشت پناہ انگریز تھے۔

اس دور کے شروع ہوتے ہی برطانیہ، امریکا اور مغربی ممالک نے دنیا کے امیر ترین یہودیوں کو سرزمین مقدس میں لابسایا جو کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی عہد و پیماں کی پروا نہیں رکھتے، انہوں نے مسلمانوں کے علاقوں پر ناجائز تسلط قائم کر کے اپنی حکومت کا اعلان کیا اور وہاں کے باسیوں کو اپنے ملک سے بے دخل کر دیا گیا۔

ضربِ مؤمن: آپ کا مطلب یہ ہے کہ برطانیہ، امریکا اور مغربی دنیا نے یہودیوں کو غاصبانہ قبضہ دلایا، یہودیوں نے بزورِ بازو قبضہ نہیں کیا؟

شیخ عصام: جی ہاں! یہ سرزمین (فلسطین) سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصہ تھی اور جب پہلی عالمی جنگ میں سلطنتِ عثمانیہ کا سقوط ہوا تو انگریز اور اس کے حلیفوں نے فلسطین پر اپنا قبضہ جما لیا اور انہوں نے یہاں صہیونی مملکت بنانے کا فیصلہ کر کے یہودیوں کو دنیا کے کونے کونے سے فلسطین میں جمع کرنا شروع کیا اور پھر وہاں پر ان کی یہودی ریاست کا اعلان کر دیا، نتیجتاً ۴ ملین فلسطینیوں کو جلاوطن کر دیا گیا (جبکہ ان کی کل آبادی ۷ ملین ہے) جو دربدر ہو کر مختلف عرب ممالک، یورپ اور امریکا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ صرف دو علاقے (غزہ اور مغربی کنارہ) باقی ہیں جن پر اب تک صہیونی تسلط نہ ہو سکنے کی وجہ سے فلسطینیوں کو کچھ امید ہے کہ اس میں ان کے لیے ایک آزاد مملکت قائم ہو سکے گی، لیکن کسی نے بھی اس بارے میں ان کی امداد نہ کی، نہ اقوامِ متحدہ اور نہ کسی اور نے۔ اقوامِ متحدہ کی ڈھیروں قراردادوں کے باوجود فلسطینی قوم اب تک اپنے لیے آزاد مملکت کا اعلان نہ کر سکی بلکہ وہ سب کچھ محض کاغذ پر روشنائی تھی، بالکل اسی طرح جیسے کہ کشمیر سے متعلق اقوامِ متحدہ کی قراردادیں ہیں۔ جس طرح اقوامِ متحدہ نے قراردادوں کے ذریعے کشمیر کو آزادی اور استقلال کا حق دے دیا لیکن صرف اور صرف کاغذ کی حد تک، ان قراردادوں میں سے کسی ایک کی بھی تعمیل نہ ہو سکی، مقابلے میں ہندوستان کو کشمیر میں سب کچھ کرنے کا حق واقعتاً دیا، اسی طریقے سے فلسطین کے متعلق قراردادیں سب کاغذ کی

حدود ہی میں رہیں اور اسرائیل کے متعلق قراردادوں کو واقعی حقیقی اور عملی جامہ پہنایا گیا، بالکل جو کچھ کشمیر میں ہوا وہی کچھ فلسطین میں ہوا۔

ضربِ مؤمن: معذرت کے ساتھ، یہ جو دو ٹکڑوں پر اب تک صہیونی قبضہ نہیں ہوا کیا وہ اس پر قبضہ نہ کر سکے یا وہ سرے سے ان علاقوں پر قبضہ کرنا ہی نہیں چاہتے؟

شیخ عصام: حقیقت تو یہ ہے کہ مغربی ممالک یہودیوں کو پورے فلسطین پر قبضہ کرانا چاہتے تھے، ۱۹۴۸ء میں اس لیے انہوں نے پیش قدمی روکی لیکن یہ دو ٹکڑے چھوڑ دیے جن میں سے غزہ میں ایک ملین فلسطینی جمع تھے (جبکہ رقبہ صرف ۳۶۰ مربع کلومیٹر ہے) پس اگر وہ غزہ پر قبضہ کرتے بھی تو خاص استفادہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہاں کی آبادی پہلے سے زیادہ تھی اور دوسرا ٹکڑا مغربی کنارہ ہے جو کہ خالصتاً ایک پہاڑی علاقہ ہے، وہاں پر بھی ایک ملین فلسطینی آباد تھے لیکن ۱۹۶۸ میں یہود نے ان دو علاقوں پر بھی قبضہ کیا اور وہاں سے اردنی اور مصری فوجیوں کو بھگایا جو ان دونوں علاقوں کی حفاظت پر مامور تھے، اس وقت سے بلکہ ۱۹۴۸ء سے فلسطینی قوم اس انتظار میں ہے کہ کوئی ان کو انصاف دلائے لیکن اب تک نہ عرب ممالک میں سے کسی نے اور نہ اقوام متحدہ نے ان کو اپنا حق حاصل کرنے میں مدد دی۔ آخر کار یہ قوم پھٹ پڑی اور تحریکِ انتفاضہ کو عملی شکل دے دی جن میں سے ۱۹۸۷ء میں پہلی انتفاضہ ہے جو کہ سات سال تک جاری رہی، ان سات سال میں فلسطینیوں نے یہودیوں کو کڑوے گھونٹ پلائے، یہاں تک کہ امریکا اس بات کے لیے مجبور ہوا، وہ عرب ممالک پر ایک سلامتی کونسل بنانے کے لیے دباؤ ڈالے۔ اس بہانے کہ یہ کونسل فلسطینی قوم کی معاونت کرے گی اور ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کرے گی۔

اس سلامتی کونسل کا ۱۹۹۳ء کا اجلاس کیا حقیقت پر مبنی تھا؟ کیا وہ واقعتاً فلسطینیوں کو بچانے اور ان کو اپنے حقوق دلانے کے لیے بلایا گیا تھا؟ نہیں! بلکہ وہ دراصل یہودیوں کو فلسطینیوں کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے بلایا گیا تھا، اس اجلاس میں انہوں نے یہ قرارداد پاس کی کہ فلسطینیوں کو کچھ نہ کچھ دیا جائے گا اور ان کے کچھ گرفتار اشخاص رہا کر دیے جائیں گے...... لیکن یہ سب کچھ اس لیے مضحکہ خیز تھا کہ یہ فلسطینی حکومت اور یہ فلسطینی قانون نافذ کرنے والے

دراصل اسرائیلیوں کو فلسطینی فدائیوں سے بچانے کے لیے ایک دیوار ثابت ہوئے کیونکہ یہی پولیس مجاہدین کی نقل وحرکت اور ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتی تھی جیسے کہ کشمیر میں بعض خائن نام نہاد مسلمان ہندوستانی حکومت کے ساتھ مل کر مجاہدین اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے کام کر رہے ہیں اور جیسے کہ افغانستان میں بہت سے غدار امریکیوں سے مل کر مجاہدین کے خلاف سرگرم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ انہوں نے فلسطین میں بھی ایک کرزئی کو کرسی پر لا بٹھایا اور اس کرزئی (یعنی عرفات) کو مسلمان فلسطینی قوم پر مسلط کر دیا لیکن وہ مجاہدین جو صرف اللہ سے ڈرتے ہیں وہ نہ اسرائیل کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ عرفات کے قوانین کی پاسداری کرتے ہیں گویا کہ امریکا کا سب کیا ہوا مجاہدین کے سامنے ہیچ ثابت ہوا جس کی وجہ سے امریکا نے عرفات کو تبدیل کرنے یا اس کے ساتھ اس سے زیادہ غداری کرنے والے (ابو مازن محمود عباس) کو مقرر کرنے پر غور شروع کر دیا، پس انہوں نے محمود عباس کے لیے ایک ایسی حکومت بنانی چاہی جو ان کا مطلوبہ کردار ادا کر سکے اور مجاہدین کو سرگرم عمل رہنے سے باز رکھے۔

ضربِ مؤمن: میڈیا پر حفاظتی دیوار (حائل باڑ) نے کافی شور برپا کر دیا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے اور اسرائیلی حکومت نے اس کا سہارا کیوں لیا ہے؟

شیخ عصام: مغربی کنارہ اور غزہ چونکہ جہادی سرگرمیوں کے اہم مراکز ہیں اس لیے یہودیوں نے سوچا کہ اردنی بارڈر کے پاس ایک ایسی دیوار تعمیر کی جائے جو مغربی کنارہ کو ایک بڑے اور وسیع جیل کی مانند بنا دے تاکہ یہودی پورے ملک میں آزاد پھریں اور فلسطینی اس دیوار سے باہر نہ نکل سکیں نہ اردن اور شام کی طرف اور نہ فلسطین کی طرف۔ یہ اس دیوار کی حقیقت ہے۔ باقی غزہ کے لیے کسی دیوار کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایک طرف مصری حدود ہیں جن پر اسرائیلی فوج کی سخت سیکورٹی ہوتی ہے، دوسری طرف سمندر ہے اور باقی اطراف میں اسرائیلی فوجوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی ہے جو کہ کسی بھی قسم کی دراندازی کی روک تھام کے لیے کافی ہیں۔ اس باڑ کی تعمیر پر پوری دنیا نے احتجاج شروع کیا، امریکا نے بھی رسمی احتجاج کیا لیکن یہ احتجاج حقیقی نہیں ہے کیونکہ امریکا خود اس باڑ کی تعمیر کے لیے فنڈز فراہم کرتا ہے۔

ضربِ مؤمن: بعض لوگوں کو یہ اشکال ہے کہ جب مجاہدین یہودیوں پر حملہ کرتے ہیں تو یہودی ان کے گھروں کو مسمار کر دیتے ہیں، بچوں اور عورتوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں، اس طریقہ سے تو مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے؟

شیخ عصام: اس بات سے تو فلسطینیوں سے ہمدردی کے تاثرات ملتے ہیں، یہی سب کچھ کشمیر اور چیچنیا میں ہو رہا ہے، وہاں کے بارے میں اس اشکال کرنے والوں کی کیا رائے ہے؟ افغانستان میں مجاہدین نے اپنی کارروائیاں بند کیں، امریکا نے اپنی بمباری اب تک کیوں بند نہیں کی؟ چند دن پہلے امریکی طیاروں نے شہری آبادی پر بمباری کی اور ۶ بچوں سمیت ۱۶ افغان شہید کیے، کیا یہ بچے مجاہد تھے؟ دشمن بمباری کرتا رہے گا خواہ مجاہدوں نے کوئی کارروائی کی ہو یا نہ۔ آپ نے نہیں سنا کہ فلسطینی مجاہدین نے ۵۰ دن کی جنگ بندی کا اعلان کیا، لیکن یہودیوں نے اپنی کارروائیاں نہیں چھوڑیں بلکہ انہوں نے جرائم کا پرانا ریکارڈ ان ۵۰ دنوں کے دوران توڑ دیا۔ یہ اشکال کرنے والوں نے کبھی بھی یاسر عرفات کے فلسطینی حقوق سے دستبردار ہونے پر اعتراض نہیں کیا! آپ سوچیں کہ ہمیں ہمارے حقوق کون دلائے گا؟ اور کون لوگوں کو فلسطینی قضیہ کے بارے میں آگاہ کرے گا؟ دنیا کے لوگ تو تحریکِ جہاد سے پہلے فلسطینی قضیے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

ضربِ مؤمن: عراق پر امریکی قبضہ سے فلسطینی قضیہ میں کیا نتائج برآمد ہوں گے؟ کیا اس قضیہ سے دنیا فلسطینی قضیہ بھول جائے گی؟ یا اس سے مسلمان (بالخصوص عرب ممالک) میں بیداری کی لہر پیدا ہوگی؟

شیخ عصام: اسلامی اُمّت اپنے ان رہنماؤں اور حکام کے ہوتے ہوئے کبھی بھی بیدار نہ ہوگی یعنی آپ مطمئن ہو جائیں، ان حکام کے دور میں تو بیداری کا کوئی امکان نہیں کیونکہ جب بھی اُمّت میں بیداری کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو یہ حکام اس کو خواب آور دوا اور انجکشن لگا دیتے ہیں تا کہ یہ پھر سے خوابِ غفلت کے سمندر میں غرق ہو جائیں۔

عراقی قضیہ کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کے لیے جہاد کا ایک نیا میدان

وجود میں آیا، امریکا جواب تک مسلمانوں سے کھیلتا تھا اب وہ خود اس چکی میں پس رہا ہے۔ دوسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ امریکا کے عراق پر چڑھ دوڑنے سے عراقی قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہوئی۔ آپ نے دیکھا کہ عراقیوں نے بھی مزاحمتی مسلح تحریک شروع کی ہے اور فلسطینیوں اور عراقیوں کی یہ بیداری شاید پوری عرب قوم بھی جگائے اور وہ غیرت، دینی حمیت اور اپنے مسلمان بھائیوں کی پکار کی وجہ سے امریکا اور مغرب کے سامنے متحد ہوکر کھڑی ہو جائے۔ یہ سارے مثبت پہلو ہیں، رہے منفی پہلو تو ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس حملے نے اسرائیل کا دل بڑھایا کہ وہ اپنے مجرمانہ اور قاتلانہ حملوں کو تیز تر کردے اور دوسرا منفی نتیجہ یہ ہے کہ عرب رہنما تو امریکا کے ڈر سے پہلے کانپتے تھے، اب چونکہ امریکا اور نزدیک ہوگیا تو ان کا خوف اور بڑھ گیا، گویا اب ان کو امریکی اشارہ کافی ہوتا ہے جبکہ پہلے حکم سے کام چلتا تھا، اب صرف اشارہ کافی ہے لیکن اس منفی اثر کے مقابلے میں ایک مثبت اثر بھی پیدا ہوا ہے اور وہ یہ کہ امریکی بہت تیزی سے مسلم ممالک پر قبضے کرتے جارہے تھے، پہلے فلسطین پھر افغانستان اور عراق، عراق کے بعد ایران اور پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک ان کی زد میں تھے......لیکن افغانستان اور عراق میں امریکی ایسے پھنسے کہ اب ان کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہوگیا۔ اب یہ اس گاڑی کی مانند ہیں جو سپرہائی وے جیسی سڑک پر تیز دوڑتے ہوئے ایک گڑھے میں جا گری ہو۔

ضربِ مؤمن: مسلمانوں کی رگوں میں فلسطینیوں کی خاطر خون جوش مار رہا ہے اور مسلمان نوجوان فلسطینی قضیہ کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں چونکہ فلسطین مسلمانوں کے عقیدے کا ایک لاینفک جز ہے اس لیے مسلمان اسے یہودیوں کا صرف جغرافیائی قبضہ نہیں سمجھ رہے ہیں بلکہ اس کو عقیدہ اور اسلام کے خلاف ناقابل معافی جرم بھی سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ (فلسطینی قضیہ کے سفیر کی حیثیت سے) ان مسلمانوں کے لیے کیا نصیحت کرتے ہیں؟ اور ان کی رہنمائی کس لائحہ عمل کی طرف کرتے ہیں؟ تاکہ وہ مکمل اور یقینی طریقے سے فلسطین کی آزادی کے لیے کام کرسکیں۔

شیخ عصام: سب سے پہلے میں فلسطینی اتھارٹی کے ان سفیروں سے جو اسلامی اور

غیر اسلامی ممالک میں مقیم ہیں بھرپور احتجاج کرتا ہوں کہ وہ ان ممالک میں کرتے کیا ہیں؟ فلسطینی سفیر پاکستان میں کون سے فرائض انجام دے رہے ہیں؟ وہ فلسطینی مسئلہ میں فلسطینیوں کی حمایت کے لیے کیوں جلسے منعقد نہیں کرتے؟ ان کی اتھارٹی خائن اور غدار ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی خائن اور غدار ہوں گے، ان کے لیے فلسطینی مسئلہ کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا، ان کا سروکار ان چیزوں سے ہے جو فلسطینی قوم کے لیے جمع ہوتی ہیں، ان کا مقصد تو اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ بھارت میں فلسطینی سفیر اسرائیل کے مفادات کے لیے کام کرتا ہے اور ہندوؤں پر دباؤ ڈالتا رہتا ہے کہ وہ اسرائیل سے اچھے تعلقات استوار کریں۔ باقی عرب ممالک میں جو فلسطینی سفیر مقیم ہیں وہ بھی اپنے ملک کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر فلسطینی سفیر روزانہ یا کم از کم میڈیا پر ہفتہ وار بیان دیتا اور ان بیانات میں اپنی قوم کے حقوق اور جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو آگاہ کرتا...... ایک سفیر کے لیے یہ کام بہت کٹھن اور مشکل ہے...... لیکن مسلمان نوجوانوں کے لیے یہ کام آسان ہے، وہ اس جہاد میں بآسانی حصہ لے سکتے ہیں، مجاہدین کی خبریں نشر کرنا جہاد ہے اور پاکستانی قوم کے ایٹمی ہتھیار اور اسلامی وحدت فلسطینی مجاہدین کے لیے ایک سپورٹ دینے والی طاقت کی حیثیت رکھتی ہے اور پاکستانیوں کا بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجلاسوں میں فلسطینیوں کا ساتھ دینا یہ بھی مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتا اور ان کی ہمت بندھاتا ہے۔

وہ نوجوان جن کی رگوں میں گرم خون دوڑنے لگا ہے فلسطین کی محبت اور جہاد سے لگاؤ کی وجہ سے ان سے میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اللہ سے یہ دعا مانگیں کہ ہمارے درمیان غداروں کی ٹولی کو ختم کردے اور ان کو یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ فلسطینی آخری سانس تک لڑتے رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی اس جہاد کو دوام دینا چاہتی ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ پیدا ہونے والے نر بچے فلسطین میں پیدا ہوتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں مجاہدین کا عوض اور بدل دینا چاہتا ہے اور وہ فلسطینیوں سے اس جہاد پر راضی ہے۔

آخر میں ''ضربِ مؤمن'' اخبار کے ادارہ کی فلسطینی مسئلہ کو اجاگر کرنے کی کوششوں کو سراہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

نئی صدی میں عالمِ اسلام کو درپیش چیلنج

اس عالم میں جہاں ثبات فقط تغیر کو ہے، ہر آنے والا لمحہ اپنے ساتھ نئے تقاضے لے کر آتا ہے، اور اب تو دنیا اتنی تیز رفتار ہوگئی ہے کہ ہر دن، ہر ساعت انسان سے نئے عزم و عمل کی متقاضی ہوتی ہے۔ وقت کے تقاضے اور زمانے کی طلب کو سمجھ کر اسباب مہیا کرنے اور اپنے وسائل اور صلاحیتوں کو مقصد کے حصول کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیے بغیر اس مشینی دور میں کامیابی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ نئی صدی ہم سے دور بینی و دور اندیشی، بلند ہمتی اور حسنِ کارکردگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس وقت جبکہ عالم کفر مادی ترقی کے اعتبار سے اوجِ کمال کو پہنچا ہوا ہے، مسلمانوں کو اپنی عزت و حرمت کی حفاظت اور بقا و ترقی کے لیے نہایت فہم و فراست کے ساتھ عمل پیہم اور جہدِ مسلسل کی ضرورت ہے۔ امت مسلمہ میں ایسے دماغوں، باصلاحیت افراد اور قابل نوجوانوں کی کمی نہیں جو اپنے عزم و کردار سے، قربانیوں اور مجاہدے سے اسلام کو غالب اور کفر کو مغلوب کر سکتے ہیں...... لیکن افسوس کہ مقصد حیات واضح اور عمل کی سمت متعین نہ ہونے کی وجہ سے صلاحیتیں وہاں نہیں لگ رہیں جہاں انہیں استعمال ہونا چاہیے تھا۔ ذہن کی قوت اور بازوؤں کی طاقت اس مصرف میں خرچ نہیں ہو رہی جہاں اس کا حق ہے۔ مادیت کے پرستار، ہوس میں گرفتار، وحی الٰہی کی تعلیمات سے محروم، اللہ کی رحمت سے مایوس، ایمان کی روشنی سے محروم کفر کے سرغنے نئی صدی کی آمد کا جشن منا کر خاموشی سے نہیں بیٹھ گئے بلکہ وہ اسلام سے بھرپور معرکے کی تیاری اور مسلمانوں کو مٹا دینے یا جھکا دینے کی مکمل منصوبہ بندی کے بعد مناسب وقت اور سازگار حالات کا انتظار کر رہے ہیں۔ صاف لگ رہا ہے کہ رواں صدی میں کفر و اسلام کا ایسا بھرپور ٹکراؤ ہوگا۔ اس لیے مسلمانوں کو رجوع الی اللہ پر عمل پیرا ہو کے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری شروع کر دینی

چاہیے۔ نئی صدی میں عالمِ اسلام کو جو چیلنج درپیش ہیں ان میں سرفہرست درج ذیل چیزیں آتی ہیں، ہر اس شخص کا جسے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور قیامت کے دن کی جواب دہی پر یقین ہے، فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے بقدر اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے میں حصہ ڈالے۔

۱- احیائے خلافت:

سب سے پہلی ذمہ داری جس کو پورا کیے بغیر مسلمان بے آسرا یتیم کی طرح ہیں، نظام خلافت کا قیام واستحکام ہے۔ خلافت کے ادارے سے محروم ہونے کے بعد ہماری حالت کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہے جس پر جھپٹنا ہر کوئی اپنا حق سمجھتا ہے۔ یہ ادارہ مسلمانوں کی مرکزیت کا نشان، ان کی یکجہتی و یگانگت کی علامت اور مہربان سرپرست کی طرح تھا۔ کفر خصوصاً یہود کی پیہم سازشوں سے اس نگہبان اور سرپرست کے خاتمے کے بعد دنیا بھر میں بکھرے ہوئے مسلمان ان بے سہارا یتیموں کی طرح ہیں جنہیں قدرت کی آزمائش نے کسی بخیل کے دسترخوان پر لا جمع کیا ہو، یا کسی تند خو نگراں کی سرپرستی میں دے دیا ہو۔ دنیا میں اس وقت ہر قوم وملت، ہر مذہب ونظریے سے وابستہ شخص کے حق میں کوئی نہ کوئی آواز اُٹھانے والا ہے لیکن ایک مسلمان ہیں جن کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا، جن کے درد کا کوئی مداوا کرنے والا اور جن پر ہوتے ظلم کو دیکھ کر کوئی غیرت کھانے والا نہیں...... اس لیے کہ ان کے سر سے خلافت کا سائباں اور امیر المؤمنین کا مہربان سایہ گزشتہ صدی کی تیسری دہائی (۱۹۲۴ء) میں چھین لیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلمانانِ عالم شیر کے ان بچوں کی طرح ہیں جو اندھیری رات میں ماں سے بچھڑ کر درندوں سے بھرے جنگل میں گم ہو گئے ہوں۔ اے قابلِ فخر اسلاف کے فرزندو! اس نظام کو دوبارہ زندہ کرنے اور اپنے حقوق کے اس محافظ کو پھر سے وجود بخشنے کی فکر کرو۔ امارتِ اسلامیہ کی ترقی واستحکام کے لیے کام کرو، عزت وعظمت رفتہ دوبارہ پا جاؤ گے۔

۲- نظام قضاء کا اجرا:

خلافت کے ادارے سے محروم ہونے کے جہاں اور بہت سے نقصان ہوئے، وہاں سب سے بڑی آفت یہ ہوئی کہ اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کی جگہ ابلیس کے سکھائے ہوئے

طریقوں کی حکمرانی ہوگئی۔ صورتِ حال یہ ہے کہ فیصلہ چاہنے والا بھی مسلمان اور فیصلہ کرنے والا بھی مسلمان؛ حاکم ومحکوم، مدعی ومدعیٰ علیہ سب کلمہ گو ہیں، لیکن ان کے درمیان فیصلہ عیسائیوں اور یہودیوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت ہو رہا ہے۔ خلافتِ اسلامیہ کا اولین فرض ہوتا تھا کہ اپنی مملکت کی حدود میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا سلسلہ جاری اور احکامِ الٰہیہ کے نفاذ کی نگرانی کرے۔ جب خلافت ساقط ہوگئی تو اب کفر کی فطری وذہنی یلغار کے سامنے کوئی بند باندھنے والا نہیں۔ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں شریعت کی نہیں، راندۂ درگاہ یہودیوں اور دشمن اسلام عیسائیوں سے مستعار مانگے ہوئے قانون کی بالادستی ہے۔ سب چاہتے ہیں کہ شریعت مطہرہ کی حکمرانی ہو لیکن کسی کو نہیں خبر کہ ان پر غیروں کے قوانین کس طرح مسلط کردیے گئے ہیں؟ اے میرے نادان بھائیو! یہ سب خلافت اسلامیہ سے محرومی کا نتیجہ ہے۔ علماء حق نے افتاء کا جو نظم قائم کر رکھا ہے، یہ نجی طور پر شریعت کے نفاذ کے ہم معنی ہے لیکن دینی اداروں میں دارالافتاء کی طرح دارالقضاء کے قیام کی بھی ضرورت ہے۔ کیسا ستم ہے کہ فریقین اللہ کی مبارک شریعت پر فیصلہ کروانا چاہتے ہوں اور ملک بھر میں ایسا ادارہ نہ ہو جو ان کی یہ اہم ترین شرعی ضرورت پوری کرسکے۔ یہ علمائے کرام ومفتیان عظام کی ذمہ داری ہے کہ اپنے اپنے اداروں میں قضاء کے نظم کو متعارف کروائیں۔ افتاء کے نظم کو وسعت دے کر قضاء شرعی کو وجود بخشنا چنداں مشکل نہیں۔ نئی صدی میں نظامِ قضاء کا اجرا ایک ایسا چیلنج ہے جس کا سامنا حضرات علمائے کرام کو کرنا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس سے کس طرح اور کتنی جلد عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب فریقین کو شرعی مسئلہ بتایا جاسکتا ہے تو ان کے درمیان شرعی فیصلہ کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ نجانے اس اہم شعبے کے قیام اور اس شرعی ذمہ داری کا احساس ہم سے کیوں ختم ہوگیا؟ حکومتوں کے ذریعے عدالتوں کا فرنگی نظام ختم نہیں ہوسکتا تو ہم ان سے مطالبہ کرنے کی بجائے وقت کے مطالبے کو سمجھتے ہوئے خود سے شرعی عدالتیں کیوں قائم نہیں کرسکتے؟

۳۔ بلادِ حرمین سے غیر مسلم افواج کا اخراج:

گزشتہ دہائی میں مسلمانوں کے تین بڑے دشمن امریکا، برطانیہ اور فرانس ایک زبردست

حیلے اور انتہائی مکارانہ سازش کے تحت ہمارے مقدس مقامات میں بھاری سامان حرب کے ساتھ داخل ہوگئے ہیں۔ یہ ایک ایسا المیہ اور اتنا افسوس ناک واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد اتنا بڑا کوئی اور سانحہ رونما نہیں ہوا۔ رونا صرف اس بات کا نہیں کہ دشمن نے گھر میں گھس کر مورچہ بنالیا ہے، دہائی اس پر ہے کہ اہل ملت اس نقب زنی سے بے خبر ہیں۔ جاننے والے حلق کا سارا زور خرچ کر کے پکار رہے ہیں کہ ابرہہ کا لشکر قریب آ پہنچا ہے لیکن فرزندانِ اسلام ان کے واویلے پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں۔

وائے ناکامی! متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اگر کسی مسجد کے نمازیوں کو بھنک پڑ جائے کہ مسجد کے قبلہ کی سمت کچھ منحرف ہے تو اگرچہ اس کا انحراف اتنا نہ ہو کہ نماز کی صحت پر اثر ڈالے لیکن اکثر نمازی نماز خراب ہونے کے وسوسے میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہاں حال یہ ہے کہ کعبۃ اللہ، مسجد نبوی، شعائرِ اسلام اور پوری ارضِ حرم پر ایک منصوبے کے تحت، غاصبانہ نیت کے ساتھ، مکمل تیاری کر کے یہود ونصاریٰ کی عالمی قوتیں اپنا تسلط حاصل کرنے کے آخری مراحل کو آ پہنچی ہیں اور سوا ارب مسلمان ان کو اپنا محافظ، خیر خواہ اور ہمدرد سمجھے بیٹھے ہیں۔

مسلمان کس طرح اپنے ان مقدس اور متبرک ترین مقامات کا تحفظ کرتے ہیں اور کب جہاد وقتال کے حکم الٰہی وسنت نبوی کو اختیار کر کے ان بھیڑیے نما محافظوں کو دارالکفر میں واپس بھیجتے ہیں، یہ نئی صدی کا وہ چیلنج ہے جو عنقریب اپنی تمام تر شدت کے ساتھ عالمِ اسلام کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ اے کعبہ کے پاسبانو! حرم کے تقدس کی قسم کھانے والو! کیا تم نے اس کے لیے کوئی تیاری کی ہے؟ ایسے معرکے کے لیے کوئی سامان کیا ہے جس کی گرمی میں گھسے بغیر اب کوئی چارہ نہیں رہا۔

۴۔ بیت المقدس اور بابری مسجد کی واگذاری:

اندلس کی مسجد قرطبہ کا غم ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ بیت المقدس کے ہاتھ سے جاتے رہنے کا صدمہ امت مسلمہ کو برداشت کرنا پڑا۔ اور بیت المقدس کا صدمہ ابھی ہلکا نہ ہوا تھا کہ بابری مسجد

ڈھا دیے جانے کی قیامت دیکھنا پڑی۔ جامع قرطبہ کے مینار دُہائی دیتے رہے، ہم دنیا پرستی میں مست رہے، یہاں تک کہ کفر کے ناپاک قدم مسجدِ اقصیٰ کی دہلیز تک آ پہنچے۔ مسجد اقصیٰ کا گنبد ہماری بے حسی کا نوحہ کرتا رہا، ہم بے سدھ پڑے رہے، یہاں تک کہ بابری مسجد کا سانحہ پیش آ گیا۔ اور اب اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے نبرد آزما ہو کے اللہ تعالیٰ کو راضی نہ کیا تو نجانے کتنی قیامتیں ہمارے سروں پر آئی کھڑی ہیں۔ اندلس کے عیسائیوں، اسرائیل کے یہودیوں اور بھارت کے ہندوؤں نے اسلام سے دشمنی کرنے اور مسلمانوں کو نیچا دکھانے میں کسر نہیں چھوڑی۔ اب مسلمانوں کی باری ہے کہ وہ ان کے چیلنج کا جواب کس انداز میں دیتے ہیں؟ اے قرطبہ کے منارو! ہم تمہیں گواہ بنا کے رب ذوالجلال سے عہد کرتے ہیں کہ تمہیں ایک بار پھر تکبیر کی زمزمہ بار صداؤں سے آباد کریں گے۔ اے مسجد اقصیٰ کے گنبد! تیری عظمت اور تقدس کی پاسبانی ہم اپنا خون دل دے کے کریں گے۔ اے بابری مسجد! تیری ہر اینٹ جب تک اپنی جگہ نہ لگ جائے یہ زندگی ہم پر بوجھ ہے۔ تیرے شہید ہو جانے والے منبر و محراب میں بیان کی جانے والی عظمت الٰہی کی قسم! تو دیکھے گی کہ تیرے بیٹے، تیرے جانباز کس طرح تیرا بدلہ لیتے ہیں۔ اے نوجوانانِ اسلام بے غیرتی کی زندگی کی تہمت کب تک اپنی گردنوں پر اُٹھائے پھرو گے؟ اب اٹھ پڑو! ایمان و عزیمت کے ایک نئے سفر کا آغاز کرو، جس کی ابتدا بابری مسجد کی واگذاری سے اور انتہا بیت المقدس کی واپسی اور قرطبہ کی آزادی سے ہو۔

۵- مقبوضہ مسلم خطوں کی آزادی:

شریعت کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ جو جگہ مسلمانوں کی زیرنگیں ہو پھر کفر اس پر تسلط جما لے تو اس کے ایک ایک انچ کو چھڑانا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی سنگین جرم ہے۔ افسوس کہ ہم میں وہ مذہبی غیرت نہ رہی جس کے سبب مقبوضہ مسلم خطوں کی آزادی کے بغیر ہم جینے کو عار سمجھتے۔ تعجب ہے کہ گندی مٹی سے بنائے گئے ننگے بتوں کو پوجنے والا بنیا اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھتا ہے جبکہ اس کی جھولی میں سوائے رسوائی کے دھبوں اور شکست کے داغوں کے کچھ نہیں...... اور ہم اتنی درخشاں تاریخ اور شاندار ماضی رکھتے ہوئے اکھنڈ پاکستان

کے مشن سے لاتعلق ہیں۔ کیا پہلے راس کماری سے خیبر تک اور مالا بار کے ساحل سے ہمالیہ کے پہاڑوں تک سارے کا سارا خطہ مسلمانوں کا نہ تھا؟ جب پورا برصغیر مسلمانوں کا تھا تو ہم کشمیر پر اکتفا کیوں کریں؟ ہمیں کشمیر سے دہلی تک اور گروزنی سے غزہ تک سارے مقبوضہ علاقوں کو چھڑانا ہے۔ اگر اسلامی سلطنت کے پرچم تلے ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی جگہ رہی ہے اور اس میں سے ایک چپہ بھی ہندو کے قبضے میں ہے تو ہماری ذمہ داری پوری نہ ہوگی اور اس کی فکر نہ کرنے پر روزِ قیامت ہماری پکڑ ہوگی۔ ان خطوں کی آزادی نئی صدی کا بہت بڑا چیلنج ہے۔

تلواروں کے سائے تلے سے:

برادران اسلام! نئی صدی بہت سے چیلنج اپنے دامن میں لے کے آئی ہے۔ ان سے نمٹنے کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ ہم تقویٰ وطہارت کے ذریعے اپنے ظاہر و باطن کی گندگیاں دور کرلیں۔ ذکر وعبادت سے خود کو آراستہ کریں۔ تزکیہ قلب اور تعلق مع اللہ کی دولت حاصل کریں اور ان صفات کو لے کر اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے کے لیے جہاد وقتال کے مبارک ومقدس راستے پر گامزن ہوجائیں۔ ہمیں اب لوحِ قلب پر نقش کرلینا چاہیے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راستہ تلوار کے سائے تلے سے ہوکر جاتا ہے۔

صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟

زمیں حیران ہے ساکت آسماں ہے   فضاؤں سے بھی تاریکی عیاں ہے
تأسف کا تحیر کا سماں ہے   سراپا مسجد اقصیٰ فغاں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
جسے خیبر سے دھتکارا وہی ہے   یہی ہے دشمن مسلم یہی ہے
متاعِ دیں وایماں لٹ رہی ہے   مگر غافل حرم کا پاسباں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
ہے موقع دامن عصیاں کو دھولو   اگرچہ کڑوی ہو حق بات بولو
مسلمانو! خدارا آنکھیں کھولو   سنو! القدس سے تم کو اذاں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
بہت دشوار اُمّت پر گھڑی ہے   تباہی اس کے دروازے کھڑی ہے
حکمرانوں کو سیاست کی پڑی ہے   مگن کھیلوں میں اپنا نوجواں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
عرب کے پاس دولت کا ذخیرہ   عجم کے پاس ایٹم بم کا ہیرہ
یہی کیا اہل حق کا ہے وطیرہ   زباں رکھتے ہوئے بھی بے زباں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
نہتوں پر مظالم ڈھا رہا ہے   یہودی بزدلی دکھلا رہا ہے
یہ گیدڑ شہر کی سمت آرہا ہے   خود اپنی موت کی جانب رواں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
فقط باتوں کا کوئی پھل نہیں ہے   آثر یہ مسئلے کا حل نہیں ہے
مسلمانوں کی جبیں پر بل نہیں ہے   یہ کیا ناواقفِ سود وزیاں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟

شاہین اقبال آثر

اے ارضِ فلسطین

کافر کا وجود ارضِ مقدس کی ہے توہین   مدت سے تری پیٹھ پہ ہے ظلم کی تمرین
جب تک کہ نہ ہو زیرِ زمیں ظلم کی تدفین   ہو سکتی نہیں ہے دلِ مجروح کو تسکین
اے ارضِ فلسطین

تو ارضِ مقدس ہے کرامات کا مخزن   اعلیٰ ہے تری شان تو نبیوں کا ہے مسکن
تجھ سے ہی تر و تازہ ہے ایمان کا گلشن   ہم لوگ کریں گے تری اب خون سے تزئین
اے ارضِ فلسطین

مسلم کو مٹانے کا تقاضا لیے دل میں   جیتے ہیں فقط بُغض کا سودا لیے دل میں
صیہونی ریاست کی تمنا لیے دل میں   دنیا سے چلے جائیں گے بدمذہب و بددین
اے ارضِ فلسطین

گو امن کا دنیا میں تو بنتا ہے پرندہ   حالانکہ تری پیٹھ پہ ہے دستِ درندہ
تو اس کی فقط چشمِ عنایت سے زندہ   دنیا کو جو کرتا ہے فقط صبر کی تلقین
اے ارضِ فلسطین

مانا کہ تو مجبور ہے مقہور ہے فی الحال   چھن جاتے ہیں فرزند ترے سینکڑوں ہر سال
پر لائقِ صد رشک ہیں واللہ ترے لال   ہیں تیرے فدائی بھی عجب قابلِ تحسین
اے ارضِ فلسطین

پھونکوں سے دیا حق کا تو مدھم نہیں ہوتا   اس ظلم سے یہ ذوقِ جنوں کم نہیں ہوتا
ہاں پنجۂ کرگس میں کوئی دم نہیں ہوتا   آزاد کرائیں گے تجھے اب مرے شاہین
اے ارضِ فلسطین

ہم وقت کی آواز کا ادراک کریں گے   گو دست و گریباں کو بھی چاک کریں گے
صیہونی غلاظت سے زمیں پاک کریں گے   جذبہ یہ حقیقت بنے کہہ دو ذرا آمین!
اے ارضِ فلسطین

حاصل تمنائی

فلسطینی مسلمانوں کا جنگی ترانہ

سَنَخُوضُ مَعَارِكَنَا مَعَهُمْ	وَسَنَمْضِي جُمُوعاً نَرْدَعُهُمْ
ہم دشمن کے خلاف میدانِ کارزار میں کود پڑیں گے	اور ہم لشکروں کی صورت ان پر جا پڑیں گے
وَنُعِيدُ الْحَقَّ الْمُغْتَصَبَ	وَبِكُلِّ الْقُوَّةِ نَدْفَعُهُمْ
ہم اپنا غصب شدہ حق چھین لیں گے	اور پوری قوت کے ساتھ ہم دشمن کو پسپا کریں گے
بِسِلَاحِ الْحَقِّ الْبَتَّارِ	سَنُحَرِّرُ أَرْضَ الْأَحْرَارِ
حق کی حمایت میں تیز دھار اسلحے کے ساتھ	ہم آزاد لوگوں کی سرزمین کو چھڑوا کر دم لیں گے
وَنُعِيدُ الطُّهْرَ إِلَى الْقُدْسِ	مِنْ بَعْدِ الذُّلِّ وَذَا الْعَارِ
اور ہم بیت المقدس کی حرمت واپس دلائیں گے	اس کے چھین لیے جانے کی ذلت اور رسوائی کے انتقام میں
وَسَنَمْضِي نَدُكُّ مَعَاقِلَهُمْ	بِدَوِيٍّ دَامٍ يُقْلِقُهُمْ
اور ہم دشمن کی پناہ گاہوں کو زمین بوس کر دیں گے	ایسی زوردار ضرب کے ساتھ جو ہڈیوں تک کو ہلا ڈالے گی
وَسَنَمْحُو الْعَارَ بِأَيْدِينَا	وَبِكُلِّ الْقُوَّةِ نَرْدَعُهُمْ
اور ہم جلد ہی عار کے داغ کو اپنے ہاتھوں سے مٹا دیں گے	اور بھرپور قوت کے ساتھ دشمن کو نکال بھگائیں گے
لَن نَّرْضَ بِجُزْءٍ مُّحْتَلِّ	لَن نَّتْرُكَ شِبْرًا لِلذُّلِّ
ہم ارض مقدس کے کسی حصے پر قبضہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے	اور کسی صورت میں ایک بالشت زمین بھی یہود کے قبضے میں نہیں چھوڑیں گے
سَتَمُورُ الْأَرْضُ وَتَحْرِقُهُمْ	فِي الْأَرْضِ بَرَاكِينٌ تَغْلِي
عنقریب زمین لاوا اگلے گی اور دشمن کو پھونک ڈالے گی	(ہمارے سینوں کی) زمین میں بہت سے آتش فشاں ہیں جو دہک رہے ہیں

بیت المقدس کی تلاش

15 ویں صدی ہجری، ان شاء اللہ اسلام کی صدی ہوگی
لیکن اس بات کا فیصلہ بیت المقدس میں ہوگا

کیف بنارسی

تجلیوں کا سراپا تلاش کرتا ہوں   نیازِ پیکرِ جلوا تلاش کرتا ہوں
شعار و طرزِ وفا تلاش کرتا ہوں   سرشتِ دل کا تقاضا تلاش کرتا ہوں
کبھی مٹا نہ سکے جس کو نشۂ صہبا   خلش کچھ ایسی، غم ایسا تلاش کرتا ہوں
سکون روح کو اِک لمحہ بھی نصیب نہ ہو   کچھ ایسی شورشِ برپا تلاش کرتا ہوں
سماں وہ ہو کہ دہل جائے ہر حریف کا دل   اِک حشر خیز نظارا تلاش کرتا ہوں
نثار جس پہ ہوں رنگینیاں بہاروں کی   وہ اِک تبسمِ سادہ تلاش کرتا ہوں
قدم قدم پہ کھلادے جو آرزو کے چمن   وہ رنگ و بوئے شگفتہ تلاش کرتا ہوں
بہادے نور کے دریا میں موجِ ہستی کو   وہ دل نواز اشارا تلاش کرتا ہوں
سجا رہا ہوں میں تابانیاں تصور میں   جمالِ شاہدِ رعنا تلاش کرتا ہوں
یہ چند پھول بھلا کس کے کام آئیں گے   چمن بدوش نظارا تلاش کرتا ہوں
مہ و نجوم کی تابندگی سے کیا ہوگا   دل و نظر کا اُجالا تلاش کرتا ہوں

کسی بہارِ مجسم کی جستجو ہے مجھے   کوئی جمیل سراپا تلاش کرتا ہوں
ہزار پردوں میں بھی حق نہ چھپ سکے جس سے   وہ نورِ دیدۂ بینا تلاش کرتا ہوں!
ہر ابتداء میں نظر انتہا پہ رہتی ہے   ہر اِک عمل کا نتیجہ تلاش کرتا ہوں
صدا یہ آتی ہے دِل کے قریب سے کیسی   مجھے یہ کس نے پکارا تلاش کرتا ہوں
نگارِ وقت کی تاریخ لکھ رہا ہوں میں   شکوہِ عظمتِ رفتہ تلاش کرتا ہوں
جہاں ہے بے ادبی حسنِ انجمن کی دلیل   وہاں ادب کا سلیقہ تلاش کرتا ہوں
شریک جس میں ہو دنیا وہ درد ہی کیا ہے   وہ غم جو صرف ہو اپنا تلاش کرتا ہوں
ریا و حرص کا جس جا کبھی گزر بھی نہ ہو   جہاں میں ایسا ٹھکانہ تلاش کرتا ہوں
وہ نقش ہائے محبت جنہیں کسی صورت   مٹا سکے نہ زمانہ تلاش کرتا ہوں
جو سوزِ درد سے گرما دے اہلِ محفل کو   لبِ وفا پہ وہ نغمہ تلاش کرتا ہوں
برائے حق جسے سقراط نے پیا تھا کبھی   وہ زہرِ غم کا پیالہ تلاش کرتا ہوں
جو دوسروں کے لیے بے قرار ہو ہر دم   وہ مشتِ خاک وہ پارا تلاش کرتا ہوں
تمام گردشِ دوراں سمیٹنے کے لیے   دل فراخ و کشادہ تلاش کرتا ہوں
لبوں میں اب نہیں باقی مجالِ گویائی   مگر خلوص کا نعرہ تلاش کرتا ہوں
خیالِ دوست، غمِ شوق، آنسوؤں کے چراغ   وفا کی راہ میں کیا کیا تلاش کرتا ہوں
وہ سوزِ درد جو مردہ دلوں کو زندہ کرے   نفس نفس میں مچلتا تلاش کرتا ہوں
مِرے حبیب، مِرے دِل کو روشنی ہو عطا   تیرے خیال کی دنیا تلاش کرتا ہوں
کسی کی آہ مسلسل سنائی دیتی ہے   جو ساز پر کوئی نغمہ تلاش کرتا ہوں
بہت دنوں سے خجل شوقِ جبہ سائی ہے   کہاں گیا درِ کعبہ تلاش کرتا ہوں

بہت دنوں سے صدائے اذاں نہیں آئی   جو اُڑ گیا ہے وہ نغمہ تلاش کرتا ہوں
جہاں پہ ظلمتِ دوراں ہوئی ہے سایہ فگن   وہاں دلوں کا اُجالا تلاش کرتا ہوں
شبِ دراز اَلم کا جہاں تسلط ہے   وہاں میں نور کا تڑکا تلاش کرتا ہوں
ہوا کے رخ پہ جلاتا ہوں آرزو کے چراغ   اندھیری شب میں سویرا تلاش کرتا ہوں
وہ گلستانِ تمنا، وہ آرزو کا چمن   لہو سے جس کو سنوارا تلاش کرتا ہوں
بھٹک رہا ہوں بگولوں کی طرح صحرا میں   کسی کا نقشِ کفِ پا تلاش کرتا ہوں
وہ جس کے لٹنے پہ غیرت نہ آئی ملت کو   وہ نقشِ مسجد اقصیٰ تلاش کرتا ہوں
غمِ حیات، غمِ دوجہاں ہیں ناکافی   کچھ اور ان کے علاوہ تلاش کرتا ہوں
جو کشتگانِ رہِ حق کو زندگی بخشے   وہی دوا و مسیحا تلاش کرتا ہوں
ضیاء سے جس کی فروزاں ہو سینۂ ملت   وہ لو، وہ سوز، وہ شعلہ تلاش کرتا ہوں
حقیقتِ ابدی جس کا بن گیا عنوان   وہ لازوال فسانہ تلاش کرتا ہوں
الٰہی قوتِ پرواز بخش دے مجھ کو   بلند عزم و ارادہ تلاش کرتا ہوں
الٰہی بیتِ مقدس کی جستجو کے سوا   تجھے خبر ہے کہ میں کیا تلاش کرتا ہوں
جہانِ کفر کی یورش ہے اہلِ ایماں پر   میں ان بلاؤں کا صدقہ تلاش کرتا ہوں
جو دست و بازوئے باطل کو موڑ کر رکھ دے   وہ ایک آہنی پنجہ تلاش کرتا ہوں
کبھی خلوص کے موتی پروئے تھے جس میں   وہ اتحاد کی مالا تلاش کرتا ہوں
اُٹھا رہے ہیں سر، اس دور میں نئے فرعون   عصائے حضرت موسیٰ تلاش کرتا ہوں
تمام عالمِ اسلام کو جو تڑپا دے   میں سازِ دل میں وہ نغمہ تلاش کرتا ہوں
اجل بھی آئے تو پیغامِ زندگی لائے   جہاد کا وہ قرینہ تلاش کرتا ہوں

چمن چمن ہے کہ مقتل ہے آرزوؤں کا   گلوں میں خونِ تمنا تلاش کرتا ہوں
کہاں ہیں مفتیِ دینِ مبین و شرعِ متین   جہادِ شوق کا فتویٰ تلاش کرتا ہوں
بتائیں راہ مجھے واعظانِ ذوالاکرام   میں اپنا قبلۂ اولیٰ تلاش کرتا ہوں
بجائے خون، بھری ہے رگوں میں آتشِ شوق   ہر ایک موج میں شعلہ تلاش کرتا ہوں
چراغِ طور لیے پھر رہا ہوں صحرا میں   نشانِ ملتِ بیضا تلاش کرتا ہوں
وفا کی راہ میں چھائی ہوئی ہے گردِ جفا   میں اس غبار میں کعبہ تلاش کرتا ہوں
کہاں ہیں ناصر و انصار کچھ تو بتلائیں   میں کب سے مسجدِ صخرا تلاش کرتا ہوں
زوال پر ہے عرب، اوج پر ہے اسرائیل   مگر ہے اس کا سبب کیا تلاش کرتا ہوں
کہیں قیادتِ اعلیٰ کا تو قصور نہیں؟   سبب شکست کا ہے کیا تلاش کرتا ہوں
کہیں کمی تو نہ تھی جذبۂ جہاد میں کچھ   گریز پائی کا نقشہ تلاش کرتا ہوں
دمِ جدال یہ ہتھیار کند کیوں نکلے   فریب کاریٔ دنیا تلاش کرتا ہوں
شکستِ فاش کی ذلت اُٹھائی ملت نے   شعورِ رہبرِ دانا تلاش کرتا ہوں
قدم قدم پہ جلاتا ہوں آگہی کے چراغ   کہاں کہاں ہے اندھیرا تلاش کرتا ہوں
یہ کشمکش، یہ لڑائی، یہ باہمی رنجش   ہوا جو گھر تہ و بالا تلاش کرتا ہوں
تمام عالمِ اسلام کیوں نہیں اُٹھتا   فریبِ وعدۂ فردا تلاش کرتا ہوں
یہ آسماں سے لہو کس لیے نہیں برسا   رموزِ عالمِ بالا تلاش کرتا ہوں
ہزار مرحلۂ مرگ و زیست کی زد میں   فقط خدا کا سہارا تلاش کرتا ہوں
نہیں یہ ہوش کہ اپنے مکاں کی فکر کروں   ابھی تو خانۂ کعبہ تلاش کرتا ہوں
عدو سے چھین لے بڑھ کر جو قبلۂ اوّل   وہ مردِ حر، وہ جیالا تلاش کرتا ہوں

جلا کے خاک جو کردے غرورِ اعداء کو
وہ اضطراب کا شعلہ تلاش کرتا ہوں
یہیں سے مجھ کو ملے گا نشانِ منزل کا
کلامِ حق کا صحیفہ تلاش کرتا ہوں
کدھر چلے گئے دنیا میں عاشقانِ رسول
فضائے یثرب و بطحا تلاش کرتا ہوں
خدا کے نام کی اس دور میں جو لاج رکھے
کہاں چھپا ہے وہ بندہ تلاش کرتا ہوں
تمام عالمِ اسلام جس میں شامل ہو
اِک ایسی جنگ کا نقشہ تلاش کرتا ہوں
سیاہ کرکے رہوں گا جہانِ اسرائیل
تجلی یدِ بیضا تلاش کرتا ہوں
جو بدر و خیبر و خندق میں مردِ میداں تھے
وہ سرفروش دوبارا تلاش کرتا ہوں
عروجِ ثاقب و زہرہ کی کیا حقیقت ہے
کہ اوجِ مسجدِ اقصیٰ تلاش کرتا ہوں
کل انبیا کی نمازوں کا جو امین رہا
وہ انبیا کا مصلیٰ تلاش کرتا ہوں
خدا کی راہ میں مرنا ہے زندگی کی دلیل
شہادتِ رہِ مولا تلاش کرتا ہوں
وہ مردِ مومن و مردِ مجاہدِ ملت
بدل سکے جو زمانہ تلاش کرتا ہوں
خدا نے خود جسے عنوانِ جاوداں بخشا
وہی شہادتِ عظمیٰ تلاش کرتا ہوں
وہ آرزوئے شہادت جو زندگی کی ہے روح
وہی ہے دل میں تمنا تلاش کرتا ہوں
فغاں کہ ارضِ مقدس کا غم بڑا غم ہے
غلافِ خانۂ کعبہ تلاش کرتا ہوں
دھواں بنا کے اُڑانا ہے فوجِ اعدا کو
جلالِ خالقِ یکتا تلاش کرتا ہوں
الٰہی ارضِ مقدس ہو اور جبینِ نیاز
مقامِ در خورِ سجدہ تلاش کرتا ہوں

دُعائے کیفؔ حزیں مستجاب ہوجائے
رسولِ حق کا وسیلہ تلاش کرتا ہوں

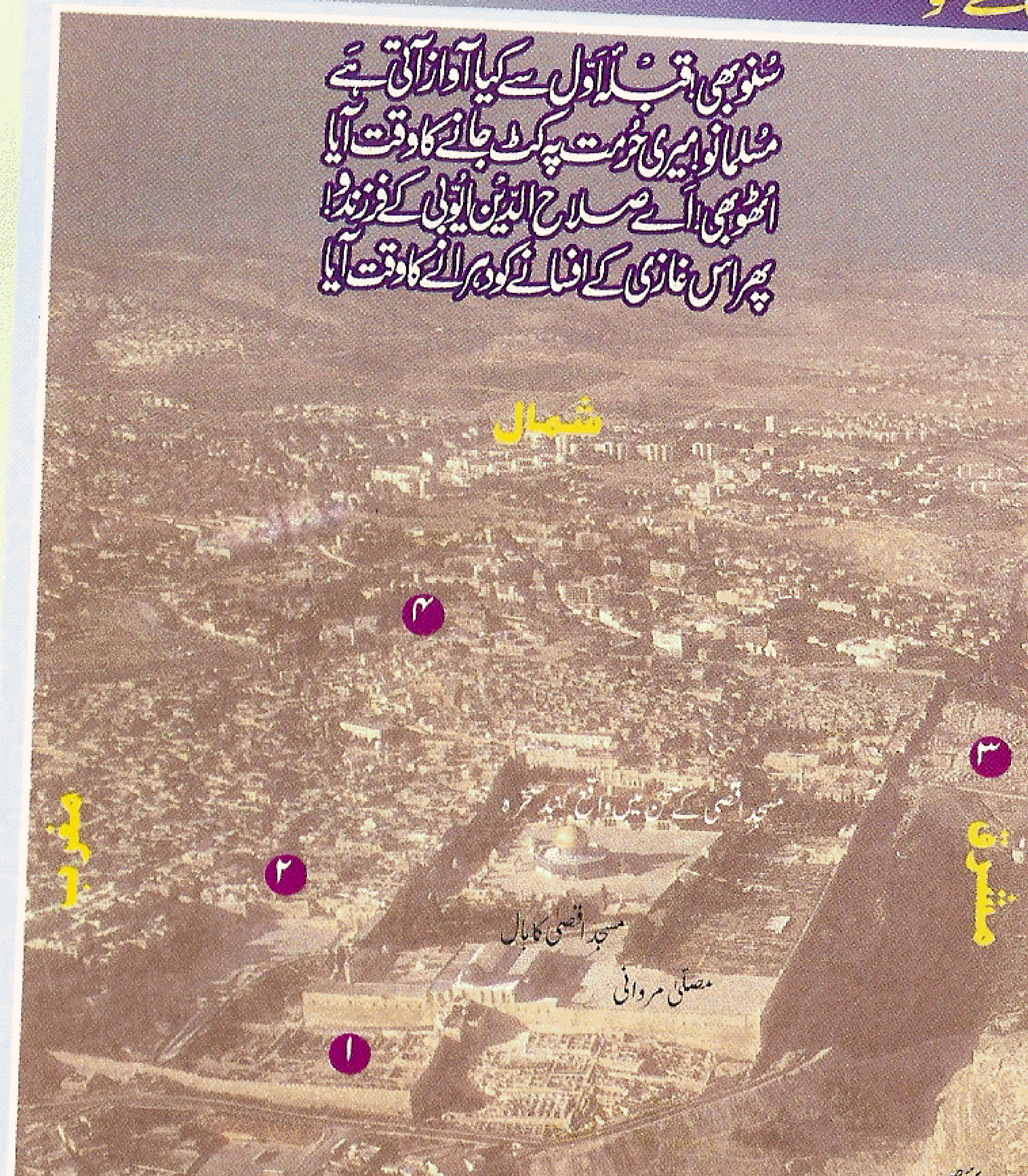

سنو بھی! قبلۂ اوّل سے کیا آواز آتی ہے
مسلمانو! میری حرمت پہ کٹ جانے کا وقت آیا
اٹھو بھی! اے صلاح الدین ایوبی کے فرزندو!
پھر اس غازی کے افسانے کو دہرانے کا وقت آیا

شمال
۴
۳
مسجد اقصیٰ کے صحن میں واقع قبۃ الصخرہ
مغرب
۲
مشرق
مسجد اقصیٰ کا ہال
مصلّی مروانی
۱
وادی صہیون
جنوب

① حرم کی چاردیواری کے ساتھ سلاطین بنواُمیہ کے مکانات جو کھدائی سے دریافت ہوئے۔

② مسجد براق یہاں تھی جسے یہود نے شہید کر کے رونے دھونے کی جگہ بنالی۔

③ مقبرۂ رحمت نامی قدیم قبرستان جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی قبریں بھی موجود ہیں۔

④ القدس شہر کی قدیم آبادی جہاں یہودی اپنی تعداد بڑھاتے جا رہے ہیں۔

ایک شاہکار تصویر جس میں حرم قدسی سے متعلق کچھ بنیادی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہ مسجد مسلمانوں کی عزت وغیرت کی علامت ہے لیکن عام طور پر مسلمان اس کی تفصیلات سے ناواقف ہیں۔ اس قسم کی تصاویر کی اشاعت کا اصل مقصد نوجوان نسل کو ان کا فرض (یعنی مسجد اقصیٰ کی بازیابی) یاد دلاتے رہنا ہے۔

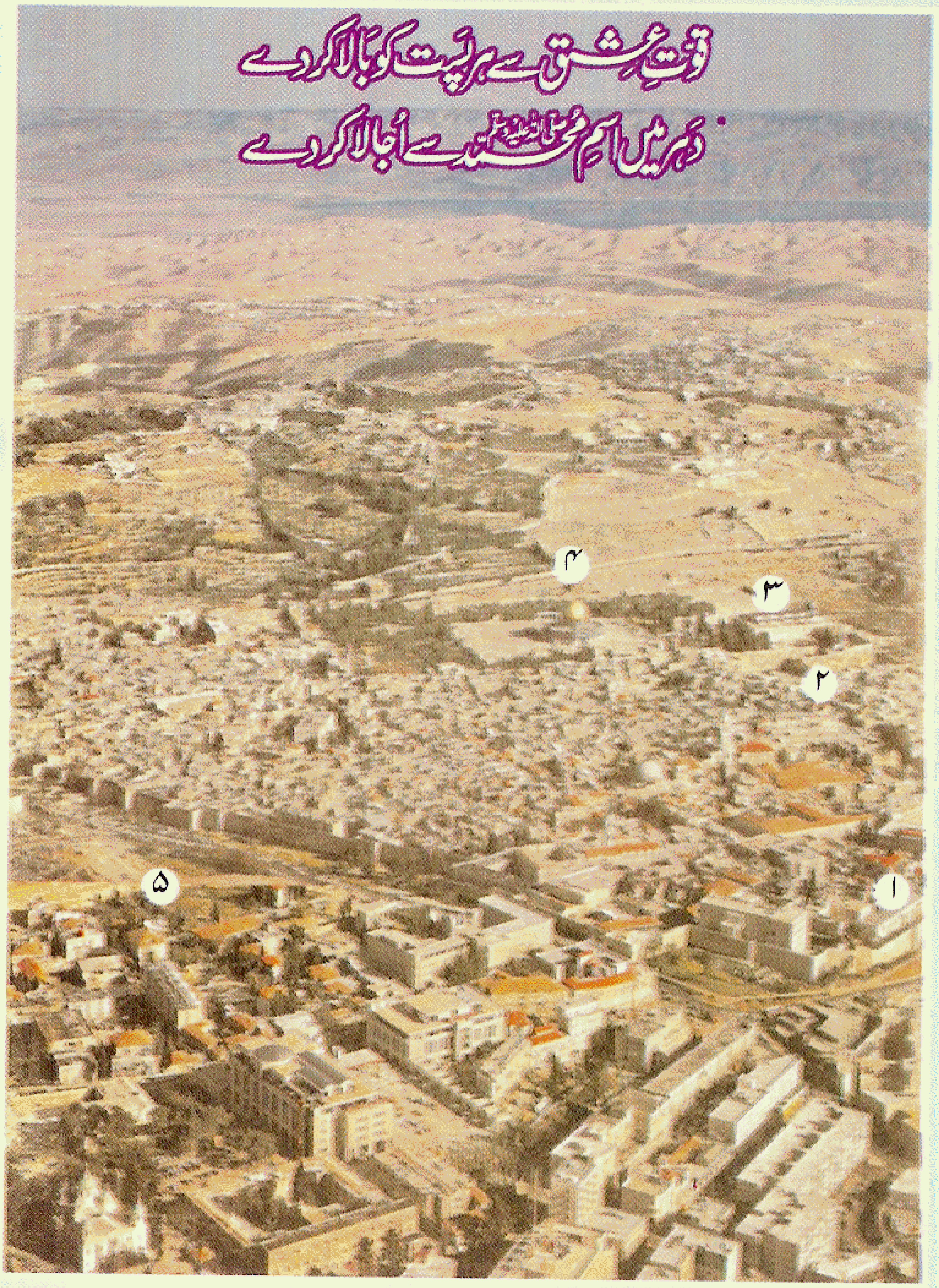
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے
۴
۳
۲
۵
۱

تصویر کا اشاریہ: (۱) مسجد اقصیٰ کا ہال (۲) مسجد اقصیٰ کے صحن میں موجود چٹان پر قائم گنبد صخرہ (۳) دیوار براق (دیوارِ گریہ) (۴) قدیم شہر کے گرد قائم فصیل، القدس اس وقت دنیا کا واحد قدیم شہر ہے جس کے گرد قدیم فصیل آج بھی اصلی حالت میں قائم ہے۔ (۵) یہودی غاصبوں کی نئی آبادی

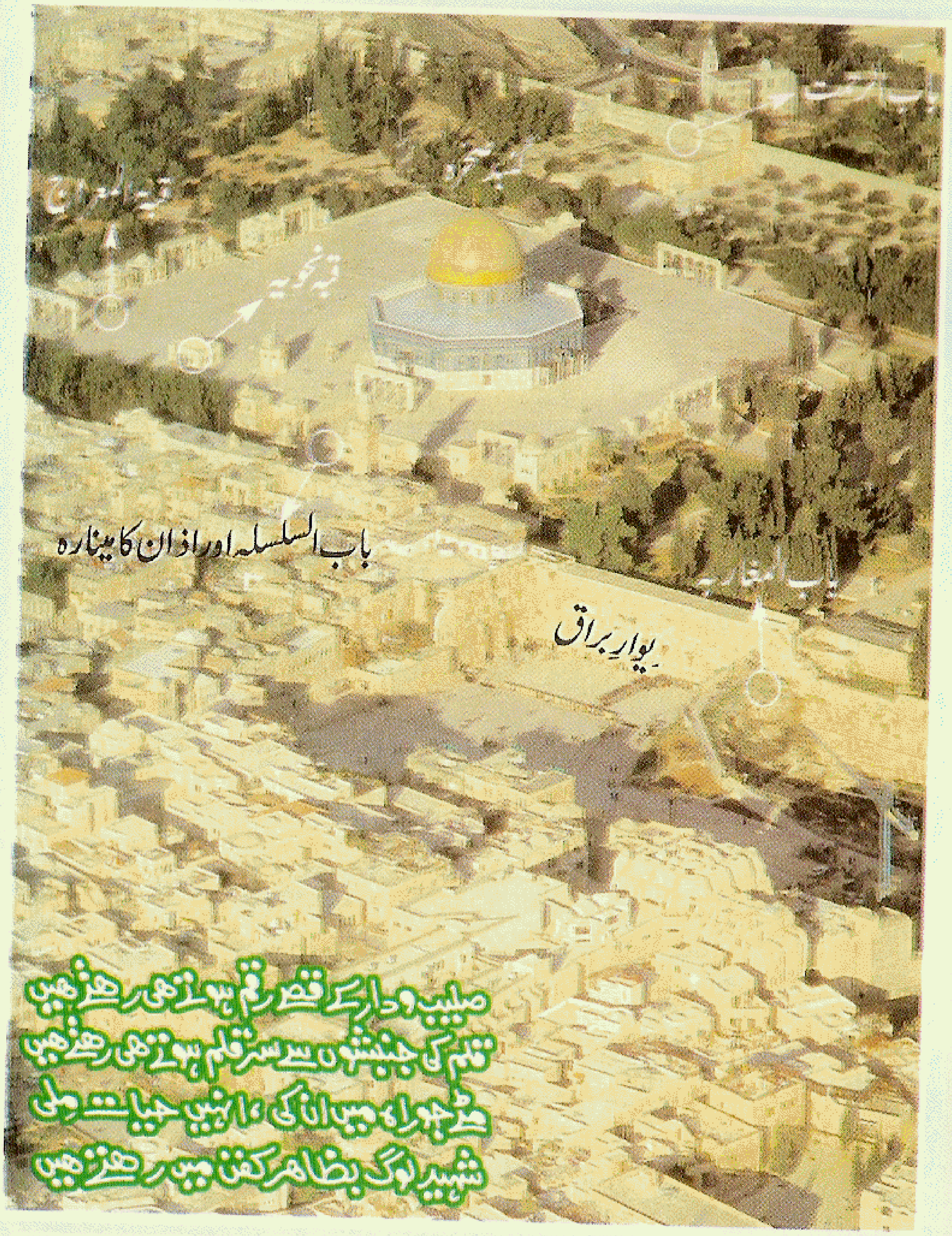
باب الرحمت
قبہ صخرہ
قبۃ المعراج
قبہ نحویہ
باب السلسلہ اوراذان کا مینارہ
باب المغاربہ
دیوار براق
صلیب و دار کے قصے رقم ہوتے ہی رہتے ہیں
قلم کی جنبشوں سے سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں
مٹے جو راہ میں ان کی انہیں حیات ملی
شہید لوگ بظاہر کفن میں رہتے ہیں

حرم قدسی (جسے مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس بھی کہتے ہیں) ایک اور زاویے سے۔ مسجد کی وہ دیوار بھی صاف نظر آ رہی ہے جسے یہودیوں نے دیوار گریہ قرار دے کر مسجد پر قبضے کی ابتدا کی کوشش کی ہے۔

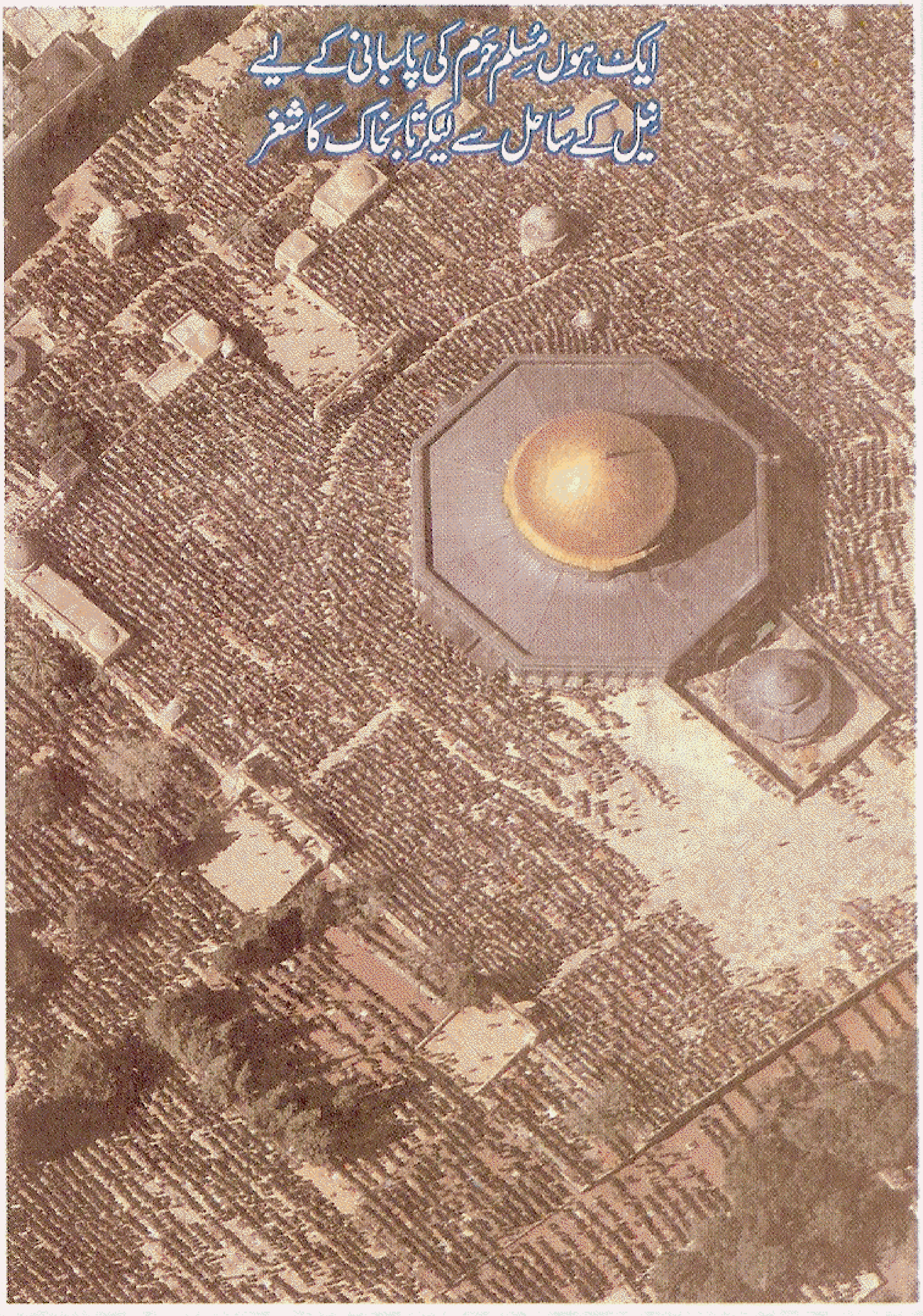
ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

مسجد اقصیٰ کے صحن میں نمازِ جمعہ کے ادائیگی کے لیے شمع توحید کے پروانوں کا ایمان افروز اجتماع۔ مسلمانانِ فلسطین اس بات پر پوری امت کی طرف سے شکریے اور خرج تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود قبلۂ اول کے تحفظ کے لیے قربانیاں دینے میں کسر نہیں چھوڑی۔

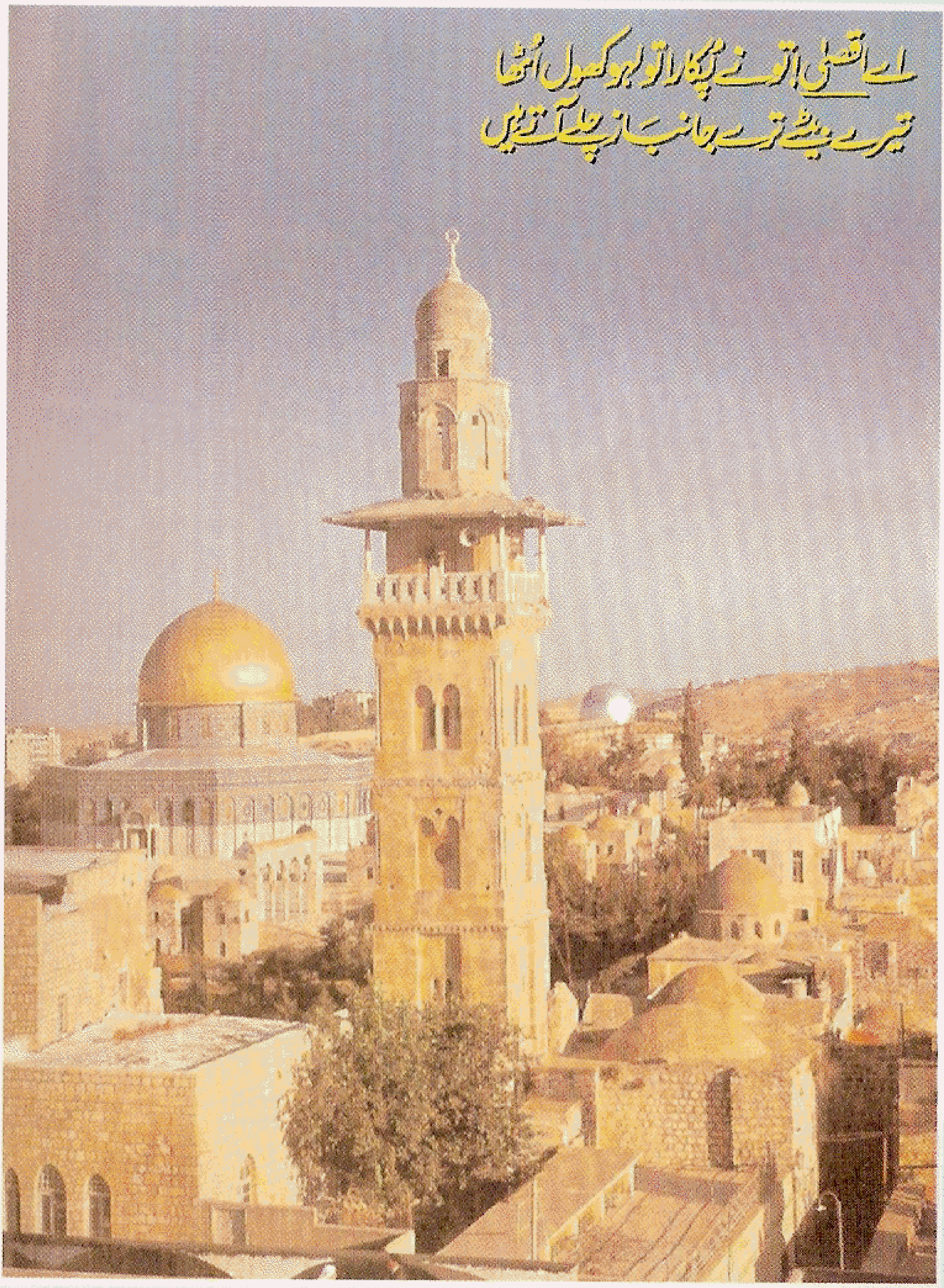

اے اقصیٰ! تو نے پکارا تو لہو کھول اُٹھا
تیرے بیٹے ترے جانب باز چلے آتے ہیں

باب المغاربہ کی جانب سے ایک خوبصورت زاویہ۔ مینار مغاربہ کے دائیں طرف مسجد کے ہال پر قائم چھوٹا سبز گنبد اور بائیں جانب مسجد کے صحن میں واقع بڑا زرد گنبد دکھائی دے رہا ہے۔

کشتیاں اپنی جلا کر اُترو
جب اَمنڈتا ہوا دریا دیکھو

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

مسجد اقصیٰ کے ہال کا بیرونی اور اندرونی منظر۔ ہر چیز پر حزن وملال اور تاسف والم کی کیفیات محسوس کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ دل میں ایمان اور سینے میں غیرت ایمانی کے جذبات موجزن ہوں۔

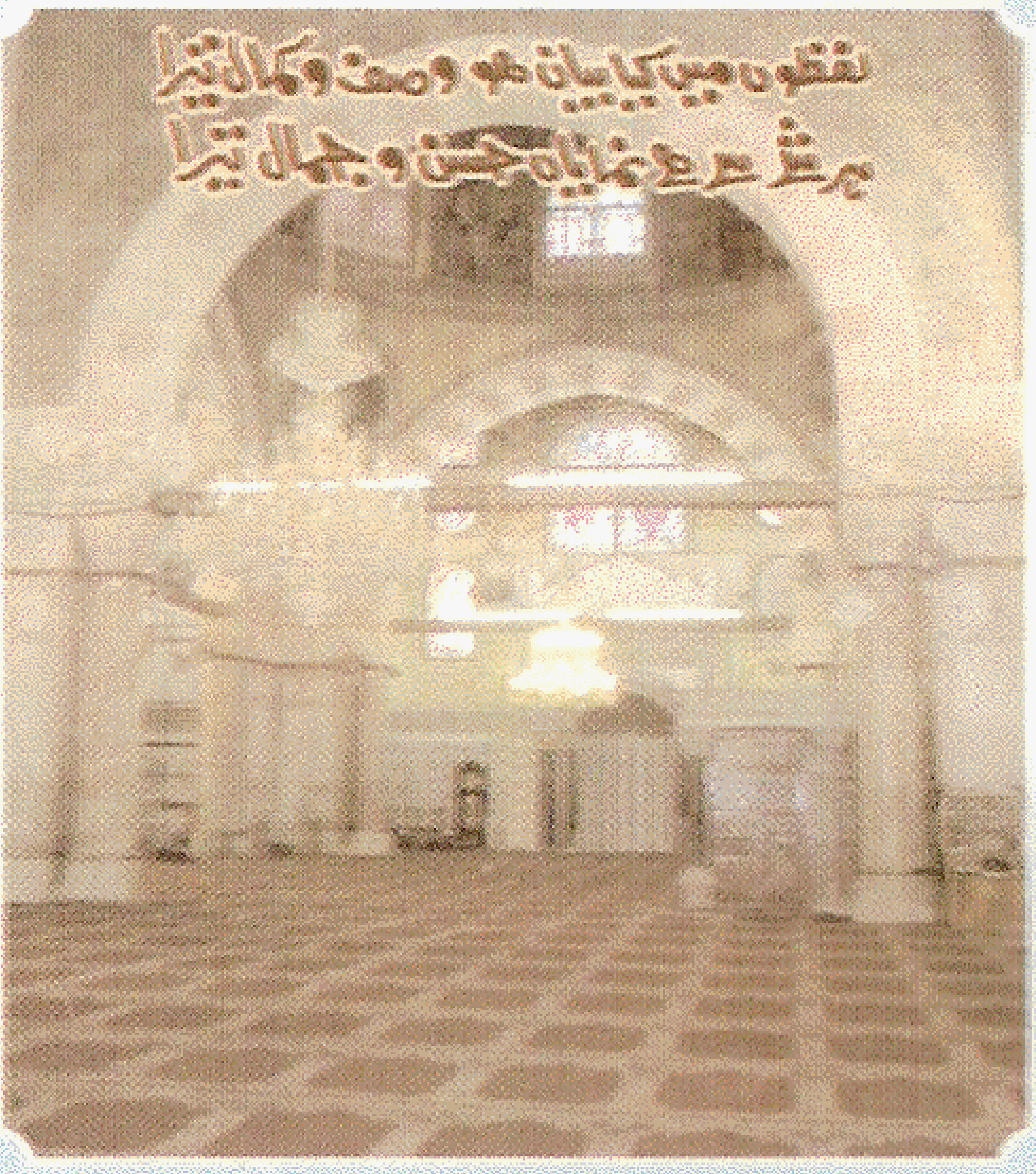
لفظوں میں کیا بیاں ہو وصف و کمال تیرا
ہر شے سے ہے نمایاں حسن و جمال تیرا

مسجد اقصیٰ کا محراب جہاں تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے امام الانبیاء علیہ الصلاۃ والسلام کی اقتدا میں نماز ادا کی۔

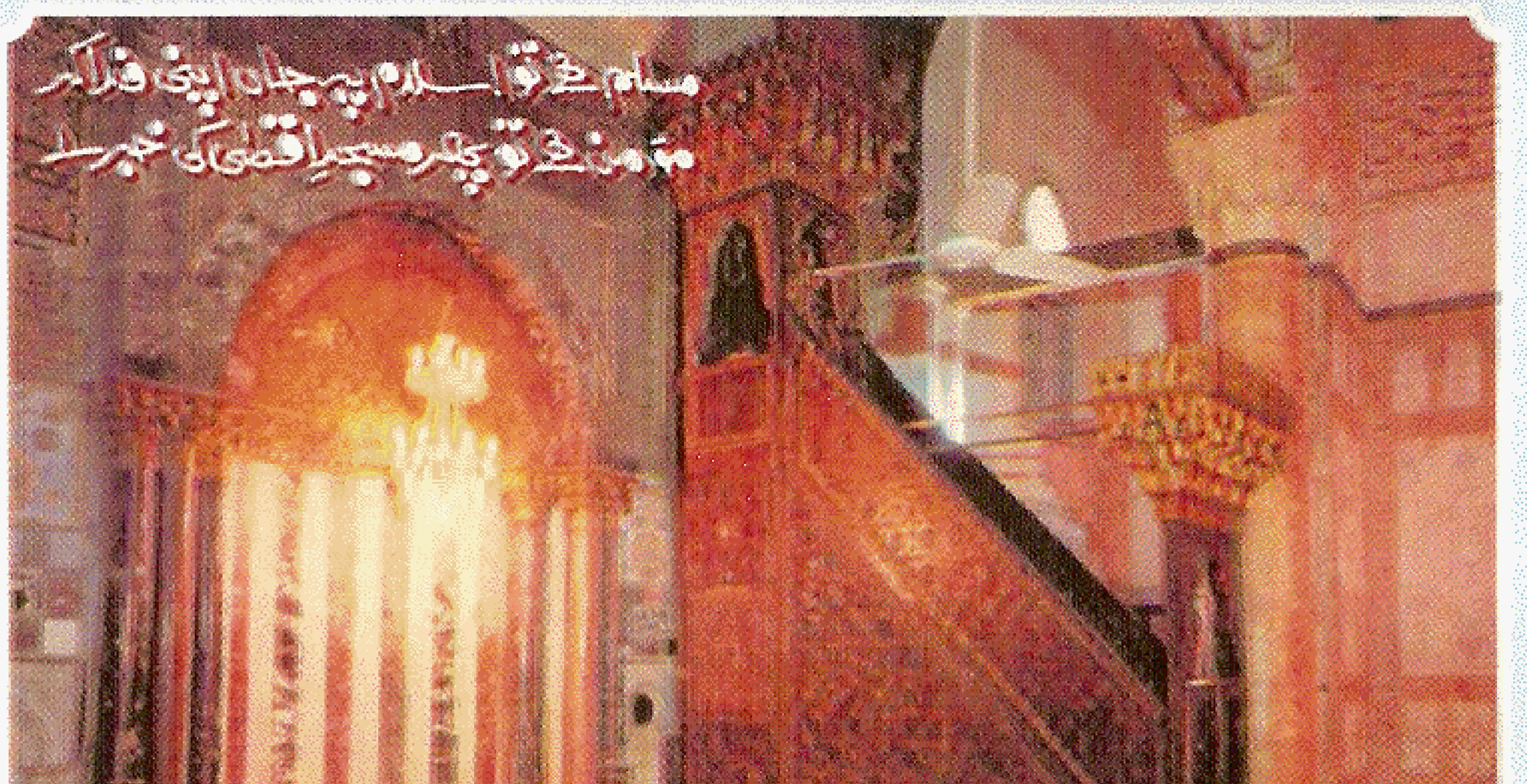
مسلم ہے تو اسلام پہ جاں اپنی فدا کر
مومن ہے تو پھر مسجدِ اقصیٰ کی خبر لے

وہ تاریخی منبر جسے سلطان نورالدین زنگی نے تیار کروایا تھا اور پھر اس کے جانشین سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں اس منبر کی نظیر نہ تھی۔ یہودیوں نے اپنے خبث باطن کا ثبوت دیتے ہوئے ۱۹۶۷ء میں اس نایاب تاریخی یادگار کو جلا دیا۔

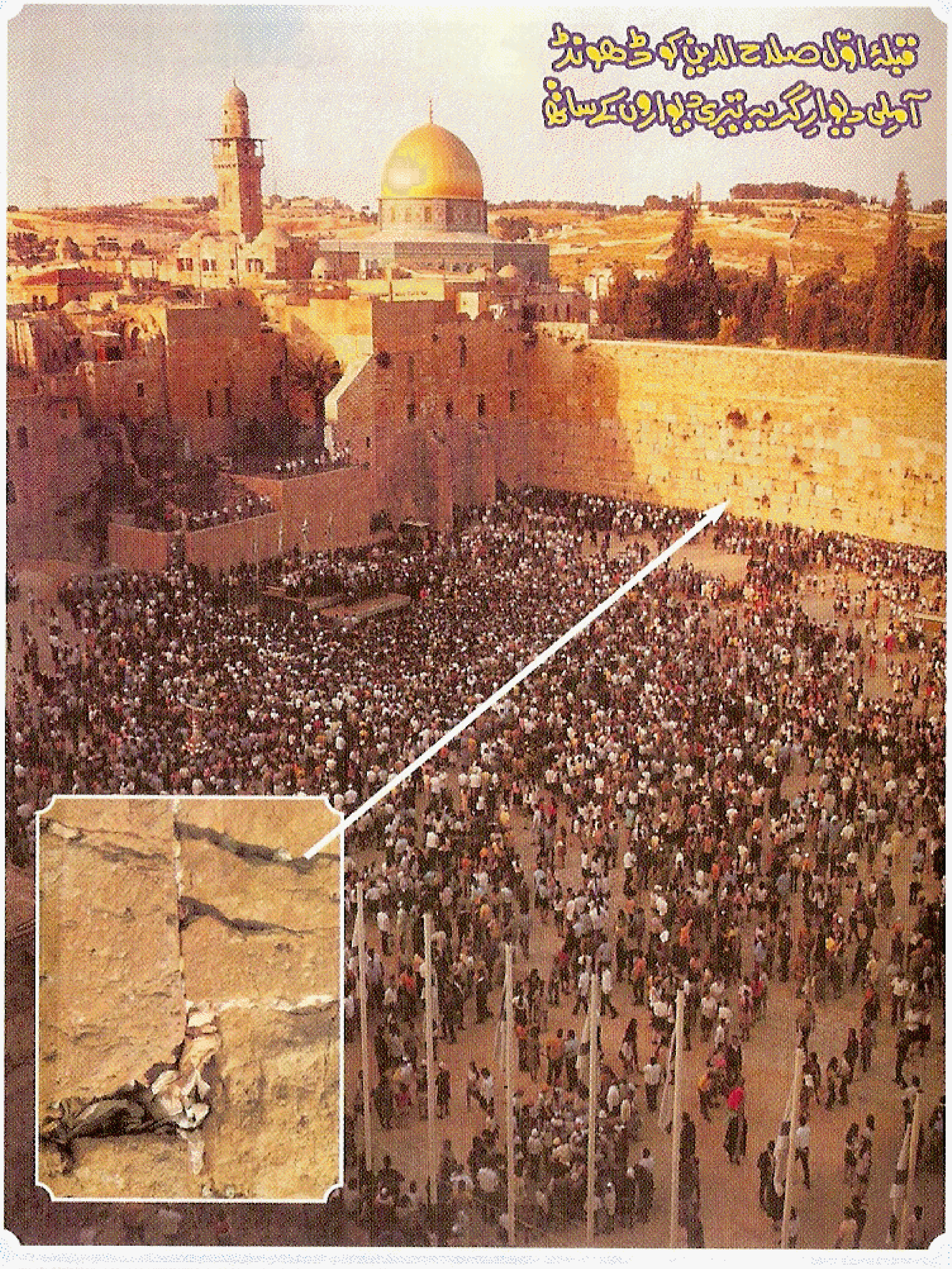
قبلۂ اوّل صلاح الدین کو ڈھونڈ
آ ملی دیوارِ گریہ تیری دیواروں کے سائے

تصویر میں نظر آنے والی کھلی دیوار کو اہل اسلام ''دیوارِ براق'' کہتے ہیں۔ جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات مسجد میں داخلے کے وقت یہاں اپنی سواری ''براق'' کو باندھا تھا۔ یہودیوں نے یہاں قائم مسجد براق اور مسلمانوں کے مکانات گرا گرا اپنے رونے دھونے کی جگہ بنالی ہے۔ وہ دیوار کی درزوں میں اپنے مسیحائے منتظر (دجال اکبر) کے نام درخواستیں اڑستے رہتے ہیں (دیکھیے: چھوٹی تصویر) ان کی تقلید میں عالمی میڈیا اسے ''دیوارِ گریہ'' کے نام سے پکارتا ہے۔ مسلمانوں کو اس نام کی بجائے اصل نام ''دیوارِ براق'' سے پکارنا چاہیے۔

کہتی تجھ کو دنیا لہو رنگ فلسطین ہے
فی الحقیقت تو جنت کا اِک گل رنگین ہے

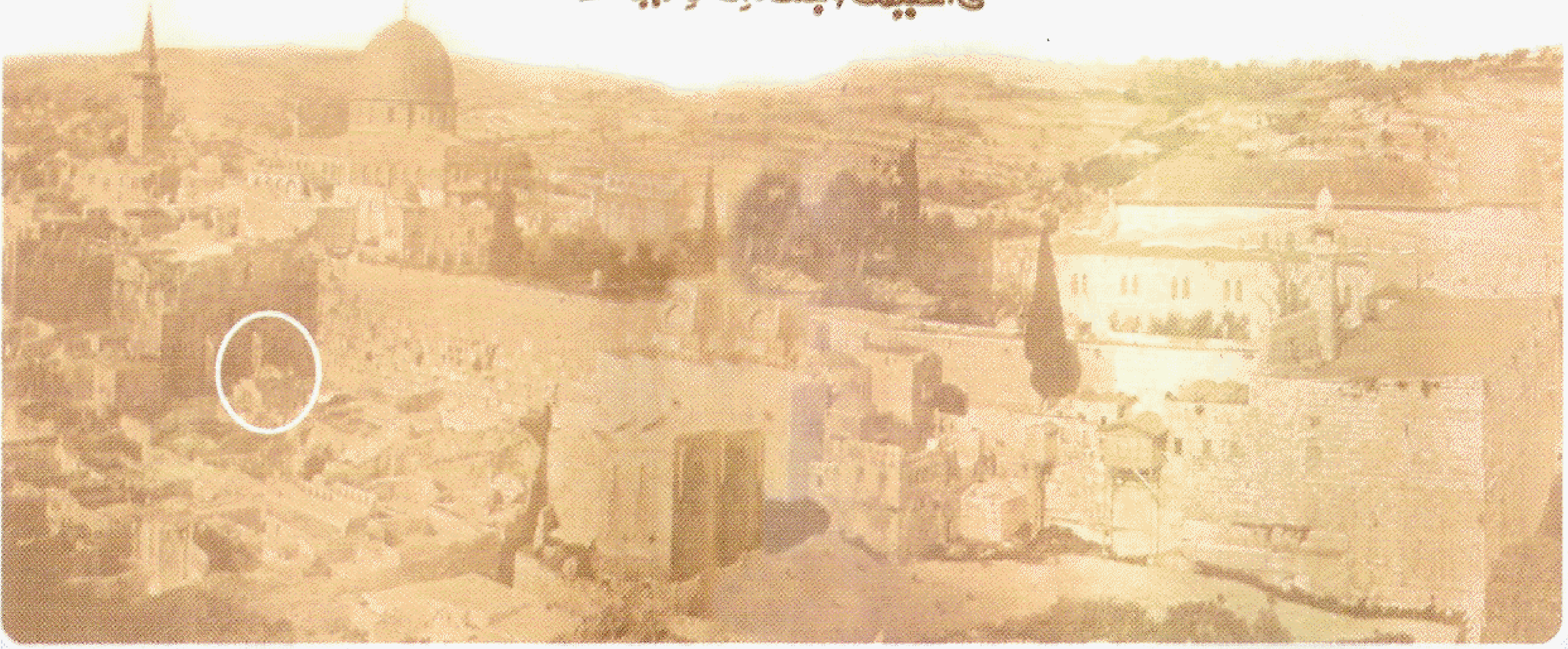

مسجد اقصیٰ کی ایک قدیم یادگار تصویر جس میں دیوارِ براق کے باہر مسلمانوں کے مکانات اور (دائرے میں) مسجد براق بھی نظر آ رہی ہے جسے بعد میں شہید کر دیا گیا۔

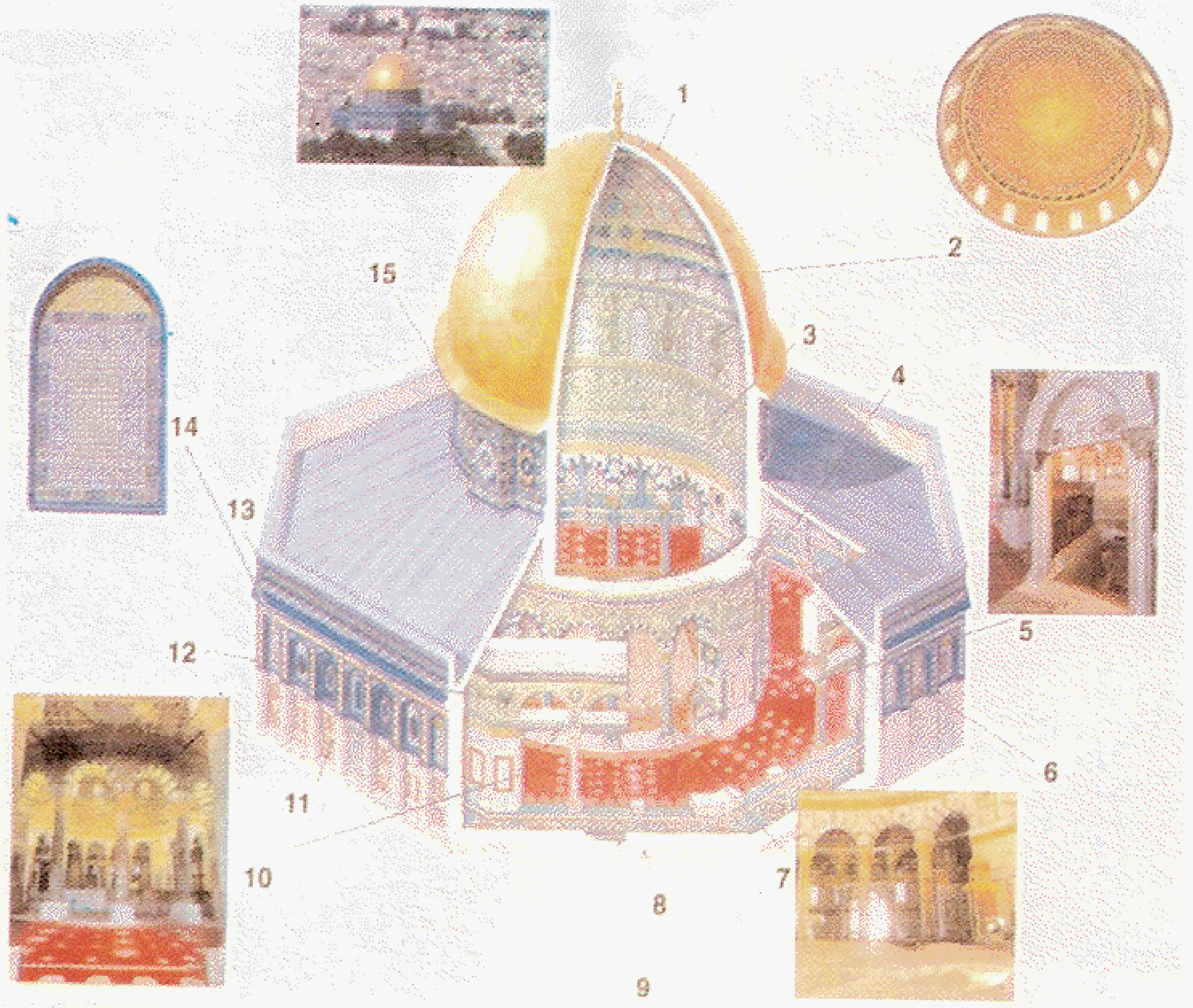

گنبد صخرہ کی تفصیلی معلومات

(۱) **گنبد کا بیرونی حصہ:** اصل میں گنبد تانبے کا بنا ہوا ہے۔ اس پر سونے کی ایک باریک تہہ چڑھا دی گئی ہے۔
(۲) **گنبد کا اندرونی حصہ:** یہ حصہ نہایت دلکش پھول کاری کے ڈیزائن اور خطاطی سے مزین ہے۔
(۳) گنبد کے نچلے حصے میں سبز اور سنہری ٹائلیں۔
(۴) بیرونی راہداری۔
(۵) یہ زینہ صخرہ معراج کے نیچے موجود غار کی طرف جاتا ہے۔
(۶) رنگین شیشوں والی کھڑکیاں۔
(۷) **معراج کا پتھر:** یہ وہ مقدس چٹان ہے جہاں سے ایک روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر لے جایا گیا تھا جب معراج کا معجزہ واقع ہوا تھا۔
(۸) بیرونی دیوار کا حصہ ۲۰.۴ میٹر لمبا ہے۔ اس کی لمبائی بالکل گنبد کے قطر کے برابر ہے اور گنبد کی اونچائی کی پیمائش بھی اس کے برابر ہے۔
(۹) جنوبی داخلی راستہ۔
(۱۰) اندرونی راہداری۔
(۱۱) سنگ مرمر سے مزین حصہ۔
(۱۲) **آٹھ کونوں والی محرابی راہداری:** یہ حصہ اصل ٹائلوں سے سجا ہوا ہے اور اس پر کندہ اعلیٰ درجے کی اسلامی خطاطی عیسائیوں کو اسلام کی حقانیت قبول کرنے کا درس دیتی ہے۔
(۱۳) قرآنی آیات کی خوبصورت خطاطی۔
(۱۴) **ٹائلوں سے مزین حصہ:** اس میں مختلف رنگوں کے ٹائل لگے ہوئے ہیں۔
(۱۵) یہ حصہ بھی ٹائلوں سے سجا ہوا ہے جس پر قرآن مجید کی سترہویں سورت (سورہ اسراء) کی پہلی آیت لکھی ہوئی ہے۔

مسجد اقصیٰ کے صحن میں وہ مقدس چٹان واقع ہے جو مسلمانوں کا قبلۂ اول تھی۔ خلیفۃ المسلمین ولید بن عبد الملک نے اس پر وہ خوبصورت گنبد تعمیر کروایا جو خوبصورتی اور پائیداری میں اپنی مثال آپ ہے۔ دیے گئے خاکہ میں اس گنبد کے مختلف حصوں کا تعارف دیا گیا ہے۔

تِرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

گنبد صخرہ نامی اس لافانی اور لازوال شاہکار کا رات کے وقت حسین منظر جسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

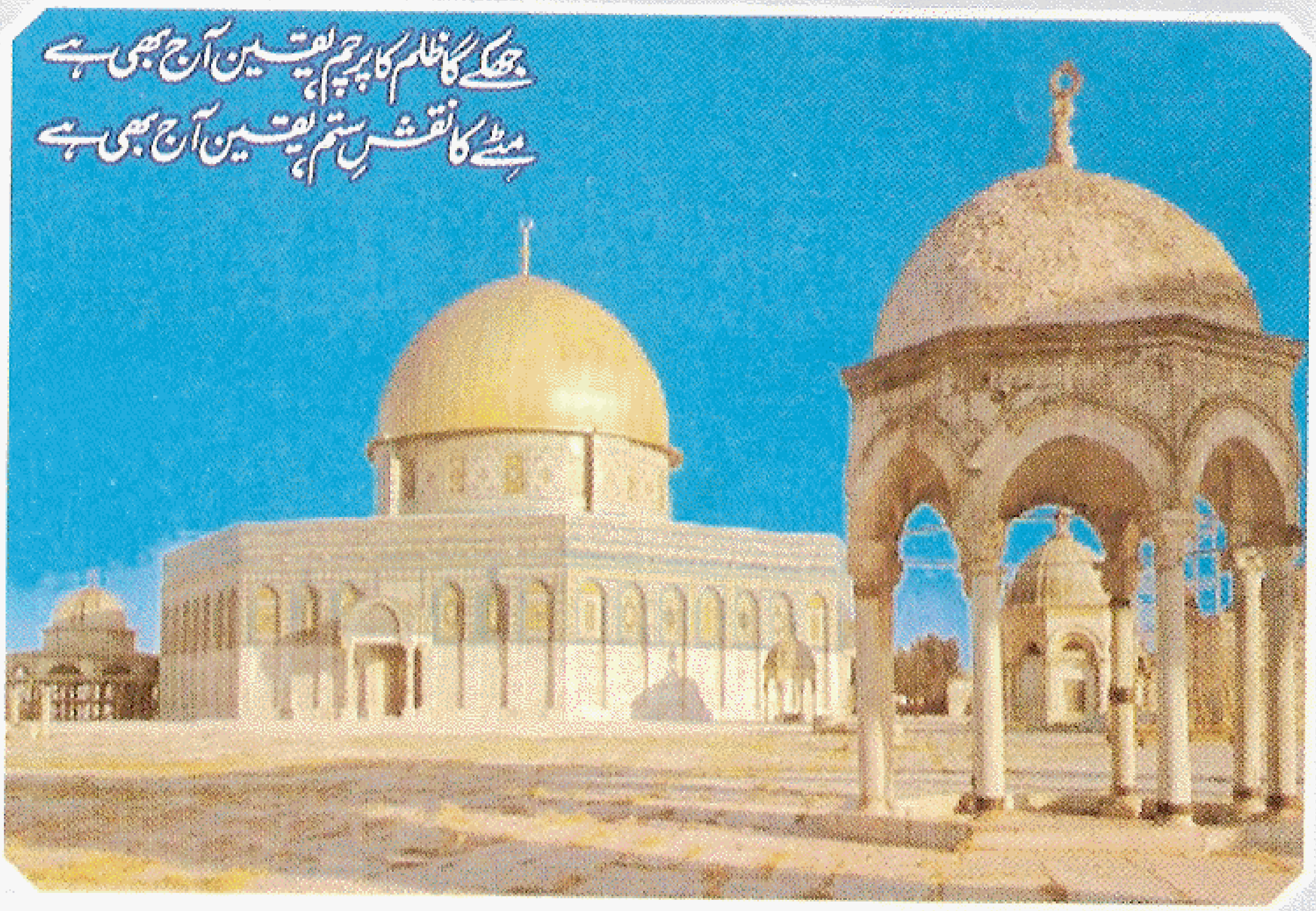

جھکے گا ظلم کا پرچم یقین آج بھی ہے
مٹے گا نقشِ ستم یقین آج بھی ہے

مسلمانوں کا مذہبی اور تاریخی ورثہ جس پر یہود کے قبضے کی وجہ سے چھائی اداسی اور سوگواری صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

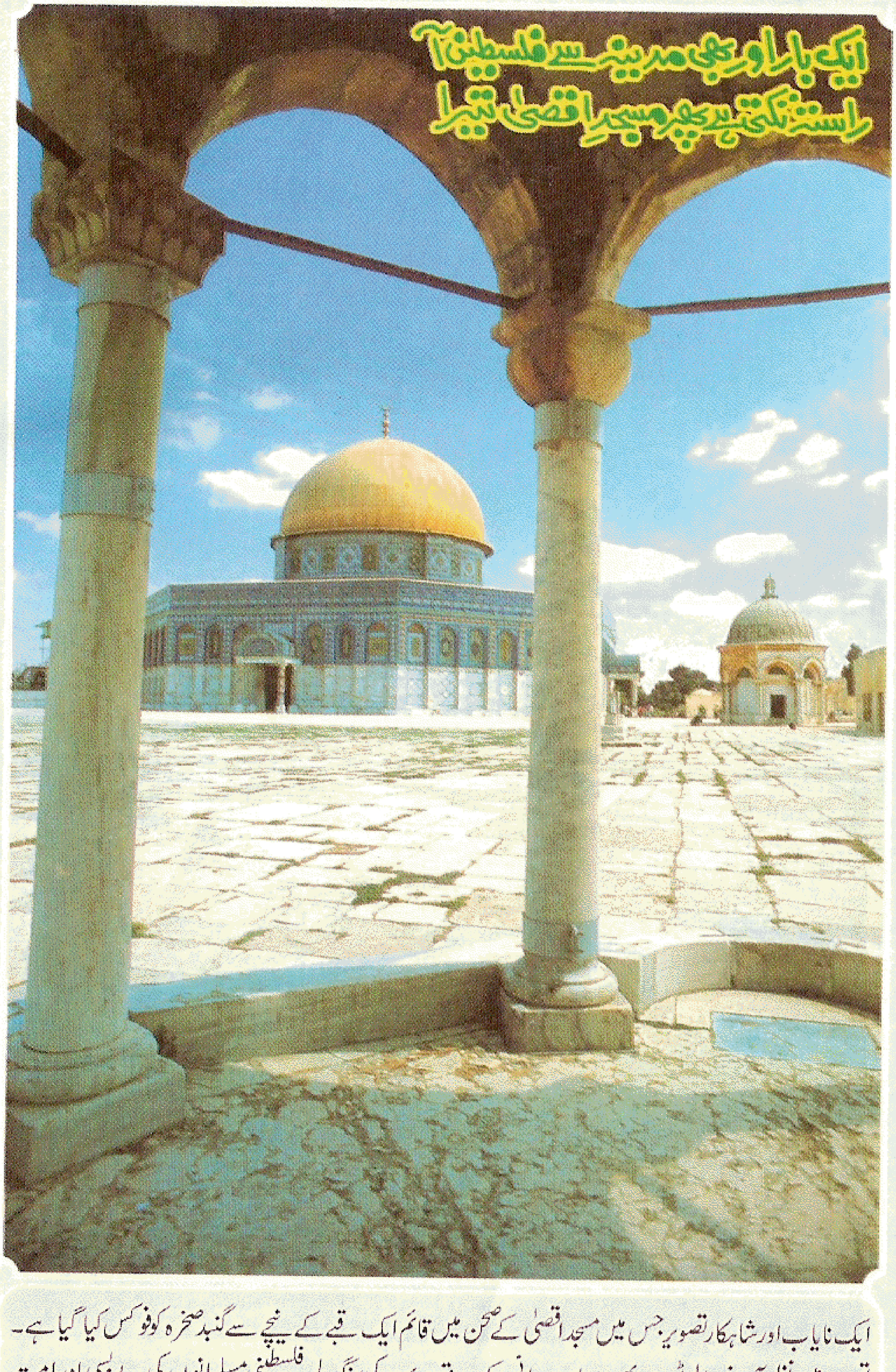

ایک بار اور بھی مدینے سے فلسطین آ
راستہ تکتی ہے پھر مسجد اقصیٰ تیرا

ایک نایاب اور شاہکار تصویر جس میں مسجد اقصیٰ کے صحن میں قائم ایک قبے کے نیچے سے گنبد صخرہ کو فوکس کیا گیا ہے۔ تصویر میں نظر آنے والی ٹوٹ پھوٹ اور ویرانی بیک وقت یہود کی سنگدلی، فلسطینی مسلمانوں کی بے بسی اور امت مسلمہ کی بے حسی کی المناک کہانی سنا رہی ہے۔

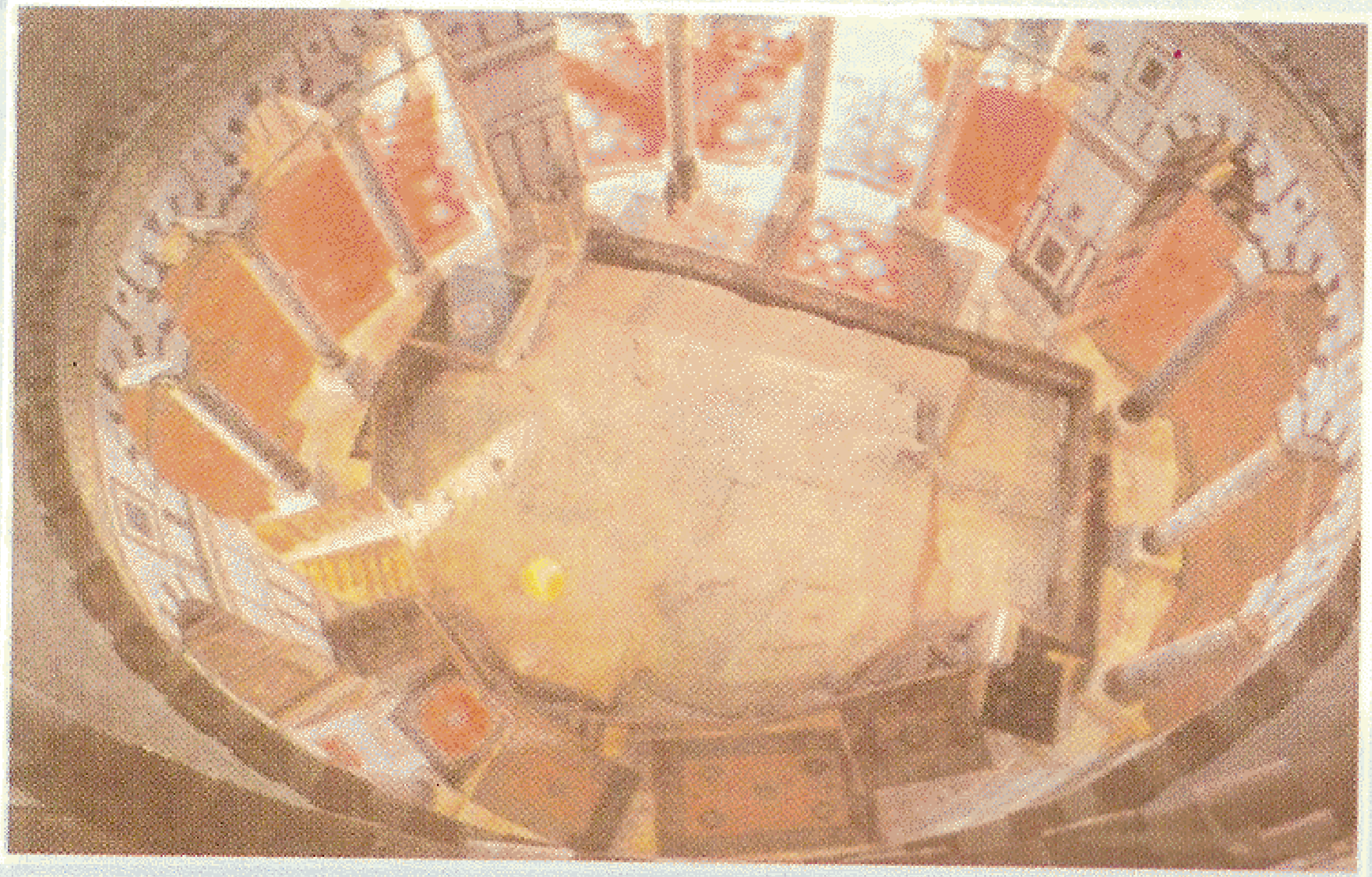

یہ وہ مقدس چٹان ہے جو مسلمانوں کا قبلۂ اول رہی ہے۔ الٹے ہاتھ پر چٹان میں واقع سوراخ اور وہ سیڑھیاں ہیں جو چٹان کے نیچے واقع قدرتی غار کی طرف جا رہی ہیں۔

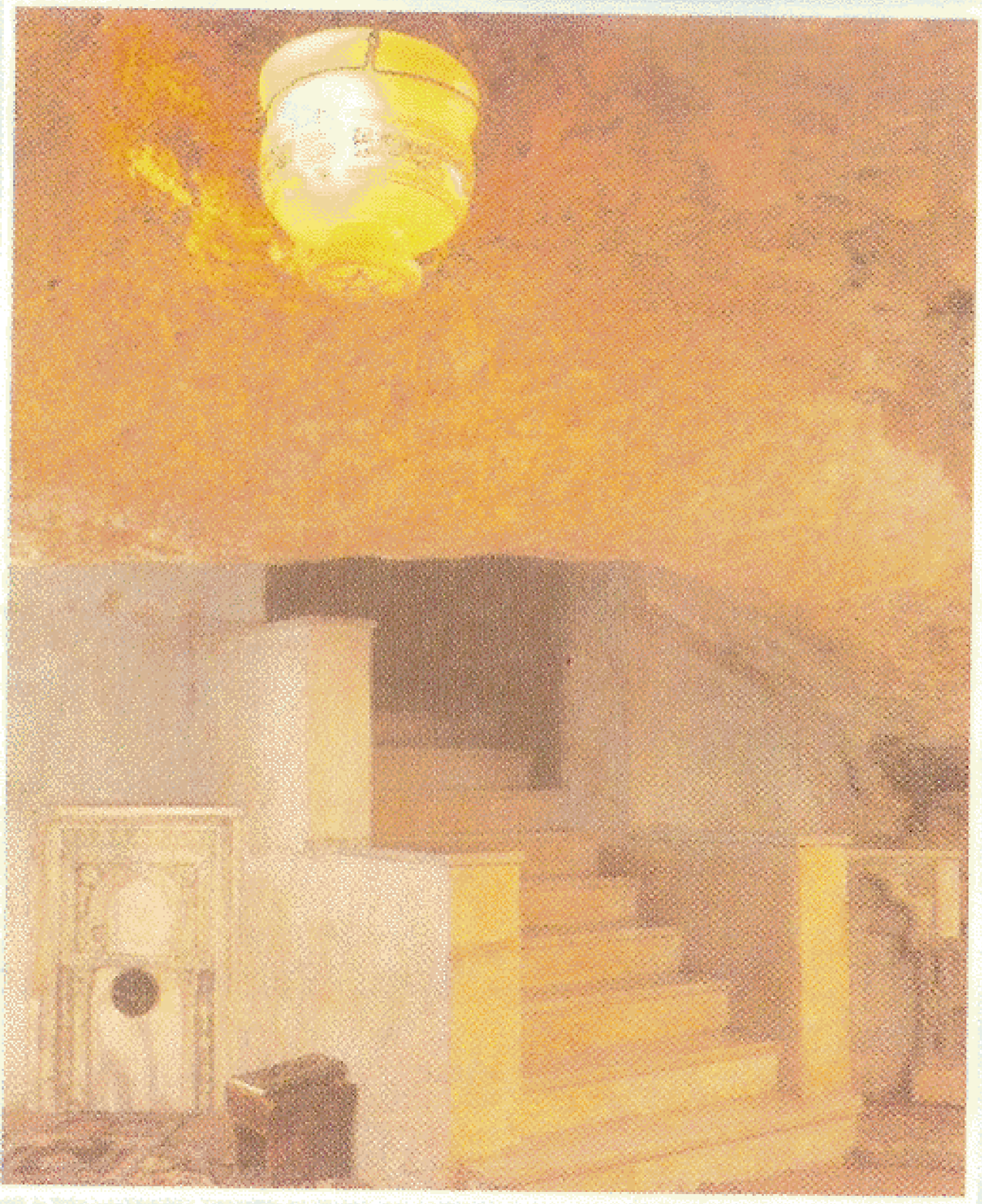

مقدس چٹان کے نیچے واقع قدرتی غار جہاں مسلمان نماز اور تلاوت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ یہودیوں کی مذہبی داستانوں کے مطابق تورات کی اصل تختیاں اور تابوتِ سکینہ وغیرہ یہاں کہیں مدفون ہیں۔

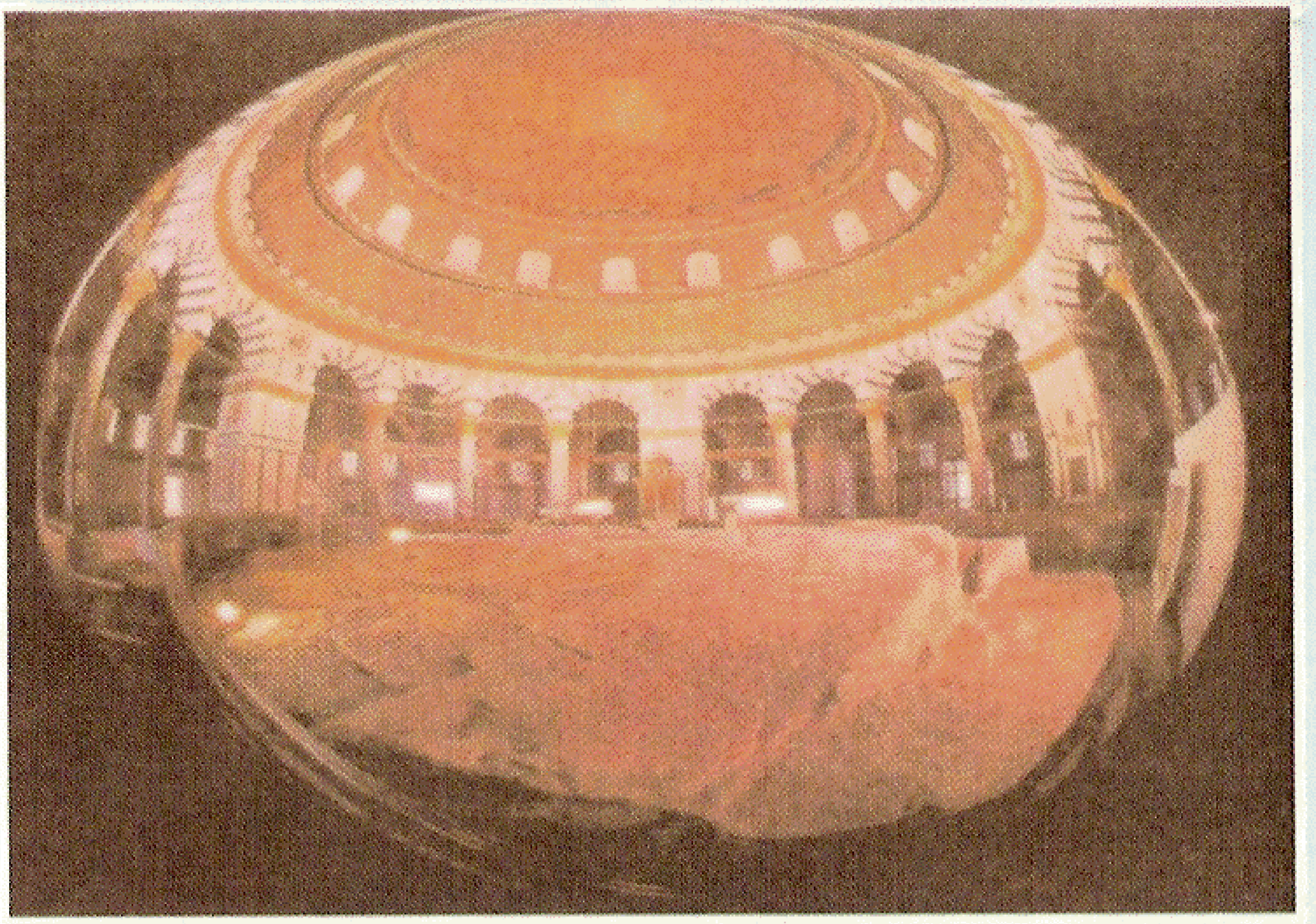

ایک فوٹوگرافر کے حسنِ ذوق نے مقدس چٹان اور اس پر قائم خوبصورت گنبد کو قیمتی نگینے کی طرح محفوظ کر دیا ہے۔

یہ چٹان مسلمانوں کے لیے حجر اسود کی طرح قابل احترام ہے۔ ایک مستند حدیث کے مطابق حجر اسود اور یہ چٹان دونوں جنت سے آئے ہیں۔

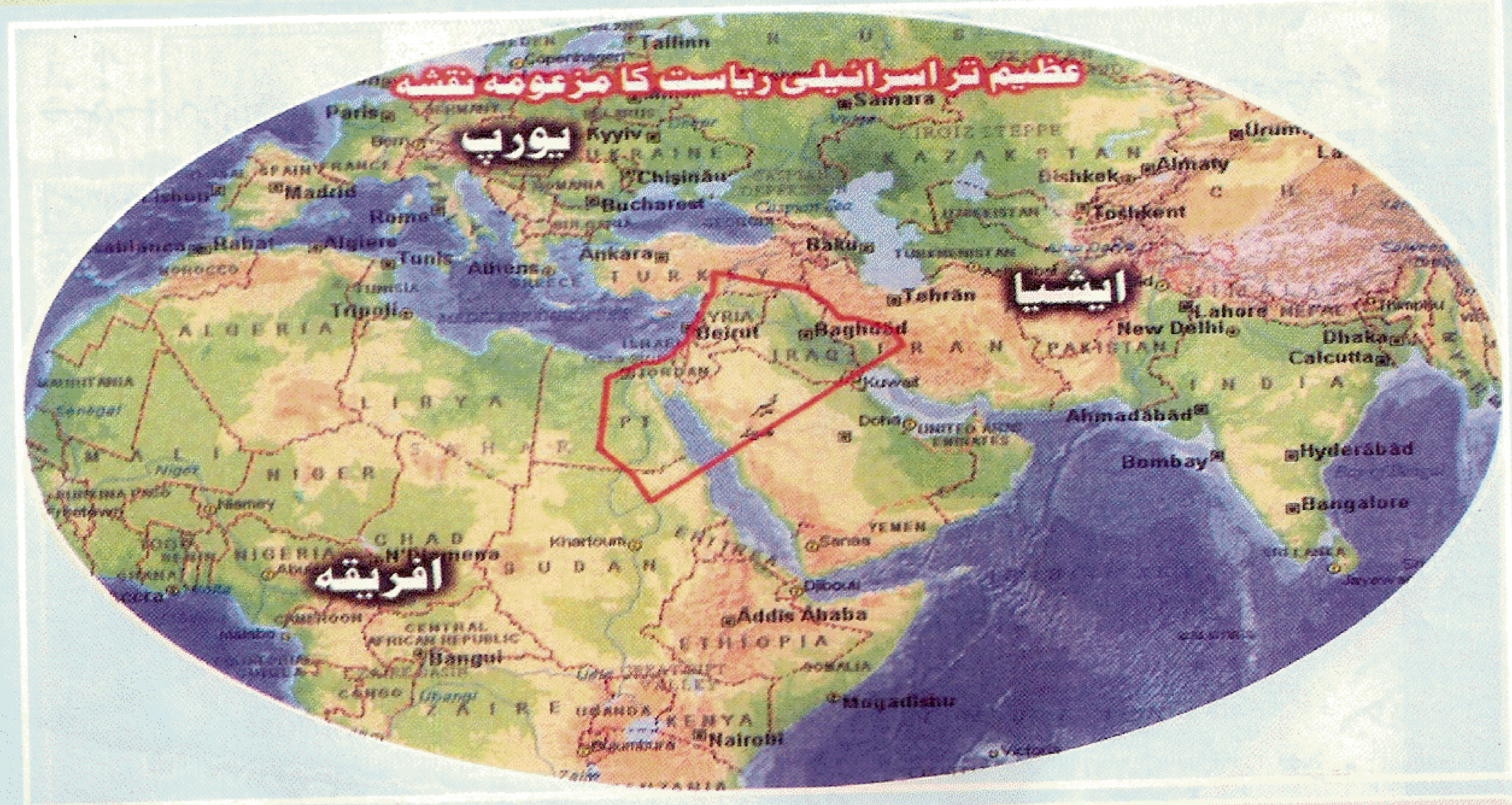

عظیم تر اسرائیلی ریاست کا مزعومہ نقشہ

یورپ
ایشیا
افریقہ
Tallinn
Samara
Paris
Kyyiv
UKRAINE
Chisinau
Madrid
Bucharest
Rome
Algiers
Tunis
Athens
Ankara
TURKEY
Baku
KAZAKSTAN
Bishkek
Almaty
Tashkent
Urumqi
Tehran
IRAN
Lahore
New Delhi
PAKISTAN
Dhaka
Calcutta
INDIA
Ahmadabad
Bombay
Hyderabad
Bangalore
SRI LANKA
Tripoli
ALGERIA
LIBYA
SYRIA
Beirut
ISRAEL
JORDAN
Baghdad
IRAQ
Kuwait
Doha
UNITED ARAB EMIRATES
YEMEN
Sanaa
Djibouti
Addis Ababa
ETHIOPIA
SOMALIA
Mogadishu
Khartoum
SUDAN
ERITREA
NIGER
MALI
Niamey
CHAD
N'Djamena
NIGERIA
CENTRAL AFRICAN REPUBLIC
Bangui
CAMEROON
CONGO
ZAIRE
UGANDA
KENYA
Nairobi
TANZANIA

دنیا کے تین مشہور براعظموں کے سنگم پر ''گریٹر اسرائیل'' کے نام سے دجال اکبر کی سربراہی میں پورے روئے ارض پر حکومت کرنے والی یہودی ریاست کا نقشہ۔ مسلمانوں کی غیرت کو جھنجھوڑنے والی بات یہ ہے کہ مدینہ منورہ سمیت ارض حرمین کا بہت سا حصہ اس نقشے میں شامل ہے۔

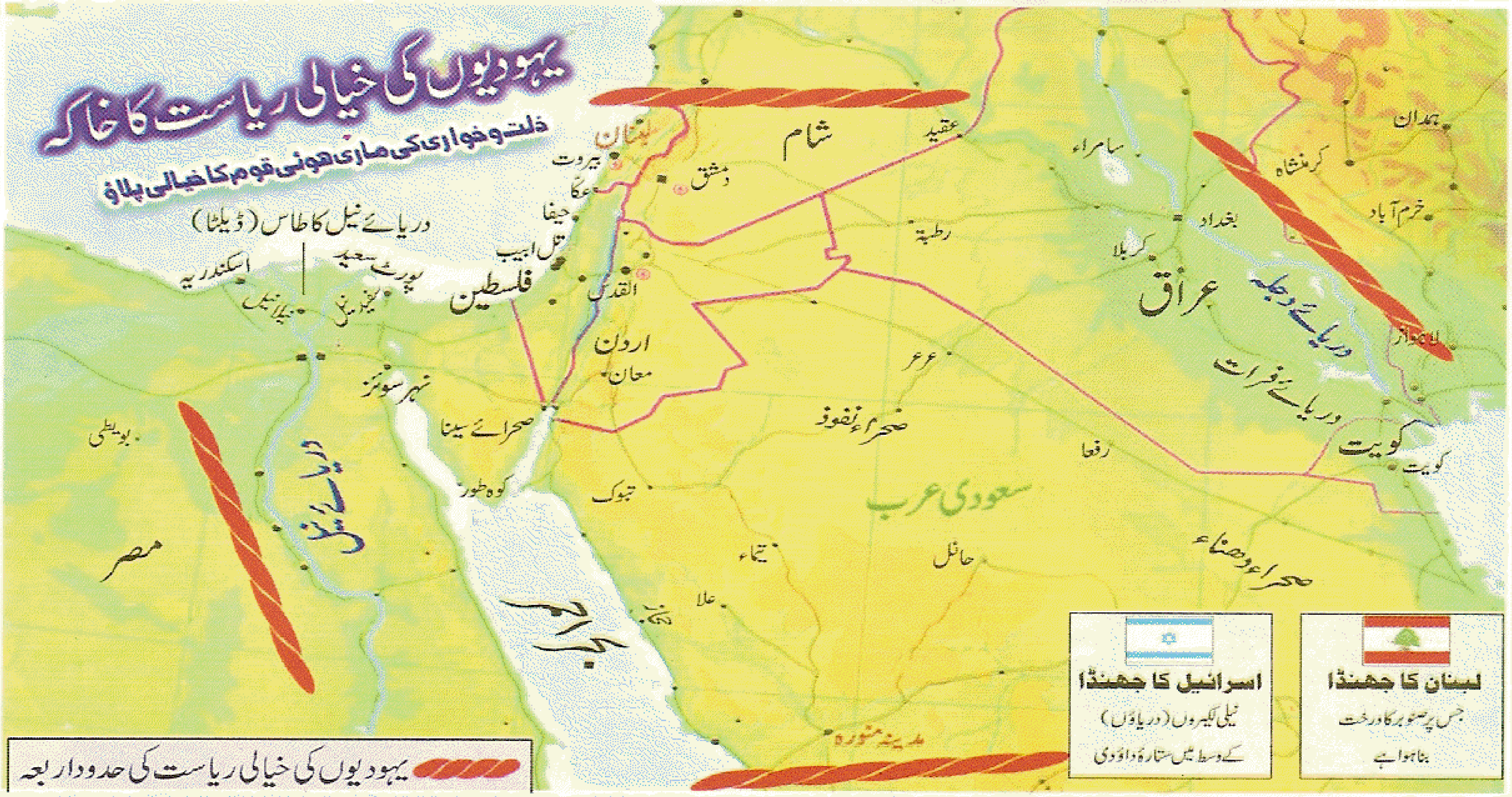

یہودیوں کی خیالی ریاست کا خاکہ

ذلت و خواری کی ماری ہوئی قوم کا خیالی پلاؤ

دریائے نیل کا طاس (ڈیلٹا)
لبنان
بیروت
عکا
حیفا
تل ابیب
فلسطین
اسکندریہ
پورٹ سعید
بحیرہ منزلہ
دریائے نیل
بویطی
مصر
نہر سویز
صحرائے سینا
کوہ طور
بحر احمر
القدس
اردن
معان
تبوک
تیماء
علا
دمشق
شام
عقید
رطبۃ
عرعر
صحراء نفوذ
سعودی عرب
حائل
مدینہ منورہ
سامراء
بغداد
کربلا
عراق
دریائے دجلہ
دریائے فرات
کرمنشاہ
ہمدان
خرم آباد
اہواز
کویت
رفعا
صحراء دھناء
اسرائیل کا جھنڈا
نیلی لکیروں (دریاؤں) کے وسط میں ستارۂ داؤدی
لبنان کا جھنڈا
جس پر صنوبر کا درخت بنا ہوا ہے
یہودیوں کی خیالی ریاست کی حدود اربعہ

یہودیوں کے منصوبے کے مطابق اسرائیل کی اصل حدود لمبائی میں صنوبر کے درخت والی زمین (لبنان) سے کھجور کے درخت والی زمین (مدینہ منورہ) تک، اور چوڑائی میں دریائے دجلہ سے دریائے نیل تک ہے۔ درج بالا نقشے میں اس خفیہ منصوبے کو آشکارا کیا گیا ہے۔

صہیونی ریاست کا مجوزہ منصوبہ: درجہ بہ درجہ قدم بقدم

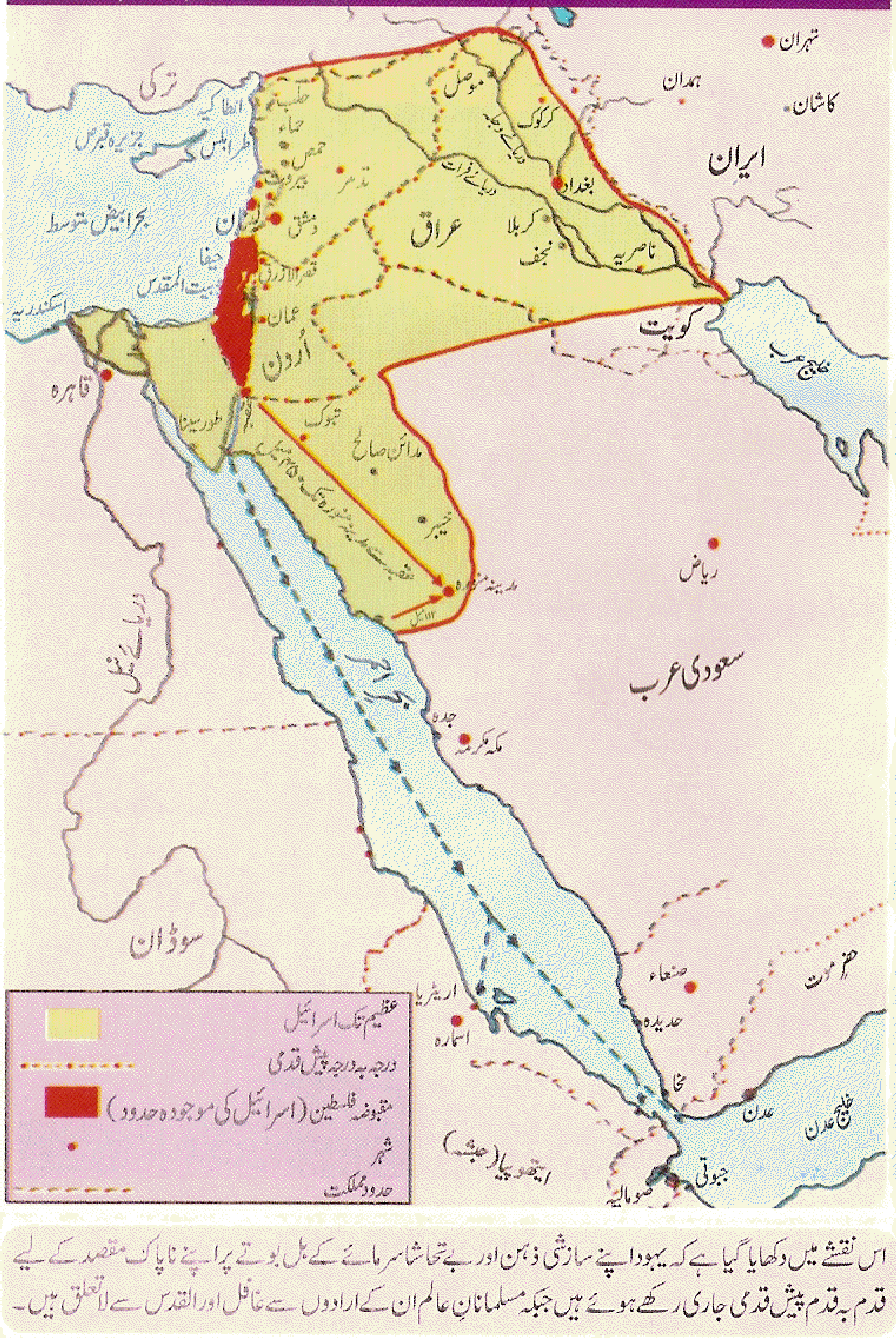
تہران
ہمدان
کاشان
ایران
ترکی
موصل
کرکوک
دریائے دجلہ
حلب
انطاکیہ
حماہ
حمص
جزیرہ قبرص
طرابلس
بیروت
تدمر
دریائے فرات
بغداد
بحرابیض متوسط
لبنان
دمشق
عراق
کربلا
نجف
ناصریہ
حیفا
بیت المقدس
قصر الازرق
اسکندریہ
عمان
کویت
اردن
خلیج عرب
قاہرہ
طور سینا
تبوک
مدائن صالح
خیبر
ریاض
مدینہ منورہ
دریائے نیل
بحر احمر
سعودی عرب
جدہ
مکہ مکرمہ
سوڈان
حضرموت
صنعاء
اریٹریا
حدیدہ
اسمارہ
مخا
عدن
خلیج عدن
ایتھوپیا (حبشہ)
جبوتی
صومالیہ
عظیم تر اسرائیل
درجہ بہ درجہ پیش قدمی
مقبوضہ فلسطین (اسرائیل کی موجودہ حدود)
شہر
حدود مملکت

اس نقشے میں دکھایا گیا ہے کہ یہود اپنے سازشی ذہن اور بے تحاشا سرمائے کے بل بوتے پر اپنے ناپاک مقصد کے لیے قدم بہ قدم پیش قدمی جاری رکھے ہوئے ہیں جبکہ مسلمانانِ عالم ان کے ارادوں سے غافل اور القدس سے لاتعلق ہیں۔

"اور وہ تدبیر کرتے تھے اور اللہ بھی تدبیر کرتا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے"

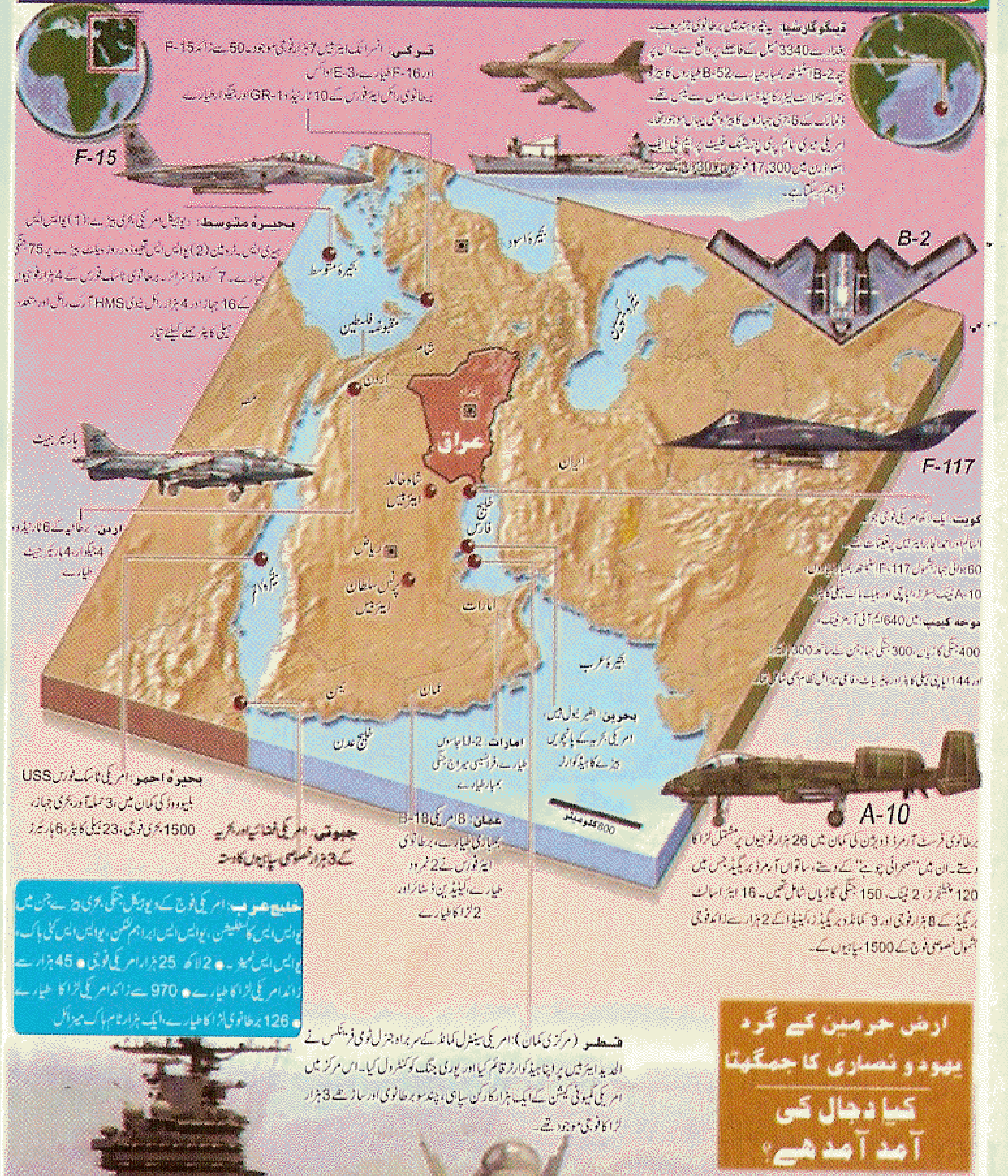
ترکی: انسرلک ایئربیس میں 7 ہزار فوجی موجود۔ 50 سے زائد F-15 اور F-16 طیارے، E-3 اواکس
برطانوی رائل ایئر فورس کے 10 ٹارنیڈو GR-1 طیارے
ڈیگو گارشیا: بغداد سے 3340 میل کے فاصلے پر واقع
B-2 B-52
17,300
F-15
B-2
F-117
A-10
بحیرۂ متوسط: یو ایس ایس (1) یو ایس ایس (2) 75 جنگی طیارے HMS
ہیرئیر جیٹ
اردن: 6 ... 4 ... طیارے
کویت:
F-117
A-10
دوحہ کیمپ: 640
400 جنگی ... 300 ... 300
144
بحیرۂ اسود
بحیرۂ کیسپین
بحیرۂ متوسط
مقبوضہ فلسطین
شام
اردن
مصر
عراق
ایران
شاہ خالد ایئربیس
خلیج فارس
ریاض
پرنس سلطان ایئربیس
بحیرۂ احمر
امارات
عمان
یمن
خلیج عدن
بحیرۂ عرب
800 کلومیٹر
بحرین: امریکی بحریہ کے پانچویں بیڑے کا ہیڈکوارٹر
امارات: 2 U-2 جاسوس طیارے، فرانسیسی میراج جنگی بمبار طیارے
عمان: 8 امریکی B-1B بمبار طیارے، برطانوی ایئر فورس کے 2 ٹرائی اسٹار طیارے، ... اور 2 لڑاکا طیارے
جبوتی: امریکی فضائیہ اور بحریہ کے 3 ہزار خصوصی سپاہیوں کا دستہ
بحیرۂ احمر: امریکی ٹاسک فورس USS تھیوڈور کی کمان میں 3 حملہ آور بحری جہاز، 1500 بحری فوجی، 23 ہیلی کاپٹر، 6 ہیرئیر
برطانوی فرسٹ آرمرڈ ڈویژن کی کمان میں 26 ہزار فوجیوں پر مشتمل لڑاکا دستے۔ ان میں "صحرائی چوہے" کے دستے، ساتواں آرمرڈ بریگیڈ جس میں 120 چیلنجر 2 ٹینک، 150 جنگی گاڑیاں شامل تھیں۔ 16 ایئر اسالٹ بریگیڈ کے 8 ہزار فوجی اور 3 کمانڈو بریگیڈ کے 2 ہزار سے زائد فوجی بشمول خصوصی فوج کے 1500 سپاہیوں کے۔
خلیج عرب: امریکی فوج کے پانچ بڑے جنگی بحری بیڑے جن میں یو ایس ایس کانسٹیلیشن، یو ایس ایس ابراہم لنکن، یو ایس ایس کٹی ہاک، یو ایس ایس نمٹز ● 2 لاکھ 25 ہزار امریکی فوجی ● 45 ہزار سے زائد امریکی لڑاکا طیارے ● 970 سے زائد امریکی لڑاکا طیارے ● 126 برطانوی لڑاکا طیارے، ایک ہزار ٹام ہاک میزائل
قطر (مرکزی کمان): امریکی سینٹرل کمانڈ کے سربراہ جنرل ٹومی فرینکس نے العدید ایئربیس پر اپنا ہیڈکوارٹر قائم کیا اور پوری جنگ کو کنٹرول کیا۔ اس مرکز میں امریکی کمیونی کیشن کے ایک ہزار اہلکار، کئی سپاہی، چند سو برطانوی اور ساڑھے 3 ہزار لڑاکا فوجی موجود تھے۔
ارض حرمین کے گرد یہود و نصاریٰ کا جمگھٹا
کیا دجال کی آمد آمد ہے؟

دیے گئے نقشے سے معلوم ہو رہا ہے کہ عالمِ اسلام کے تینوں مقدس مقامات کے چاروں طرف امریکا اور یورپ کی اہم فوجی طاقتیں براجمان ہیں۔ یہ طاقتیں عظیم تر اسرائیلی ریاست کے قیام میں اسرائیل کو مدد دینے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ یہ صورتحال سارے عالمِ اسلام کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

اے خدا! دے زور دست خالد و حیدر ہمیں
پھر اٹھائے صف کفر و در خیبر ہمیں

اسرائیلی پارلیمنٹ کا اندرونی منظر۔ اسپیکر کی پشت پر موجود پتھر کی سل میں گریٹر اسرائیل کا نقشہ کندہ ہے۔ اسرائیل دنیا کا وہ واحد ملک ہے جو علی الاعلان دوسرے ملکوں پر قبضے کی باتیں کرتا ہے اور کھلم کھلا ان دعووں کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ عراق پر قبضے اسرائیل نے اپنے مشن کی طرف ایک اور قدم بڑھالیا ہے اور افسوس کہ ان قدموں کو پیچھے دھکیلنے کی ذمہ داری جن پر تھی وہ اس دجالی ریاست کی مدد پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ہمیں اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب روزِ قیامت ہمارا نام بھی ان لوگوں میں پکارا جائے جو کسی حوالے سے ان شیطانی منصوبوں کا حصہ تھے۔

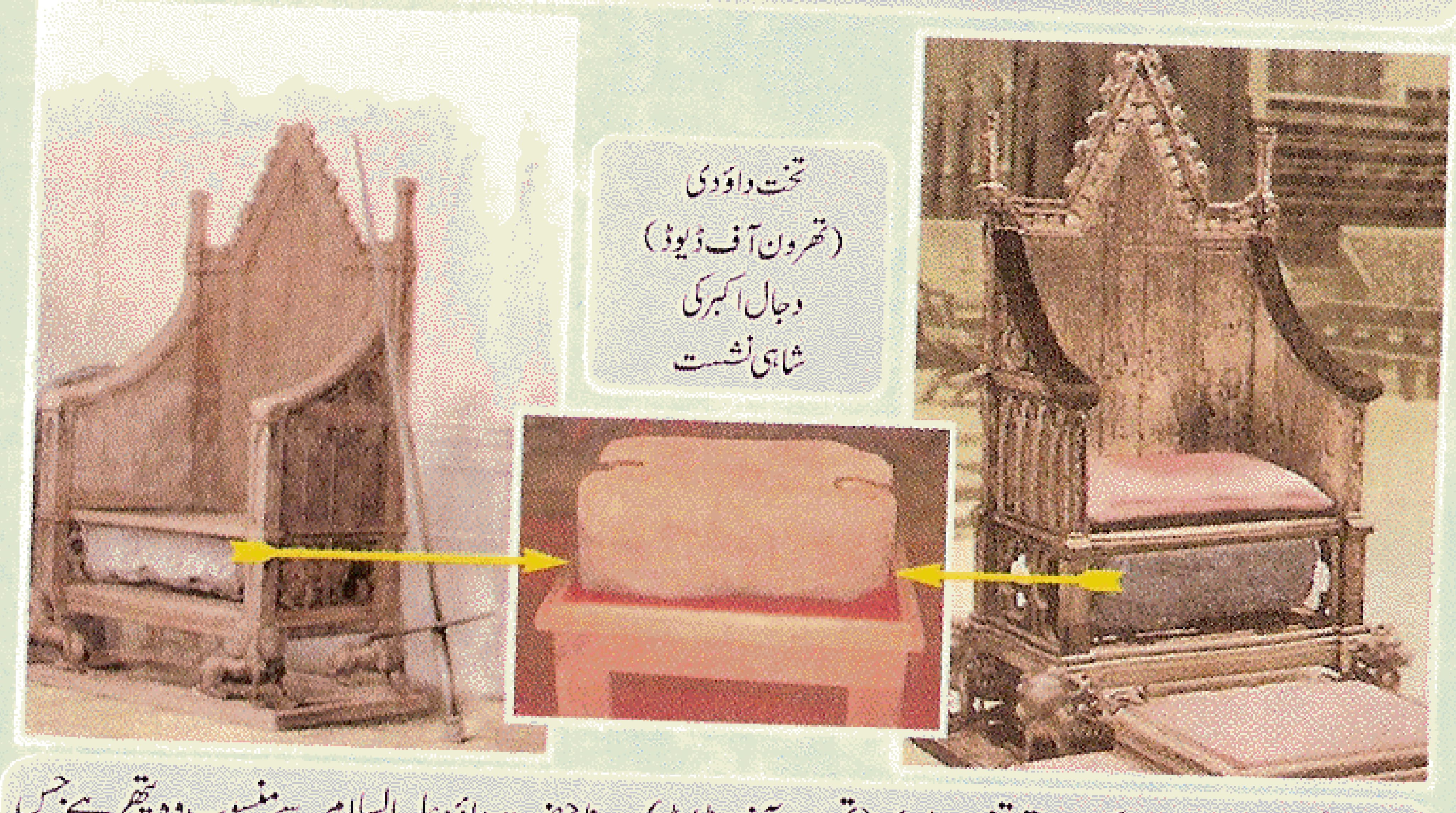

تخت داؤدی
(تھرون آف ڈیوڈ)
دجال اکبر کی
شاہی نشست

یہودیوں کی مذہبی داستان کے مطابق تخت داؤدی (تھرون آف ڈیوڈ) سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام سے منسوب وہ پتھر ہے جس پر بیٹھ کر نسل داؤدی کا آخری عالمی حکمران ''دجال'' حکومت کرے گا۔ یہ پتھر آج کل ملکۂ برطانیہ کی شاہی کرسی میں نصب ہے۔ برطانیہ کے عیسائیوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ جس قوم کی مدد کر رہے ہیں وہ ان کے تخت شاہی کے درپے ہے۔ اس کی پہلی تصویر حقیقی ہے، دوسری آرٹ ورک۔ درمیان میں یہ پتھر الگ سے دکھایا گیا ہے۔ شاہی کرسی کے پائے چار شیروں کی پشت پر ٹکے ہوئے ہیں، ساتھ میں صلیب کی شکل کا عصا دھرا نظر آ رہا ہے جو اہل برطانیہ کے ''غیر متعصب'' ہونے کا بھرپور ثبوت ہے۔

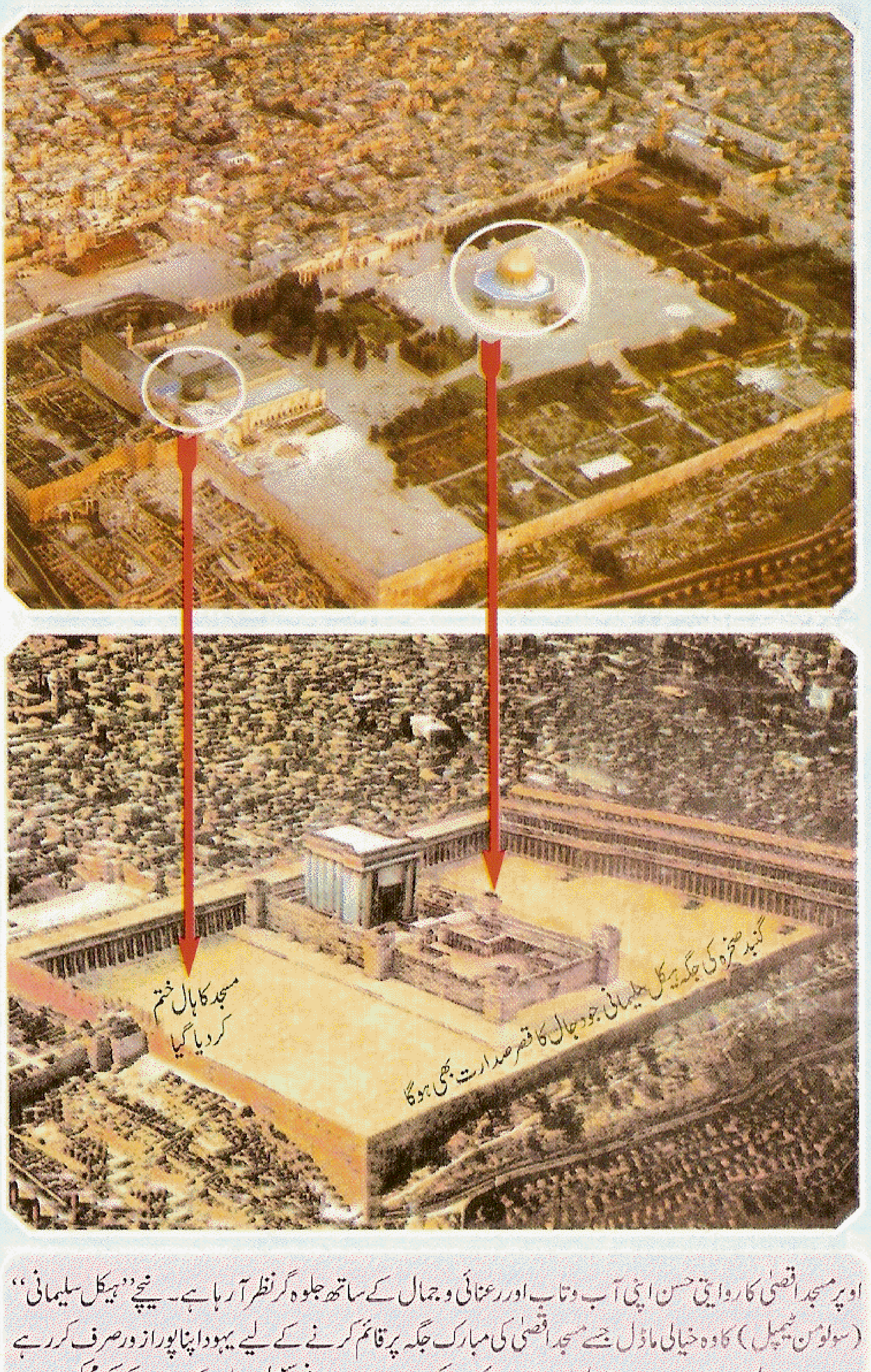
مسجد کا ہال ختم کر دیا گیا
گنبد صخرہ کی جگہ ہیکل سلیمانی جو دجال کا قصر صدارت بھی ہوگا

اوپر مسجد اقصیٰ کا روایتی حسن اپنی آب وتاب اور رعنائی و جمال کے ساتھ جلوہ گر نظر آ رہا ہے۔ نیچے ''ہیکل سلیمانی'' (سولومن ٹیمپل) کا وہ خیالی ماڈل جسے مسجد اقصیٰ کی مبارک جگہ پر قائم کرنے کے لیے یہود اپنا پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ اے اہل اسلام! اس صورتحال کا علاج ترکِ منکرات اور جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ کیونکر ممکن ہے؟

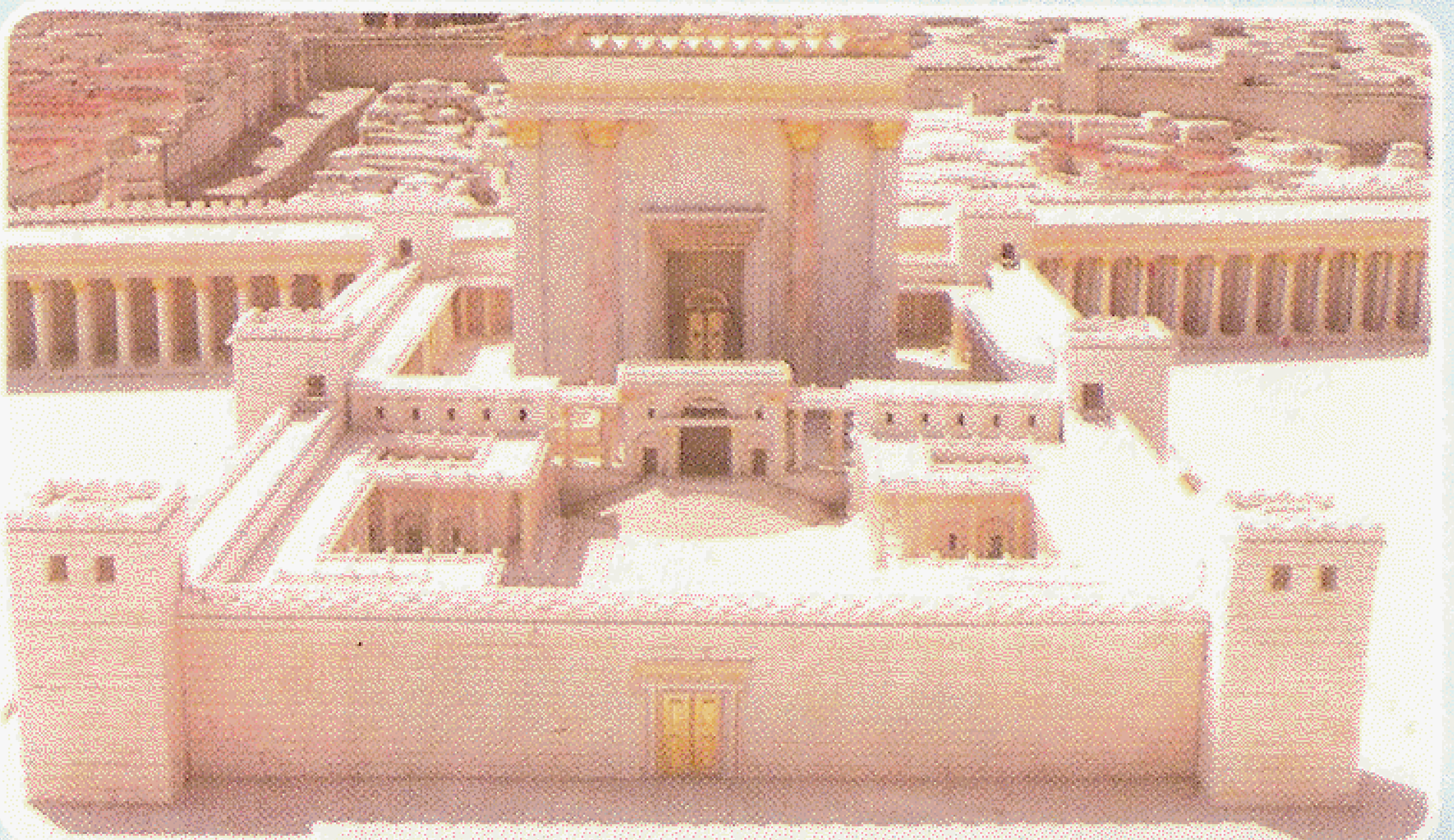

یہود کے خیالی منصوبے ’’ہیکل سلیمانی‘‘ کا ماڈل۔ اس مہم کے لیے بیسیوں تنظیمیں امریکا و یورپ میں چندہ کر رہی ہیں اور درجنوں دہشت گرد گروپ طرح طرح کے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان کی راہ میں دو ہی رکاوٹیں تھیں ایک تو دینی مدارس جو امت کو روحانی غذا فراہم کر کے بے دینی کی یلغار سے بچاتے اور اسلام کی طرف کھینچ کھینچ کر لاتے تھے۔ دوسرے مجاہدین جو ’’القتال‘‘ کا فرض زندہ کر کے دشمن کے دانت کھٹے کرتے اور اسے جامے میں رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ اب مجاہدین کو دہشت گردی کے الزام اور مدارس کو ’’اصلاح‘‘ کے بہانے راستے سے ہٹانے کی مہم جاری ہے جو مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

یہودیوں کا درخت جسے عربی میں ’’غرقد‘‘ اور انگلش میں ’’Boxthron‘‘ کہتے ہیں۔ یہ پندرہ سال میں پورا جوان ہو جاتا ہے اور اسے قریب قریب لگایا جائے تو دیوار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا پھل بدمزہ اور نہایت بدنما ہوتا ہے۔ یہودی حکومت نے گزشتہ سالوں میں بڑے پیمانے پر اس کو کاشت کیا ہے کیونکہ حدیث شریف کے مطابق قیامت کے قریب یہودیوں کے قتل عام کے وقت یہ درخت ان کو پناہ دے گا...... لیکن افسوس کہ یہودیوں نے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سچی پیش گوئی کے حاصل مطلب پر غور نہیں کیا کہ جو یہودی ایمان نہ

دریائے اردن کا دلفریب نظارہ۔ یہ وہی دریا ہے جس سے گذرتے وقت حضرت طالوت کے لشکر کا امتحان ہوا تھا۔ اللہ کا حکم پورا کرنے والے تین سو تیرہ افراد نے اسے پار کرکے جالوت کے ٹڈی دل لشکر پر فتح پائی اور اللہ تعالیٰ کا حکم توڑنے والے اپنی جگہ پڑے رہ گئے۔

Welcome to Israel
שראל

''لُدّ'' نامی مقام پر اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب کے قریب بن گوریان انٹرنیشنل ایئرپورٹ۔ ایک صحیح حدیث شریف کے مطابق دجال ''لُدّ'' کے دروازے کے قریب مارا جائے گا۔ آج کل ایئرپورٹ کسی شہر کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔

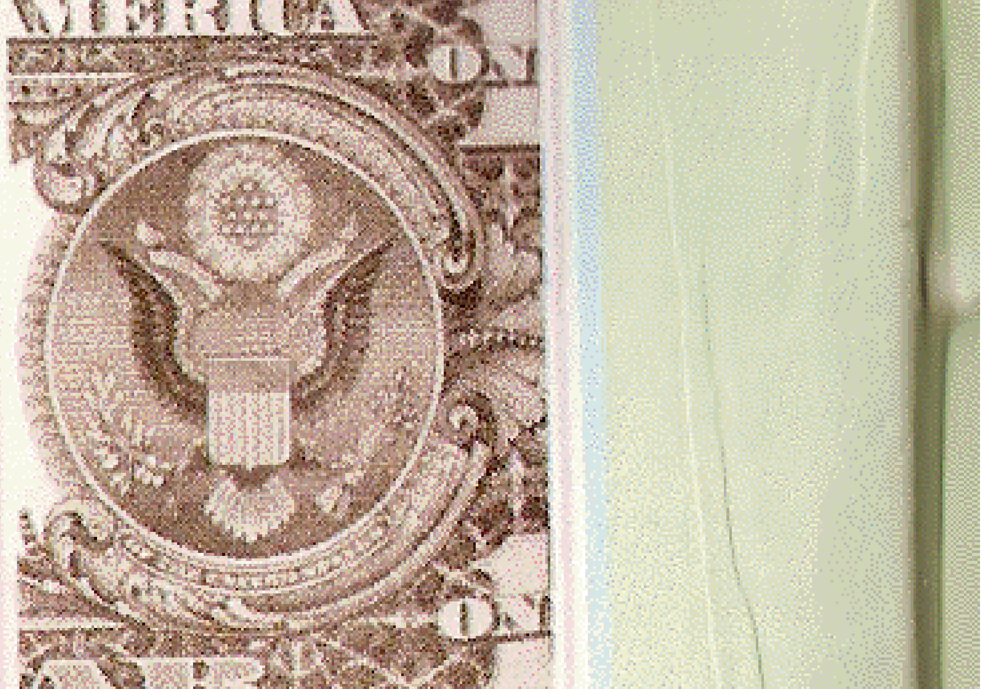

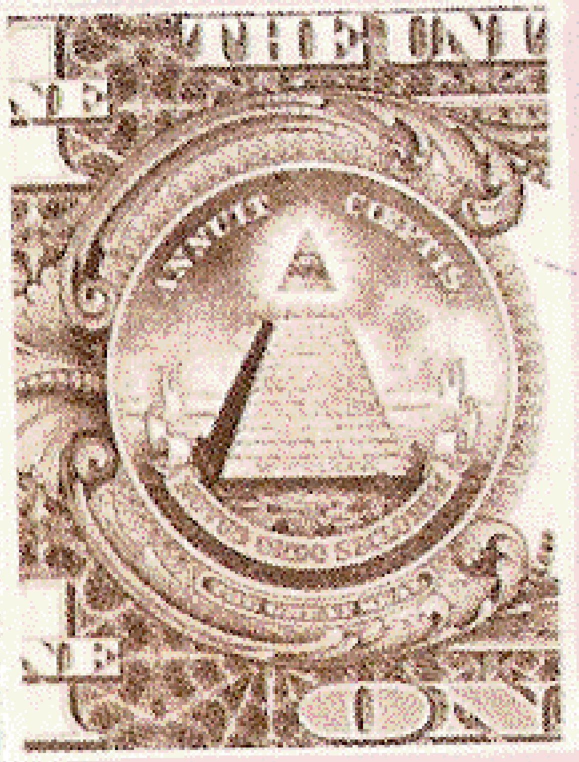

ایک ڈالر کے امریکی نوٹ پر جو نشانیاں اور علامات ہیں ان سے متعلق Freemasonry نامی کتاب کا یہودی مصنف W. Kirk لکھتا ہے: ''انقلابی زمانے کے محبّ وطن امریکیوں کا تعلق زیادہ تر فری میسن سے تھا۔ امریکا کی عظیم مہر ایک ڈالر کے نوٹ پر چھپی ہوئی ہے جس سے فری میسن کے کئی اصولوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک ڈالر کے نوٹ کے دائیں جانب ایک شاندار جاگیرداروں کے نشان کی نمایندگی کرتا ہے جو کہ یونانی دیوتاؤں سے متعلق ہے۔ اس کے نیچے ایک کتاب بنی ہوئی ہے جو کہ روح یا عالم ارواح کا نشان ہے۔ اس کے بالکل نیچے سدا بہار درخت کی ایک بالی ہے جو کہ امن کی یاد دلاتی ہے اور دوسری طرف تیروں کا ایک گچھا ہے جو کہ لڑائی یا جنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عقاب کے دونوں بازوں پر جس قسم کی حکومت ہے اس کو ظاہر کرتی ہے یعنی حکومت کس نوعیت کی ہے؟ اس مہر کی مخالف سمت میں چار سطحوں یا ادوار کو واضح کیا گیا ہے۔ نوٹ کے دوسری بائیں جانب اس قوت کا مقصد اور نصب العین لکھا ہوا ہے۔ یہ مقصد بتاتا ہے کہ کس طرح سے اس نے ترقی کی؟ ترقی کو انہوں نے ایک مخروطی شکل سے ظاہر کیا ہے۔ مخروطی شکل Pyramid کی انتہائی اونچائی پر ایک آنکھ کی تصویر ہے جو کہ اس قوت کا (یعنی دجالی طاقتوں کا۔ مترجم) سرچشمہ ہے اور صحیح معنوں میں یہ لادینیت کی نئی ترتیب کی طرف ترغیب دیتی ہے اور یہی متحدہ امریکا کی سب سے بڑی مہر کہلاتی ہے۔'' ان علامت پر لکھے گئے حروف ایک غیر معروف اور نامانوس زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ باشعور کہلانے والے امریکی عوام بھی نہیں جانتے کہ ان کا مطلب کیا ہے؟ ان کا مطلب جاننے کے لیے کتاب میں موجود صفحہ نمبر ۱۲۲ پر مضمون ''پُراسرار حروف'' ملاحظہ کیجیے۔

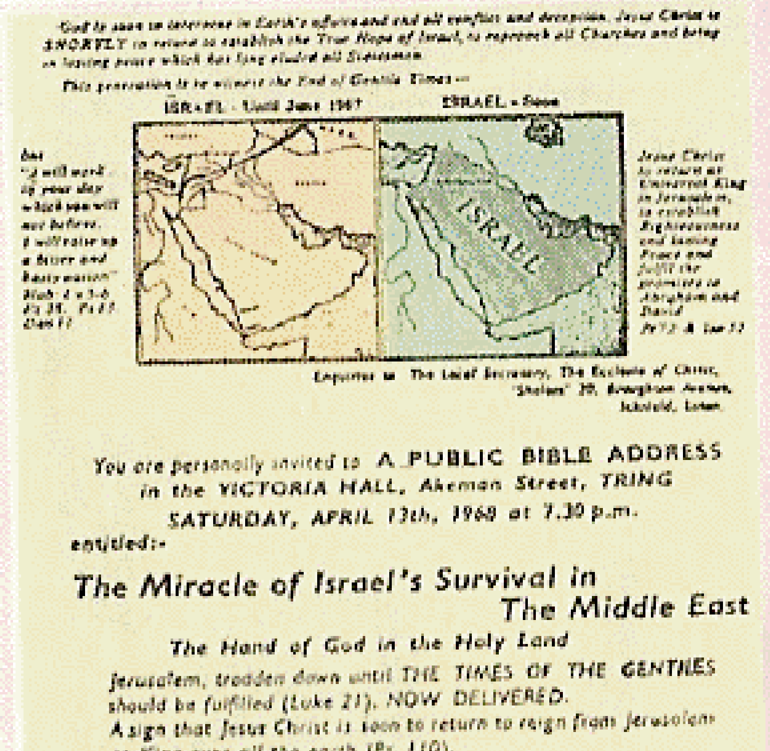

God is soon to intervene in Earth's affairs and end all conflict and deception. Jesus Christ is SHORTLY to return to establish the True Hope of Israel, to reproach all Churches and bring in lasting peace which has long eluded all Statesmen.

This generation is to witness the End of Gentile Times —

ISRAEL - Until June 1967
ISRAEL - Soon
ISRAEL

You are personally invited to A PUBLIC BIBLE ADDRESS
in the VICTORIA HALL, Akeman Street, TRING
SATURDAY, APRIL 13th, 1968 at 7.30 p.m.
entitled:-

The Miracle of Israel's Survival in The Middle East

The Hand of God in the Holy Land
Jerusalem, trodden down until THE TIMES OF THE GENTILES should be fulfilled (Luke 21). NOW DELIVERED.
A sign that Jesus Christ is soon to return to reign from Jerusalem as King over all the earth (Ps. 110).
Its importance upon your life!

Speaker Mr. F. E. Grimes
ENTIRELY FREE

☐ یہ ایک دعوت نامہ ہے جو ۱۳ اپریل ۱۹۶۸ء کو انگلستان کے ایک یہودی ادارے نے ایک تقریب کے سلسلے میں بڑی تعداد میں جاری کیا تھا۔ کارڈ کے ایک طرف مشرقِ وسطی کے دو نقشے دیئے گئے ہیں، بائیں طرف والے نقشے کے اوپر تحریر ہے: ''اسرائیل ۱۹۶۷ء تک'' دوسرے نقشے کا عنوان ہے ''اسرائیل عنقریب'' اس دوسرے نقشے میں تمام مشرقِ وسطی بالخصوص سارا جزیرہ نمائے عرب بشمول مکۂ معظّمہ اور مدینہ منورہ تا عدن اور خلیج فارس، اسرائیل کے زیرنگیں دکھایا گیا ہے۔ یہ درحقیقت ساری دنیا کے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ یہود اس جنگ میں مسلمانوں کے خلاف مسلمانوں سے ہی کام لینا چاہتے ہیں۔

☐ کارڈ پر جو عبارت تحریر ہے اس میں کہا گیا ہے: ''موجودہ نسلِ انسانی غیر یہودی (جینٹائل یعنی جانوروں کے) ادوارِ حکومت کے خاتمہ کا خود مشاہدہ کرلے گی۔ علاوہ ازیں یہودی کتب ''مقدسہ'' کے حوالے سے یہ وعید سنائی جارہی ہے: ''خدا ایک ایسی قوم کو اٹھانے والا ہے جو سخت تند و تلخ مزاج ہے اور جو بہت عجلت پسند واقع ہوئی ہے۔''

☐ دعوت نامے میں کہا گیا ہے: ''بروز ہفتہ بتاریخ ۱۳ اپریل ۱۹۶۸ء شام کو ساڑھے سات بجے وکٹوریہ ہال ایکمن اسٹریٹ بمقام ٹرنگ ایک جلسۂ عام منعقد ہو رہا ہے فانگھم کے مسٹر گرائم تقریر کریں گے۔ تقریر کا عنوان ہوگا: ''مشرقِ وسطی میں اسرائیل کی معجزانہ بقا و حیات''.......... ارضِ پاک (اسرائیل) پر خدا کا ہاتھ ہے۔ یروشلم اب تک غیر یہودی ادوار کے مظالم اور استیلاء کے تحت کراہتا رہا ہے۔ اب اس کی نجات کا وقت آ گیا ہے۔ مسیح نازل ہونے والے ہیں تاکہ وہ ساری دنیا پر بادشاہت کرسکیں۔ مسیح آ کر اسرائیل کی حقیقی توقعات کو اس دنیا میں عملاً جاری وساری کریں گے، تمام دیگر مذاہب ملیامیٹ کردیئے جائیں گے اور قیامِ امن کا وہ خواب جسے آج تک کوئی حقیقت کا جامہ نہ پہنا سکا غیر یہودی دور کے خاتمہ کے بعد ایک زندہ و جاوید حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا۔''

یہ کارڈ یہودیوں کے درونِ خانہ پکنے والی کھچڑی کے اُبال کی شدت کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔

وہ مقام جہاں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو شرف کلیمی بخشا گیا

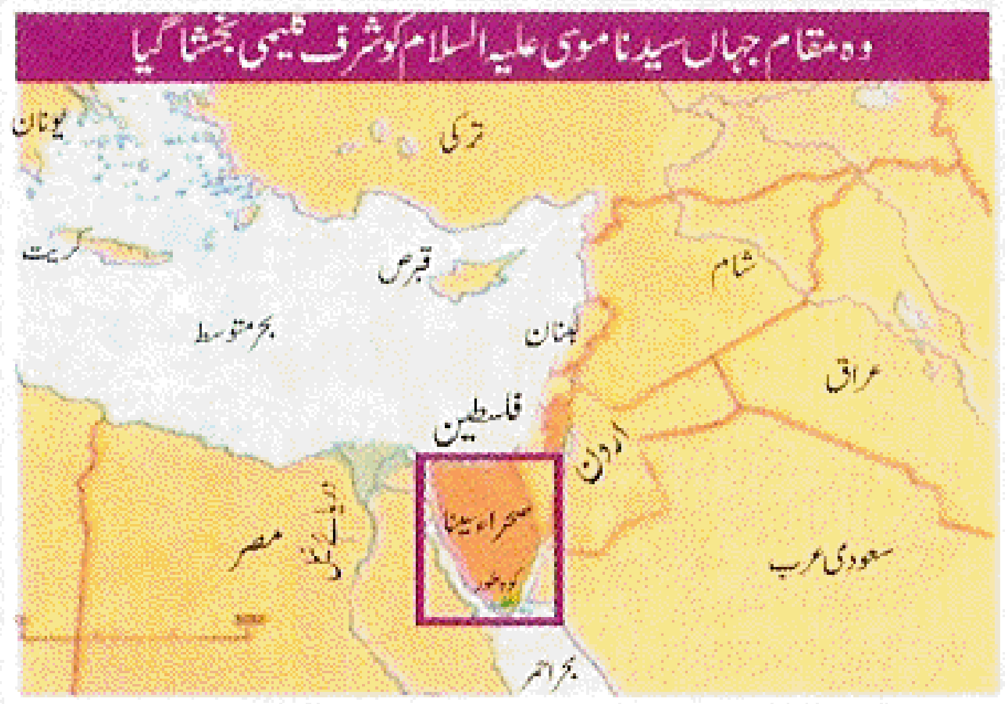
یونان
ترکی
کریٹ
قبرص
شام
بحر متوسط
لبنان
عراق
فلسطین
اردن
مصر
صحرائے سینا
کوہ طور
سعودی عرب
بحر احمر

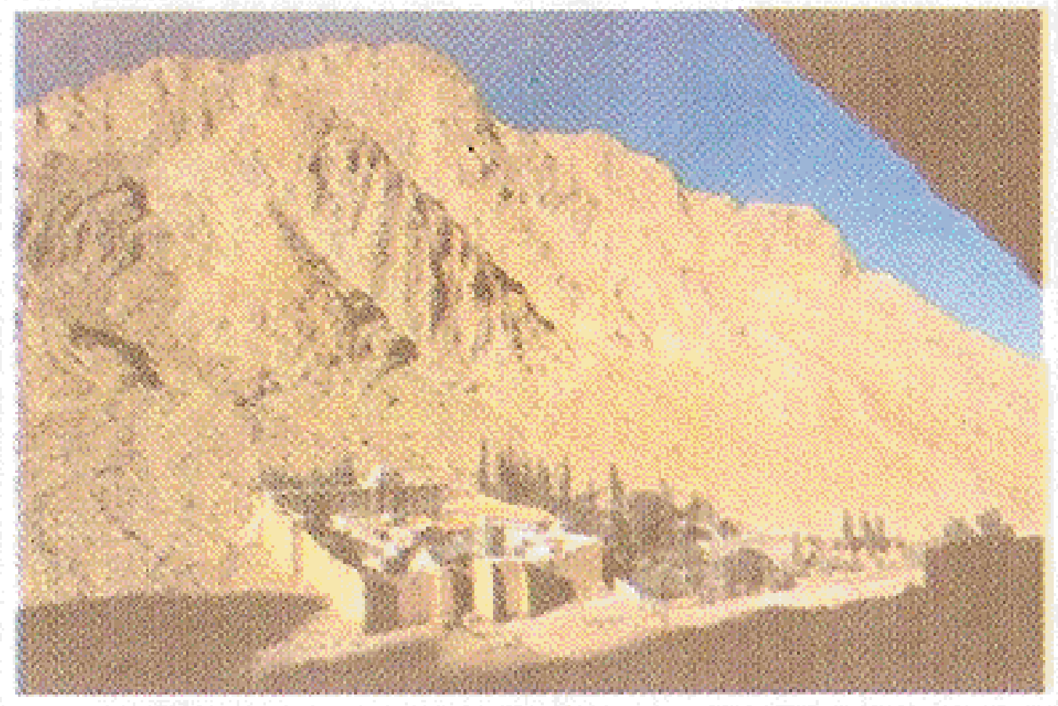

نقشے میں فلسطین اور مصر کے درمیان واقع ''صحرائے سینا'' دکھایا گیا ہے جس میں ''کوہِ طور'' واقع ہے۔ یہ وہی صحرا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ''من وسلویٰ'' نازل کیا، پتھر سے پانی کے بارہ چشمے نکالے، سائے کے لیے بادلوں کا انتظام کیا لیکن اس قوم نے پھر بھی جہاد سے انکار کیا اور اس کی پاداش میں چالیس سال تک اسی لق ودق صحرا میں بھٹکتی رہی۔ دوسری تصویر میں کوہ طور کا ایک حصہ ''جبل موسیٰ'' نظر آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جناب موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے یہاں گفتگو فرمائی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں ایک عبادت گاہ بھی نظر آ رہی ہے۔

اسرائیل کے جھنڈے پر دو نیلی لکیریں اسرائیل کی حدود کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان سے مراد دریائے دجلہ اور دریائے نیل ہیں۔ ان کے وسط میں ستارۂ داؤدی عظیم تر اسرائیلی ریاست کی علامت کے طور پر ہے۔

ایک فلسطینی بچہ اپنے پیاروں کا گرا ہوا خون دیکھ رہا ہے۔ اس کی معصوم آنکھوں میں پوشیدہ نادیدہ جذبہ یہود کے لیے موت کا پیغام ہے۔

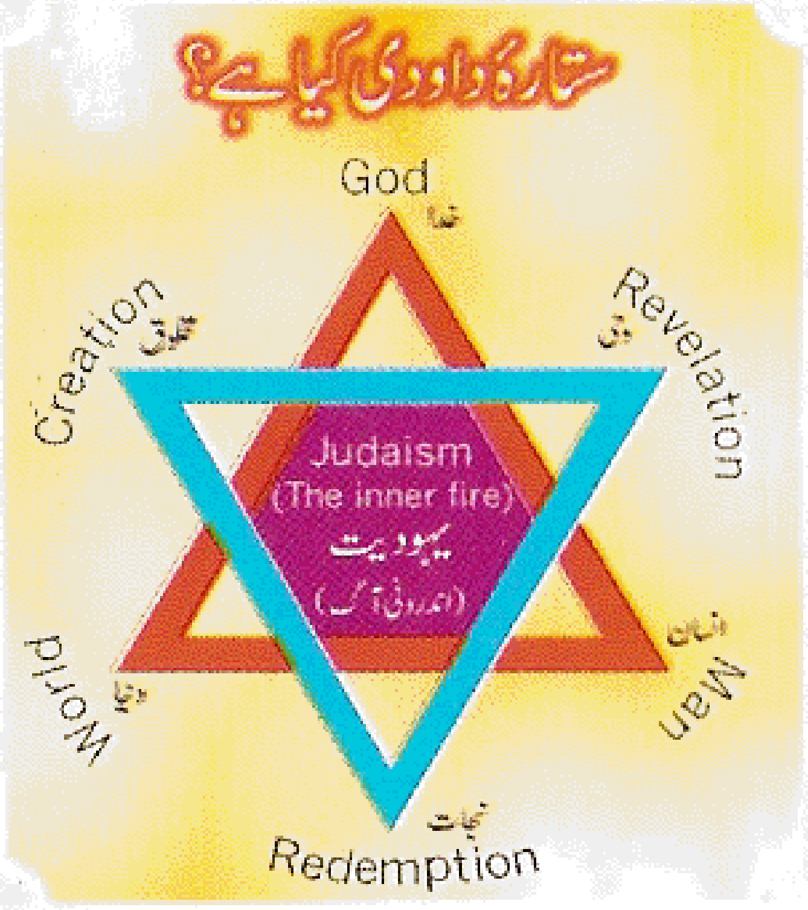
ستارۂ داؤدی کیا ہے؟
God
خدا
Revelation
وحی
Man
انسان
Redemption
نجات
World
دنیا
Creation
مخلوق
Judaism
(The inner fire)
یہودیت
(اندرونی آگ)

یہودیوں کی خاص مذہبی اور سیاسی علامت ''ستارۂ داؤدی''۔ یہ دو تکونوں کو ملانے سے بنتا ہے۔ یہودیوں کے فرضی عقائد کے مطابق سیدھی تکون سے ''خدا، انسان اور دنیا'' جبکہ الٹی تکون سے ''وحی، مخلوق اور نجات'' مراد ہے۔

میرے بچے میں شرمندہ ہوں

مرے بچے تُو میری بے حسی کو درگزر کر دے
کہ میں ہر روز خبروں میں
ترے پیاروں کو مرتے دیکھتا ہوں
اور میں کچھ نہیں کر سکتا

مری آنکھوں میں ہے منظر
کسی کے زندہ جلنے کا، کسی بوڑھی کے گرنے کا، کسی ماں کے بلکنے کا
کسی اک باپ کی آغوش میں بچے کے مرنے کا
ہر اک منظر کھٹکتا ہے مرے دل میں
مگر میں کچھ نہیں کر سکتا
مرے بچے تُو میری بے حسی کو درگزر کر دے
بہت شرمندہ ہوں میں سامنے تیرے

میں اپنے کشت وخوں میں اس قدر مصروف ہوں ہر دم
کہ میں تیری حمایت میں دشمن سے لڑ نہیں سکتا
مری اپنی ہی جنگیں ہیں، مرے اپنے ہی قضیے ہیں
لسانی جھگڑے
علاقائی تعصب
فرقہ بندی کی کشاکش، سیاسی حکمت عملی
معاشی تنگ ودو
ہزاروں میرے جھگڑے ہیں
جو مجھ کو باندھ رکھتے ہیں
سو میں ہر روز خبروں میں
ترے پیاروں کو مرتے دیکھتا ہوں
اور میں کچھ کر نہیں سکتا

مگر مجھ کو یقیں ہے کہ
مرے بچے، تو یہ جنگ جیت ہی لے گا
دشمن کی گولیوں راکٹ بموں کے باوجود اک دن
فتح تیرا مقدر ہے!
تجھے مجھ جیسے لوگوں کے سہارے کی ضرورت ہی کیا؟
بڑی طاقت کے سب جالوت خود ہی تجھ سے ڈرتے ہیں
وہ یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ
تو اپنے دور کا داؤد ہے اور تیرے ہاتھوں میں
وہی تاریخی پتھر ہے!